

# چہروں کے آئینے

نایاب جیلانی



## چہروں کے آئینے

”شاہ سائیں کی بیٹھک میں بڑی حویلی والے آئے ہیں“  
 ”پشینہ پھولوں کی باڑ پھلانگتی ہوئی تیزی سے داخلی دروازے سے اندر آ کر باقاعدہ  
 اعلان کی صورت میں بولی تھی۔ جہاں اماں فیضہ نے چونک کر پشینہ کی طرف دیکھا تھا، وہیں  
 مہرماہ کے ہاتھ سے کتاب گر پڑی۔

پشینہ اسی پُر جوش انداز میں باقی خواتین کو بتانے کے لیے دوسرے محن کی طرف بڑھ  
 گئی۔ یکا یک حویلی کے اندرونی حصے میں ہلچل سی مچ گئی۔ حویلی کی معزز عورتیں دوپٹے درست  
 کرتی کچن میں کھس گئیں۔ ملازمین ادھر سے ادھر بھاگنے لگے۔ آج معمول سے ہٹ کر کچھ  
 ہونے والا تھا۔ ہمیشہ خاموش رہنے والی بے حد سنجیدہ سی اماں فیضہ بول رہی تھیں۔

ان کی آواز میں پوشیدہ خوشی اور بے انتہا مسرت محسوس کر کے حویلی کے در و دیوار جھوم  
 اٹھے۔ ہر کوئی سرشار تھا۔ باورچی خانے سے پشینہ، رضوانہ اور وسائی کی دہلی دہلی ہنسی سنائی دے  
 رہی تھی۔ مرجان بی بی کے تاثرات مختلف تھے۔ وہ ابھی تک شاک کی کیفیت میں غم صم بیٹھی تھیں۔  
 اماں فیضہ کے سجدے طویل ہو گئے تھے وہ اللہ کے حضور جھکی شکرانے کے نوافل ادا کر رہی تھیں۔

آج برسوں کی ریاضت کا صلہ مل گیا تھا۔

آج آبلہ پائی کا سفر تمام ہوا تھا۔

برسوں بعد میکے سے ملنے کا سند یہ آیا تھا۔

آج ان کے بھائی کے بیٹے صہیر کی قتل گاہ پر کھڑے تھے اور دعا مغفرت مانگ رہے  
 تھے جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر ہر طرف پھیل گئی تھی سننے والے حیران بھی تھے اور خوش بھی۔ کئی

برس بیت گئے تھے بڑی حویلی سے کبھی کوئی حاضری دینے نہیں آیا تھا حتیٰ کہ نینب کی قبر پر دیا جلانے بھی کوئی نہیں آتا تھا، درگاہ کے صحن میں درخت کی چھاؤں میں بنی قبر پر پھر بھی ایک چراغ جلتا رہتا تھا۔ آج تک کسی کو خبر نہیں ہوئی تھی کہ اس چراغ کو روشن کون کرتا ہے۔

اسی درگاہ کے احاطے میں میرام شاہ کے والد ارد شیر شاہ کی تربت بھی تھی۔ جو اتنا قوی تھا، اسی قدر بہادر تھا کہ جب جب چلتا زمین لرز لڑاٹھتی۔ بولتا گویا ہر شے پر سحر طاری ہو جاتا۔ آج وہ مردمنوں مٹی تلے پر سکون نیند سو رہا تھا۔ اسے صمیر کے قتل کے جرم میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اور ارد شیر شاہ کے قاتل کو تو سب ہی جانتے تھے۔

اماں فیضہ کے اکلوتے ماں جانے کو قتل کرنے والا اسی حویلی کا مکین تھا۔ جسے مہمند عباس کے نام سے سب جانتے تھے، جو شاہ سائیں کا اکلوتا داماد تھا۔ ان کی عزیز از جان بیوی ثریا جہاں کا سگا بھانجا اور ان کی پیاری بیٹی نثر جہاں کا محبوب شوہر۔ مہر ماہ اور مومن کا باپ۔

حویلی میں آج جشن کا سماں تھا۔ ہر کوئی وجہ جاننے کو بے تاب تھا کہ یہ کیا یہ پلٹ ہوئی کیسے۔ دو خون کے پیاسے خاندان ایک جگہ اکٹھے کیسے ہو گئے؟ آخر پہل کی کس نے؟ اماں فیضہ کے سرخ لبوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرے پر پھیلا کرب نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا وہ ہر مبارک دینے والے کے ہاتھ میں چند سرخ نوٹ دبا دیتیں۔

صبح سے شام اور شام سے رات ہو گئی تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ گھروں کو روانہ ہونے لگے تھے۔ سب خواتین دن بھر کام کاج اور مہمانوں کی خاطر تواضع کی وجہ سے تھک چکی تھیں اسی لیے سر شام ہی آرام کرنے کی غرض سے اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئیں۔ مگر حویلی میں دو نفوس ایسے تھے جن کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ایک کی نگاہ میں رنگ، خوشی اور مسرت کے دیے ٹٹمار رہے تھے ایک کی آنکھ میں کرب، اذیت اور بے چینی آنسو بن کر بہہ رہی تھی۔ اک نامعلوم اضطراب اسے گھیرے میں لے چکا تھا۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا، ہر سو گہری ہولناک تاریکی چھائی ہوئی تھی اور مہر ماہ کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ کالی رات اسے ضرور نکلے گی۔ یہ کیسا خوف تھا جو لمحہ بلحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کل اس کا ٹیٹ تھا اور وہ ایک لفظ بھی پڑھ نہیں پاتی تھی۔ اس کی سوچیں بھٹک بھٹک کر بڑی حویلی کے درو دیوار ہے جانکراتیں اور خوف کی اک تیز لہر جسم میں انگڑائی لے کر جاگ اٹھتی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میز پر رکھی اور جوتے پہن کر باہر نکل آئی۔ شال کو

اچھی طرح اپنے گرد پلٹ کر اس نے گول کمرے کا رخ کیا تھا۔ اس کمرے کے بائیں جانب پشینہ کا کمرہ تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی دروازے تک آئی۔ آہستہ سے بینڈل گھا کر اس نے اندر جھانکا پشینہ پلنگ پر نیم دراز کارڈ لیس کان سے لگائے باتوں میں مصروف تھی۔ مہر ماہ جانتی تھی کہ فون کس کا ہے۔

پشینہ نے اسے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ چپ چاپ پلنگ پر بیٹھ کر میگزین دیکھنے لگی۔ اور غیر اراداً اپنے اکلوتے بھائی مومن کے بارے میں سوچنے لگی۔ پچھلے سال مومن اور بابا جان کی زبردست جھڑپ ہوئی تھی، جس کے نتیجے میں مومن اس سال کی چھٹیاں گزارنے پاکستان نہیں آیا تھا۔ اس کے اور بابا جان کے درمیان بہت سے اختلافات تھے۔ ان کا پہلا جھگڑا آج سے پانچ سال پہلے کس بات پر ہوا تھا۔ مہر ماہ کو ایک ایک بات ابھی تک یاد تھی۔

بڑی حویلی سے مہر ماہ کے لیے پیغام آیا تھا۔ گھر کے درو دیوار اس جرأت پر گویا لرز اٹھے۔ ”ایسا بھلا کیسے ممکن ہو سکتا ہے صمیر کے قاتلوں کے خاندان میں بیٹی دینا ہم اپنی توہین سمجھتے ہیں“ سب سے پہلا دھچکا مرجان بی بی کو لگا تھا۔ وہ مومن اور مہر ماہ کی سوتیلی والدہ کے عہدے پر فائز تھیں۔ شاہ سائیں کی بھانجی تھیں اور ان کی اماں کی وفات کے بعد شاہ سائیں نے بابا جان کا نکاح مرجان بی بی سے کر دیا تھا۔ بابا جان کی مرجان بی بی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے شاید مومن اکلوتی اولاد زینہ ہونے کا فائدہ اٹھاتا تھا۔ بابا جان اکثر اس کے سامنے خاموشی اختیار کر لیتے تھے۔ مگر بڑی حویلی والوں کی اس جرأت پر بابا جان کا ازلی جلال عود کر آیا تھا۔ اماں فیضہ اور مومن اس پیام میں پوشیدہ صلح کے پیام کے متن کو جانتے تھے مگر بابا جان نے پہلی مرتبہ شاہ سائیں سے تلخ کلامی کی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ برسوں پرانی دشمنی کا خاتمہ ہو اور پھر رشتے داری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”آپ شاہ سائیں سے بات کریں۔ ہمیں بڑی حویلی والوں سے رشتہ داری نہیں گناہنی، پرانے رشتے نبھالیں یہی بہت ہے۔ بھابھی فیضہ ایسی سبز قدم ثابت ہوئی ہیں اس گھر کے لیے کہ آتے ساتھ ہی پہلے شوہر کو نگلا پھر اس بد بخت ام زینب صمیر کا رشتہ کیا جو زادہ بھی اس دنیا سے پردہ پوش ہو گیا۔ دونوں بہنیں ہی منحوس ہیں۔ اس گھر کے دونوں وارثوں کو نکل گئیں۔ میں اس منحوس خاندان میں مہر ماہ کو کیا بنے نہیں دوں گی اور پھر مجھے تو یہ آغا سائیں کی کوئی چال معلوم ہوتی ہے اگر انہیں بڑے بھائی سے صلح کرنی ہے تو شاہ سائیں کی دونوں پوتیوں پشینہ یا

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”امن اور صلح“ اس نے دو لفظوں میں بات سمیٹی تھی۔

”اتنا احمق سمجھ رکھا ہے تم نے ہمیں۔ تم لوگوں کی مکاری سے ہم واقف ہیں۔ صلح کے بہانے تم صرف اور صرف مہمند کے سر کو اپنے سامنے ہمیشہ کے لیے جھکا نا چاہتے ہو“ مرجان بی بی کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ میرام کے ہونٹوں پر بے نامی مسکراہٹ چمکنے لگی۔

”یہ محض آپ کا خیال ہے“ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ ”محض آپ کی سطحی سوچ کا کمال ہے۔ اتنی بدگمانی اچھی نہیں“ مگر وہ اس کے برعکس بولا تھا۔ کسی بھی قسم کی بد مزگی پھیلا نا اور پھر مہمند عباس کی دوسری بیوی سے تلخ کلامی کر کے وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

”بہر حال جو منصوبہ تم نے بنایا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا“ انہوں نے تلخی سے کہا۔

”ابھی منصوبہ بنایا ہی کب ہے۔ پلاننگ تو میں اب کروں گا۔ کیونکہ یہ معاملہ خاصہ میڑھا ہے اور اس کے لیے خود کو بھی میڑھا کرنا پڑے گا مجھے“ وہ دھیسے سے مسکراتا ہوا پلٹ گیا تھا۔

مرجان بی بی غصے سے بھناتی رہ گئیں۔

☆☆☆

پشینہ ڈیڑھ گھنٹہ فون پر مصروف رہی تھی اور مہر ماہ سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھ گئی۔ وقت کی کچھ تلخ باتیں کچھ یادیں ذہن میں تازہ کر رہی تھی۔ مومن نجانبے کون سا قصہ چھیڑ بیٹھا تھا۔ پشینہ ہونٹوں پر دبی دبی مسکان لیے مسلسل بول رہی تھی۔

”یہ محبت کے سلسلے بھی بہت عجیب ہیں“ مہر ماہ نے چپکے سے آنکھ میں اترنے والی نمی کو آہستگی سے پونچھا۔ اب وہ ایک مرتبہ پھر پشینہ کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اس نے فون کان سے ہٹایا پھر مومن کو نجانبے کیا کہا تھا کہ دوسری طرف سے جلد ہی خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا گیا تھا۔

پشینہ بازوؤں میں کشن دبوچے اس کے قریب آ بیٹھی۔

”ابھی تک سوئیں نہیں تم“ پشینہ نے اس کے ہاتھ سے میگزین پکڑ کر بند کر دیا تھا۔

پھر زری سے اس کے گال میں چٹکی بھر کر بولی ”کچھ پوچھ رہی ہوں میں مہر ماہ! کیا گزر چکی ہو؟“

”کاش گزر رہی جاتی“ مہر ماہ نے ٹھنڈی آہ بھری تھی، پھر نظر اٹھا کر پشینہ کی طرف دیکھنے لگی۔ کتنے رشتے بنتے تھے اس کے پشینہ کے ساتھ وہ اس کی ماموں زاد بہن بھی تھی۔ دوست بھی اور ہونے والی بھابھی بھی۔

لغونہ میں سے کسی کا رشتہ مانگتے۔ انہوں نے شاہ سائیں کی نواسی کا رشتہ اس لیے مانگا ہے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔ وہ لوگ انتقال کا رشتہ داری کر رہے ہیں ارد شیر شاہ کا بدل لینے کے لیے“

مرجان بی بی بہت ٹھہر ٹھہر کر بابا جان کو ہر طریقے سے قائل کر چکی تھیں۔ بات تو جچ تھی۔ پشینہ اور لغونہ آغا سائیں کی نواسیاں تھیں۔ پہلا حق ان کا تھا۔

بات بابا جان کی سمجھ میں آ چکی تھی اس لیے انہوں نے اس پیغام کو مسترد کر دیا تھا۔

بڑی حویلی والوں نے اس انکار کو اپنی توہین سمجھا تھا اور یوں پہلی مرتبہ اتنے سالوں بعد کسی نے ارد شیر شاہ کے ولی عہد میرام شاہ کو دیکھا تھا۔ بہت سالوں بعد بڑی حویلی کے کسی فرد نے شاہ سائیں کی بیٹھک کی چوکھٹ بڑے جلال کے عالم میں عبور کی تھی۔ آنے والے کے تیور بڑے غضب ناک تھے۔ حویلی میں شاہ سائیں اور بابا جان موجود نہیں تھے..... بی بی کو خبر ہوئی تو آگ بگولا سی لپکتی ہوئی مردانے کی طرف بڑھ گئیں۔

”اچھا تو تم ہو ارد شیر شاہ کے تخت جگر۔ بڑا چرچا سن رکھا تھا تمہارا۔ آج دیکھنے کی سعادت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ بولو کیا کرنے آئے ہو؟“ مرجان بی بی نے تیوری چڑھا کر بڑے کرخت لہجے میں گنگو کا آغاز کیا۔

”اپنے خاندان کی معزز خواتین سے بد کلامی کرنا مجھے پسند نہیں۔ آپ مومن یا پھر اپنے سرتاج محترم کو ادھر بھیجیے، میں ان ہی سے بات کرنے آیا ہوں“

اس نے بہت مضبوط مگر مہذب لہجے میں جواب دے کر قدرے رخ موڑ لیا تھا۔

مرجان بی بی نے اس کا سرتاپا جائزہ لیا۔ سفید شلوار قمیض میں اس کا مضبوط کڑیل جسم کسی فولادی چٹان کی مانند لگ رہا تھا۔ اس کے چوڑے شانوں پر سفید رنگ کا ہی صاف رکھا تھا۔ فراخ پیشانی پر دو سلوٹیں اور آنکھوں میں کچھ کچھ ناگواری در آئی تھی۔ یعنی اسے مردانے میں حویلی کی خاتون کا آنا پسند نہیں آیا تھا۔

”جو تم چاہتے ہو، وہ قیامت تک نہ ہوگا“ مرجان بی بی نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”جو میں چاہتا ہوں اور جس کام کا میں ارادہ کرتا ہوں، اسے سچ میں چھوڑنا میرام ارد شیر کا شیوہ نہیں۔ اس طوفان کو دعوت مت دیں، جسے میں نے روک رکھا ہے“ اس کے ٹھہرے لہجے میں بڑی مضبوطی اور بے ساختگی تھی۔

مرجان بی بی سلگنے لگیں۔

وہ بدگمانی کی آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔

کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ خون بہا میں بیاہی جانے والی بیٹیاں جوتی کی نوک پر رہتی ہیں۔ تمام عمران کی اپنے مقام اور حیثیت کے تعین میں گزر جاتی ہے۔ نہ ان کے حصے میں عزت آتی ہے نہ محبت۔ عمر بھر اپنا مقام بنانے کی چاہ میں چاندی بالوں میں سجالینے والی روایتوں کی زنجیر میں جکڑی مجبور ہے بس بیٹیاں۔ کبھی باپ کو بچانے کے لیے ڈھال بنتی ہیں اور کبھی بھائی کو۔ شوہر کی رضا اور خوشی کی خاطر خود کو فنا کرنے والی اس بات سے قطعاً ناواقف کہ شوہر کے دل میں تو نہیں البتہ اس کے بستر پر ضرور جگہ مل جاتی ہے۔ مجرم کوئی اور ہوتا ہے، عذاب کسی اور پر اترتے ہیں۔

”تم اس قدر بدگمان کیوں ہو رہی ہو؟“ پشینہ نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر جھنجھوڑا۔  
”مجھے مستقبل کے اندیشے خوف زدہ کرتے ہیں“  
”تمہیں شاہ سائیں پر بھروسہ نہیں“

”مجھے نانا سائیں پر مکمل اعتماد ہے مگر خود پر نہیں، اپنی قسمت کا اعتبار نہیں“ وہ بھیگی آواز میں بولی۔

”تم بلاوجہ خود کو اذیت دے رہی ہو“ پشینہ نے اسے سمجھانا چاہا۔  
”میرے کرب کا اندازہ نہیں تمہیں پشینہ“ اس کی آنکھ سے اک آنسو بے مول سا ہو کر گرا تھا۔

”مہرو! ایک بات تم دل سے نکال کیوں نہیں دیتیں۔ بڑی حویلی والے تمہیں خون بہا میں نہیں لے کر جا رہے وہ تو بہت دھوم دھام سے شادی کرنا چاہتے ہیں“ اس نے مہرماہ کا ہاتھ دبا کر نرمی سے کہا تھا وہ پشینہ کا ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

”مہرو! کہاں جا رہی ہو بیٹھو ادھر“ پشینہ نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے قریب بٹھایا  
”تم سمجھتی کیوں نہیں مہرو! یہ رشتہ کسی پرانی دشمنی کے سلسلے میں نہیں بلکہ نفرتوں اور کدورتوں کو ختم کرنے کے لیے صرف اور صرف میرا لالہ کے کہنے پر استوار کیا جا رہا ہے“

”لغونہ تو آغا سائیں کی سگی نواسی ہے اور اگر ان کے پوتے کی دلہن بن جاتی تو اس میں حرج ہی کیا تھا“ وہ چیخ کر رہ گئی۔

”میرا لالہ نے تمہارا نام لیا تھا“ پشینہ زچ جو کر بولی۔

”یہ مراقبہ کس خوشی میں؟“ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولی ”مہرو! اتنی چپ چاپ کیوں ہو؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ پشینہ نے کچھ پریشانی کے عالم میں اس کے بازو کو جھنجھوڑا۔  
”ناکملہ.....“ وہ زیر لب بڑبڑائی۔ پھر ایسی نگاہوں سے پشینہ کی طرف دیکھنے لگی تھی جیسے کہہ رہی ہو ”کیا تم نہیں جانتیں“

”مہرو! خود کو سنبھالو..... مضبوط ہو“ پشینہ اس کی شفاف آنکھوں میں پھیلی نمی دیکھ کر پشیمان ہو گئی۔

”آج اماں بہت خوش تھیں ان کی ایک مسکراہٹ پر ہزار زندگیاں قربان۔ میری ماں کے صبر اور حوصلے کو دیکھ کر پہاڑوں کے سینے شق ہو جائیں۔ انہیں ارد شیر ماما اور نینب خالہ کا آخری دیدار بھی نہیں کرنے دیا گیا تھا۔ نانی جان کی وفات ہوئی تب دادی جان زندہ تھیں، انہوں نے تب بھی اماں کو جتا دیا تھا کہ اگر وہ بڑی حویلی جانا چاہتی ہیں تو پھر واپس آنے کی کوئی ضرورت نہیں اور میری ماں سارے صدمے دل پر جھیل کر خاموش ہو گئی تھیں، پھر کبھی ان کے لبوں پر میسے کا ذکر نہیں آیا اور اب تو بات ہی دوسری ہے ارد شیر ماما کے قتل کا فیصلہ پنچائیت نے کیا تھا اور اس وقت سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ خود بہا میں بابا جان خود تمہارا نام لے چکے تھے۔ پنچائیت نے اس فیصلے پر مہر لگا دی تھی۔ اب وعدہ ایفا کرنے کا وقت آچکا ہے۔ تم اس فیصلے سے ناواقف نہیں ہو۔ شعور کی لگا میں تھامتے ہی تمہیں آگہی دے دی گئی تھی، پھر اس جہنی توڑ پھوڑ کا شکار کیوں ہو رہی ہو۔ ایک بات بہن سمجھ کر بتا رہی ہوں۔ میرے نکھیل والے کوئی ظالم جلا نہیں ہیں۔ تمہیں ان کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا ہے سب جھوٹ پر مبنی ہے۔ میرے لالہ جیسا تو ہمارے خاندان میں کوئی نہیں ہے“

وہ اپنے نکھیل والوں کی فطری محبت سے مغلوب کہہ رہی تھی نجانے اسے لمحہ بھر میں کیا ہوا تھا وہ تیزی سے اٹھی اور بھاگتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پشینہ بھی سرعت سے اس کے پیچھے آئی تھی۔

”مہرو! یہ کیا پاگل پن ہے“ پشینہ نے اس کے آنسوؤں سے تر چہرے کو اپنی ہتھیلیوں سے پونچھا۔

”مجھے سولی پر چڑھانے کے فیصلے کیے جا رہے ہیں اور افسوس اس بات کا ہے کہ میرے گئے بھائی اور ہونے والی بھابی کو یہ فیصلہ دل و جان سے قبول ہے“

”ہاں صرف اور صرف اس لیے کہ میں مہمند عباس کی بیٹی ہوں۔ اس کے باپ کے قاتل کی بیٹی اس نے میرا ہی نام لینا تھا۔ آخر میرے باپ کو جھکا نا بھی تو ہے“ وہ پھنکاری۔

”اس کہر کے پیچھے کچھ صاف منظر بھی ہیں مگر تم کیوں دیکھو گی۔ تمہیں تو جو کچھ مرجان بی بی دکھائیں گی وہ ہی دیکھو گی ناں۔ خدا کے لیے ان کی آنکھوں سے دیکھنا چھوڑ دو مہر“ پشینہ نے جھنجھلا کر اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

”کوئی شخص میری حمایت میں بولتا ہے تو وہ تم لوگوں کو برا لگتا ہے“ اس نے فحش سے کہتے ہوئے رخ موڑ لیا۔

”سجائے تمہاری موٹی عقل میں کوئی بات سمائی کیوں نہیں“ پشینہ نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

”میں سب کی چالیں خوب اچھی طرح سمجھ چکی ہوں“ اس کی سوئی ایک جگہ انک جچی تھی، اب کہ پشینہ نے کچھ ٹھٹھک کر اسے دیکھا تھا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”وہ ہی جو تم میں سے کوئی بھی سننا نہیں چاہتا“ مہر ماہ چبا چبا کر بولی۔

”صاف لفظوں میں بات کرو“ پشینہ کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

”اس صلح کے نتیجے میں تم لوگوں کے لیے کم از کم انھیال کے دروازے تو کھل ہی جائیں گے۔ اس کے بدلے میں چاہے کسی کی پوری زندگی داؤ پر لگ جائے“

”مہر! تمہاری سوچ اس قدر پست ہے“ کافی دیر بعد پشینہ کی صدے میں ڈوبی آواز ابھری تھی ”تم ہمارے بارے میں اس طرح سے سوچتی ہو“

”میں نے حقیقت بیان کی ہے“ وہ سرد لہجے میں بولی۔

”میں اس لیے غصہ نہیں کر رہی ہوں کم از کم اس وقت جو تمہاری زبان چل رہی ہے وہ کسی اور کی ہے تم پر مرجان بی بی کا سایہ ہے۔ جب تک یہ سایہ ہے گا تا تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی“ پشینہ نے تاسف سے کہا۔

”میں تو اس بات پر خوش ہوں کہ اس گھر میں کوئی تو ہے جو میرے بارے میں سوچتا ہے ورنہ یہاں تو گنگے بھائی کو دو منٹ فون پر بات کرنے کی فرصت نہیں“ وہ کیٹیلی آواز میں کہہ کر بال کھولنے کے بعد برش کرنے لگی تھی۔ پشینہ بغور اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”تمہیں یہ پتا ہے کہ بھائی تم سے بات نہیں کرتا، یہ نہیں سوچا کہ کیا وجہ ہے؟ وہ کیوں

تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ حالانکہ اسے تم سے بہت محبت ہے“

”محبت اونہہ..... ہماری قسمت میں محبت کہاں“ مہر ماہ بے زاری سے بولی۔

”بدگمانی کا پردہ ہٹا کر دیکھو گی تو بہت سے محبت کرنے والے اور قدر کرنے والے لوگ نظر آئیں گے“ پشینہ کی آواز میں تاسف تھا۔ وہ کچھ دیر مزید بیٹھی رہی پھر ٹھنڈی سانس لیتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

شاہ عبدالوہاب اور آغا سبطین شاہ دونوں بھائی پہلے ایک ہی حویلی میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے والد شیخ احمد آباد کے گدی نشین تھے۔ ان کے والد کی وفات کے بعد دستار شاہ عبدالوہاب کے سر پر رکھی گئی تھی مگر گدی کے وارث آغا سبطین چھوٹے ہونے کی وجہ سے سنبھرائے گئے۔ ثریا جہاں کو یہ بھوارا پسند نہیں آیا تھا۔ گھر میں اک سرد جنگ کا کیا آغاز ہوا، حویلیوں کے بزارے کی باتیں ہونے لگیں اور کچھ ہی عرصہ بعد ثریا جہاں کے مجبور کرنے پر شاہ عبدالوہاب اپنے والد کی حویلی چھوڑ کر دوسری حویلی میں شفٹ ہو گئے۔ یہ حویلی بڑی حویلی سے رقبے میں چھوٹی تھی، تاہم ثریا جہاں اپنی من مانی کرنے کے بعد بہت مسرور تھیں۔

شاہ عبدالوہاب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی سب سے بڑی ثمر جہاں، صبادشاہ پھر صہیر تھے۔ ثریا جہاں کی ایک بیوہ بہن بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ جن کا انتقال ہو چکا تھا ان کا اکلوتا بیٹا مہمند، صہیر سے تین سال بڑا تھا کافی ذہن اور بے حد پڑھا کو ہونے کی وجہ سے شاہ عبدالوہاب اسے بہت پسند کرتے تھے مرجان ان کی رشتے میں بھانجی لگتی تھی وہ بھی کافی عرصے سے اسی حویلی میں مقیم تھی۔

آغا سبطین کا ایک بیٹا ارد شیر شاہ اور دو بیٹیاں تھیں۔ فیضہ اور زینب۔

ثمر جہاں کی بات ارد شیر سے طے تھی لیکن اس نے یہ رشتہ توڑ کر اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مہمند نے پوری یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا شاہ سائیں نے مہمند کی کامیابی کی خوشی میں بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا تھا بہت عرصہ بعد اس دعوت میں صرف بھانجے کی خوشی کی خاطر ثریا جہاں نے آغا سبطین کی فیملی کو بھی انوائٹ کیا۔ ان کا بیٹا ارد شیر اپنی بیوی اور دو بیٹوں مہرام اور محبت کے ہمراہ امراڈ میں رہائش پذیر تھا۔ اس دعوت میں پہلی مرتبہ مہمند نے زینب کو دیکھا، زینب نے اسے پہلی نظر میں ہی بہت اچھی اور اپنی

ان ہی دنوں شاہ سائیں نے اپنے بیٹے صباد کے لیے اپنی بھتیجی فیضہ کو مانگ لیا تھا۔ اگرچہ ثریا جہاں ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھیں مگر بہت سے معاملوں میں وہ بے اختیار تھیں۔ دونوں حویلیوں میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

مہمند ان دنوں زمینوں پر مصروف ہو چکا تھا اس نے شاہ سائیں کی ساری ذمہ داریاں خود بخود اپنے کندھوں پر اٹھالی تھیں۔ صباد شاہ اپنی جاب کے سلسلے میں کراچی میں مقیم تھے، جبکہ صمیر تو بہت لا پرواہ تھا۔ کبھی موڈ ہوتا تو ڈیرے کا چکر لگا لیتا۔ زیادہ اس کا وقت بڑی حویلی میں گزرتا تھا شہر سے آنے کے بعد وہ سیدھا بڑی حویلی چلا جاتا۔ ثریا جہاں کو خبر ہوئی تو انہوں نے صمیر کے خوب لٹے لیے اس جھاڑ بھپاڑ کا یہ اثر ہوا کہ پہلے وہ بتا کر جاتا تھا اب بغیر بتائے چلا جاتا۔ کافی عرصہ تک ثریا جہاں یہی سمجھتی رہی تھیں کہ صمیر نے اپنے چاچا کی حویلی میں جانا چھوڑ دیا ہے مگر ایک روز انہیں صمیر کے معمول کی خبر کسی اور ذرائع سے مل ہی گئی تھی وہ حسب معمول شہر سے سیدھا دھر ہی گیا تھا وہی جی پر جب گھر آیا تو ماں کے تیور دیکھ کر قدرے گڑبڑا گیا۔ کالج میں اس کا آخری سال تھا۔ ان دنوں وہ چھٹیاں گزارنے گاؤں آیا ہوا تھا۔ مگر اب اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اماں چھٹیوں کی خوشی اور فراغت کے مزے کو کرا کر کے ہی رہیں گی۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“ اماں جلال میں آچکی تھیں۔ صمیر نے گہری سانس کھینچی اور بولا۔

”اماں فیضہ سے ملنے چلا گیا تھا“ صمیر کو جھوٹ بولنا مناسب نہیں لگا تھا مگر یہ سچ اس کے گلے پڑنے والا تھا۔ اسے خبر ہوئی تو کچھ جھوٹ کی ملاوٹ کر لیتا۔

”بکواس مت کرو“ اماں نے آگ بگولا ہو کر اسے جھڑک دیا تھا وہ ایک دم لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔

”فیضہ کے بہانے کس کا دیدار کرنے جاتے ہو؟“ ان کا لہجہ چبھتا ہوا تھا صمیر اسی طرح لب بھینچے رخ موڑے کھڑا رہا۔

”الحق سمجھ رکھا ہے تم نے ہمیں۔ کیا میں جانتی نہیں کہ تم باپ بیٹا کون سی کھجڑی پکار رہے ہو، مگر ایک بات سن لو! بڑی حویلی سے فیضہ کے علاوہ کوئی اور لڑکی دولہن بن کر نہیں آئے گی۔ میں بشکل اسے ہی قبول کر لوں یہی بہت ہے کجا کہ اس کی دوسری بہن ام زہب معین کے

لبوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

”اماں! آپ کس لہجے میں بات کر رہی ہیں“ صمیر نے ناگواری سے ٹوکنا چاہا اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بات اس حد تک کھل جائے گی۔

”اپنی عمر دیکھو اور حرکتوں پر نظر کرو۔ عشق و عاشقی کے لیے بہتر اوقات پڑا ہے ان بہنوں کو تو مردوں کو لبھانے کی عادت ماں سے وراثت میں ملی ہے“ انہوں نے ہاتھ نچا کر کہا تھا۔ یوں کہ کلائی میں پڑے موٹے موٹے کڑے بجنے لگے تھے۔

”اماں! کچھ کہنے سے پہلے یہ سوچ لیجیے کہ وہ ہماری عزت ہیں۔ ان کے بارے میں ایسی گھٹیا گفتگو آپ کو زیب نہیں دیتی“ صمیر کے لہجے میں ناگواری درآئی۔

”ماں کے بھی یہی لکھن تھے، اب بیٹیاں بھی ماں کے نقش قدم پر چل رہی ہیں“ وہ نفرت کی انتہا پر پہنچ چکی تھیں۔

”اماں“ صمیر کچھ سخت بولتے بولتے رک گیا۔

”ہاں، بول کیا کہنا چاہتا ہے کون سی صفائی پیش کرے گا۔ میں خوب جانتی ہوں کہ ام زہب نے تم پر ڈورے ڈال رکھے ہیں اب ماں کی باتیں کیسی ہی لگیں گی“ انہوں نے چاچا کر کہا۔

”محبت کرتا ہوں میں ام زہب سے لور شادی بھی اسی سے کروں گا۔ چاہے زمین اپنے مرکز سے ہٹ جائے۔ کوئی میرے ارادوں کو توڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا“ صمیر کے لہجے میں چٹانوں کی سختی تھی۔

”وہ ارد شیر کی بہن ہے جس نے تمہاری بہن کو ٹھکرایا تھا“ اماں کے لہجے میں پھنکار تھی۔

”فیضہ بھی ارد شیر کی بہن ہیں“ اس نے جتا کر کہا۔

”وہ معاملہ دوسرا ہے“

”اوہ، معاملہ یہی ہے بس شاہ سائیں کا فیصلہ بدلنے کی جرأت کسی میں نہیں۔ مگر یاد رکھیں ہمارے لیے جو بھی فیصلہ شاہ سائیں کریں گے، وہ ہمیں دل و جان سے منظور ہوگا“

اس نے بات کے اختتام پر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

”مہمند! کہاں جا رہے ہو؟“ باغ میں شہلیٹی ثمر نے راہداری سے گزرتے مہمند کو باہر کی

طرف جاتے دیکھ کر روکا۔

”شہر.....“ وہ مختصر بول کر قمیض کی جیب میں سے گاڑی کی چابیاں نکالنے لگا تھا۔ شہر ایک نیک اسے دیکھتی رہی اس کی شخصیت میں کچھ ایسا ضرور تھا جو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ جو چپکے چپکے اپنے اس خالہ زاد کے عشق میں مبتلا ہو چکی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ عمر میں اس سے کئی سال چھوٹا ہے۔ ذہین، ذمہ دار اور بہت ہی شاندار سا کس قدر اپنا اپنا اور دل کے قریب لگتا تھا۔ اس کی ہر رات مہمند کی یاد سے اور اس کے خیال سے آباد تھی۔ اور دل تو آباد ہی اس کی محبت کی خوشبو سے تھا۔ اس کا حصول مشکل بھی نہ تھا۔ بس اماں تک بات ہی تو پہنچانی تھی مگر فطری سی جھجک آڑے آجاتی..... شاہوں کی بیٹیاں اتنی بے باک تو ہرگز نہیں تھیں، جو اپنے منہ سے اظہار عشق کر لیتیں۔ مگر خواہوں پر تو کسی کا پہرہ نہیں تھا۔

”آپ کو کچھ منگوانا ہے شہر سے“ وہ مؤدب سا پوچھنے لگا۔

”ہاں.....“ شہر چونک کر سوچوں کو جھٹکتے ہوئے بولی۔

”مجھے لسٹ بنا کر دے دیں۔ واپسی پر لیتا آؤں گا“ اب وہ جھک کر گاڑی کے باؤر چیک کر رہا تھا۔ شہر نے لڑکی کو آواز دے کر بلایا۔

”دراز میں ایک ڈائری رکھی ہے۔ بھاگ کے اٹھالا“

کچھ دیر بعد شہر نے ایک لسٹ مہمندی طرف بڑھادی۔

”آپ تو بہت سادگی میں رہتی ہیں۔ پھر یہ سب چیزیں کس کے لیے“ وہ غیر ارادی

طور پر لسٹ پر نظر دوڑا کر پوچھنے لگا۔

”عید قریب آرہی ہے نا تو میں نے سوچا نیک کو کچھ گفٹس بھجوا دوں، فیضہ کو بھی میری طرح ایسی چیزوں کا شوق نہیں ہے مگر نیک کو جتنا سنورنا اچھا لگتا ہے۔ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے آغا سائیں کی بہت لاڈلی ہے ہمارے صہیر کی طرح“ شہر نے ذرا مفصل جواب دیا تھا۔ وہ اسے اپنے پاس روکے رکھنا چاہتی تھی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ تو کسی اور کا اسیر تھا۔

”زینب فوراً تھ ایئر میں ہے؟“ وہ جان بوجھ کر سرسری سا پوچھنے لگا تا کہ شہر کو شک نہ

گزرے۔

”ہاں“ شہر جہاں نے اثبات میں سر ہلایا تھا مزید بولی۔ ”نیک شاید آگے پڑھنا

نہیں چاہ رہی“

”کیوں؟“ مہمند بے ارادہ سی بول گیا۔

”وہ تو آغا سائیں کی خواہش پر ہی اے کر رہی ہے، ورنہ اسے بھی فیضہ کی طرح پڑھنے کا کچھ خاص شوق نہیں ہے“

شہر جانتی تھی کہ مہمند کو پڑھنے لکھنے ذہین لوگ بہت پسند ہیں۔ خود وہ بھی آٹھ جماعتوں سے آگے نہیں پڑھ سکی تھی۔

”ہاں، بات ساری لگن کی ہوتی ہے“ مہمند نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ نیک تو اسے دل و جان سے قبول تھی، چاہے وہ ان پڑھ ہی کیوں نہ ہوتی۔ یہ محبت کے معاملے تھے، یہ جنون کے قصے تھے۔ یہ وہ چاہ تھی جو چپکے چپکے دل کو سلگا رہی تھی۔ کون جانے دلوں کے درد، کون جانے محبتوں کے دکھ۔ کون جانے جدائیوں کے خوف۔

”تمہاری واپسی کب ہوگی شہر سے؟“ شہر نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر قدرے جھنجھلا کر کہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا مہمند ذہنی طور پر کہیں اور ہے۔

”شام تک آجاؤں گا“ اس کے لہجے میں احترام کا رنگ واضح تھا اور شہر جہاں تو احترام کے بجائے کچھ اور رنگوں کی خواہش مند تھی۔

”ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ مجھے بڑی حویلی جانا ہے اور صہیر کو تو اماں وہاں جانے نہیں دیں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں سہ پہر تین بجے تک آجاؤں گا“ اسے لگا من کی مراد بر آئی ہے۔

وہ اپنے چہرے پر بے ساختہ چمکتے والی خوشی کو چھپا کر سرعت سے آگے بڑھ گیا، جبکہ شہر جہاں اس کی پشت کو نبھانے کب تک دیکھتی رہی۔ اماں کو باغیچے میں آباد دیکھ کر وہ سنبھل گئی تھی۔

”سورج سوائیزے پر پہنچ گیا ہے اور تجھے جون کی گرمی کھانے کا شوق کیوں پڑھ گیا ہے شہر! چل اندر..... اے سی چلا کر بیٹھ، لو لگ گئی تو بستر کی ہو کر رہ جائے گی۔ ماں صدقے اندر چل“

ان دنوں اماں کو اس پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ شہر کا خیال رکھنے لگی تھیں، وہ اپنے بھائیوں کی طرح بہت خوب صورت نہیں تھی۔

شہر کو یاد تھا جب ارد شیر نے بچپن کی منگنی کو ختم کیا تو سب سے زیادہ صہیر نے ٹینشن لی تھی۔ وہ کئی دن مضطرب سا پھرتا رہا۔ وہ شہر کی گود میں سر رکھ کر روتا تھا۔ ارد شیر نے اس کی بہن کو ٹھکرا دیا تھا۔ ان کی عزت کو دو کوڑی کا کر دیا۔ اس تو بہن نے صہیر کی روح زخمی کر دی تھی۔ پھر



”میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ وجہ میں بتانا نہیں چاہتی وجہ جان کر کرو گے بھی کیا۔ بس یوں سمجھ لو۔ ہمارے ستارے نہیں ملے۔ ویسے بھی تم بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہو تمہیں، تمہارے جوڑ کی مل جائے گی“

اردشیر نے اس تحریر کو پڑھنے کے بعد واقعی کسی بھی قسم کی وضاحت طلب نہیں کی تھی، رکھی نے بہت سی تحقیقاتوں سے پردہ ہٹا دیا تھا۔

”شرابی بی کا دماغ چل گیا ہے سائیں! اپنے خالہ زاد ہند سائیں سے“

”بکواس مت کرو“ وہ لب بھیج کر چینا۔

”میں تو آپ کو“ وہ کچھ اور بھی بتانا چاہتی تھی مگر اردشیر نے اسے جھڑک کر خاموش کر دیا تھا۔ رکھی منمننا کر رہ گئی۔

اور پھر سب نے دیکھا کہ دونوں حویلیوں میں کیسا بھونچال آگیا۔ اردشیر نے اس نام نہاد بندھن کو توڑ کر اپنے بزرگوں کو خود سے خفا کر دیا تھا۔ وہ کرتا بھی کیا۔ اس کی غیرت ایک بی ہوئی سوچ والی عورت کو قبول کرنے اور اپنانے کے لیے تیار نہ تھی، سو اس نے ماں باپ کی خفگی کی پروا نہ کرتے ہوئے واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہیں اس کی ملاقات ملیحہ سے ہوئی تھی اور پھر جلد ہی انہوں نے شادی کر لی۔ ادھر حویلی والے جان گئے تھے کہ شاید یہی لڑکی تھی جس کی وجہ سے اردشیر نے خاندان سے بغاوت کی تھی۔

آج شمر جہاں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ سارے خسارے اسی کی جھولی میں آن پڑے ہیں۔

☆☆☆

بڑی حویلی سے آنے والے پیغام نے ایک مرتبہ پھر ثریا جہاں کو متوحش کر دیا تھا۔ سبطین شاہ، فیضہ کی رخصتی کرنا چاہتے تھے مگر ادھر ثریا جہاں کی خواہش تھی کہ پہلے شمر کو اس گھر سے رخصت کیا جائے بیٹی کی بڑھتی عمر کے احساس نے انہیں ہولا کر رکھ دیا تھا اور پھر صہیر کی زینب میں بڑھتی دلچسپی نے انہیں اور بھی پریشان کر دیا تھا شاہ سائیں مریدوں سے فارغ ہو کر اندرونی حصے کی طرف آئے تو ثریا جہاں کو بے چینی سے ٹھٹھٹا کر حیران رہ گئے۔

”اچھا ہوا آپ آگئے ہیں۔ میں ابھی پیغام بھیج کر آپ کو بلوانے والی تھی“ انہوں نے

صوفی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”خیریت“ شاہ سائیں کی آنکھوں میں تفکر تھا۔

آہستہ آہستہ وہ سنبھلنے لگا۔ مگر شمر کی بڑھتی عمر اور آنکھ کی لکیریں جب واضح ہونے لگیں تو ایک مرتبہ پھر صہیر کو اپنے نقصان رہ رہ کر یاد آنے لگے۔

پھر ان ہی دنوں اردشیر کی واپسی کی خبر حویلی میں گونجنے لگی۔ وہ اپنے دو بیٹوں اور بیوی ملیحہ کے ہمراہ واپس آ گیا تھا۔ وہ بطور خاص صہیر اور صباد سے ملنے آیا تھا۔ یہ دونوں مستقبل میں اردشیر کے بہنوئی تھے۔ سواب تو دودھری رشتے داری تھی۔

”شرآپا! کہاں گم ہو..... ذرا یہ سوٹ تو دیکھو، میں نے کتنا اچھا کام بنایا ہے اس کے اوپر“ مرجان بی بی نے بھانجے کہاں سے اس کی سوچوں کے تسلسل کو توڑنے کے لیے پہنچ گئی تھی۔ شمر نے بے خیالی میں قمیض ہاتھ میں پکڑ لی۔

”خوب صورت بنائی ہے نا.....؟“ مرجان بی بی کے سرخ و سفید چہرے پر جوش اور خوشی کے رنگ تھے۔

”ہوں..... اچھی ہے“

”آپ تو پتا نہیں کیا سوچتی رہتی ہیں ہر وقت“ مرجان بی بی کو اتنی سی تعریف ہضم نہیں ہوئی تھی۔

”تم کیا جانو“ اس کا انداز اب بھی کھویا کھویا تھا۔

”ہاں..... یہ آپ کی عمر کا تھا ضابطہ۔ آپ پینتیس سال کی ہو چکی ہیں آپا!“ بڑی کڑی حقیقت وہ بہت سفاکی کے ساتھ شمر کے منہ پر مار گئی تھی۔ شمر پل بھر کے لیے ششدر رہ گئی۔

وہ بے خیالی میں ابھی اس کا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ لاک کیا اور دیوار میں نصب آئینے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ خود کو بغور دیکھنا چاہتی تھی۔

”اور یہ آئینہ واقعی سچ کہہ رہا ہے“ اس نے آئینے میں ابھرتی اپنی شبیہ کو دیکھا اور زیر لب بڑبڑائی۔

اسے نو سال پہلے کے کچھ منظر یاد آنے لگے تھے اس نے اپنے ہاتھوں سے زندگی کی بہت ساری خوشیاں خود کھودی تھیں، صرف اور صرف اس محبت کی خاطر جو اسے بھانجے کب سے ناسور بنی چاٹ رہی تھی۔

رکھی کے ہاتھ اس نے اردشیر کو کیا پیغام بھیج دیا تھا۔ اسے سب کچھ پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا دونوں نظموں کی اس تحریر نے اردشیر کی غیرت پر کیا تازیانہ مارا تھا۔

”جب بیٹیاں تیس سے اوپر ہونے لگیں تو خیریت نہیں پوچھا کرتے“ ثریا جہاں نے غم آواز میں کہا ”آپ کے بھتیجے نے میری بیٹی کو ٹھکرا کر اس پر زندگی کے دروازے بند کر دیئے ہیں“ ثریا جہاں کی آواز میں بلا کی کاٹ تھی۔ شاہ سائیں کچھ پل کے لیے بالکل خاموش رہ گئے تھے۔ کس قدر شاندار تھا ان کا بھتیجا مگر شر کے نصیب میں نہیں تھا۔

”اب کیا سوچا ہے تم نے“ بہت دیر بعد انہوں نے خاموشی کو توڑا۔

”اب میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لیے آپ کو بلوایا ہے میں نے سوچا ہے کہ.....“ وہ آہستہ آواز میں ان کے کان کے قریب جھک کر کہہ رہی تھیں۔ شاہ سائیں کی آنکھوں میں پہلے الجھن اور پھر پریشانی چھلکنے لگی۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”کیوں ممکن نہیں“ آپ رضامندی دیں اور باقی کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں“ ثریا جہاں نے اندرونی خوشی چھپا کر کہا۔

”مہمند مان جائے گا۔ کیا یہ اس کے ساتھ زیادتی نہیں؟“

وہ سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

”کیسی زیادتی، سید عبدالوہاب کا داماد بنے گا۔ یہ تو اس کی خوش بختی ہے“ انہوں نے تقرر سے کہا۔ عام حالات میں تو شاید شاہ سائیں کو منانا مشکل تھا، مگر اب فیضہ کی وجہ سے بھی انہیں مان جانا پڑا تھا۔ کیونکہ ثریا جہاں، شہر کی شادی سے پہلے فیضہ کو اس گھر میں لانے کے لیے تیار نہ تھیں۔ ادھر سلطان شاہ، بیٹی کو جلد از جلد رخصت کرنا چاہتے تھے۔

”پھر بھی تم مہمند کیساتھ زبردستی مت کرنا، پہلے اس سے پوچھ لو، اگر وہ دل سے رضا مند ہوا تو ٹھیک ہے ورنہ جو شر کے نصیب“ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”وہ کیوں نہیں مانے گا۔ کروڑوں کی جائیداد شر کے نام ہے۔ اس حویلی میں برابر کا حصہ ہے، ہماری بیٹی کا تو پھر مہمند کو اور کیا چاہئے۔ بے نام و نشان نشئی باپ کا بیٹا۔ ہماری بیٹی کی بہت قدر کرے گا“ وہ مکمل پلاننگ کر چکی تھیں۔ صرف شاہ سائیں سے اجازت درکار تھی۔ سو انہیں رضامند دیکھ کر وہ مسرور ہو گئیں۔

اپنے جان سے پیارے بھانجے کی بیٹی کے ساتھ وسیع و عریض جائیداد اور جاگیریں سوپنے کا خواب تو بہت پہلے انہوں نے دیکھ رکھا تھا۔ اب تکمیل کے مراحل طے کرنے تھے انہیں

یقین تھا مہمند انکار کر ہی نہیں سکتا۔

اب وہ ایک لمحے کی دیر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسی رات انہوں نے مہمند سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جوں ہی انہوں نے اپنے تئیں یہ خوشخبری مہمند کو سنائی، وہ چند پل کے لیے بالکل گم سم رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی سائے آتے جاتے رہے۔ وہ بہت دیر بعد کچھ کہنے کے قابل ہو سکا تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں خالہ اماں“

”تیری خوش نصیبی کا اعلان کرنے والی ہوں میری اور تیری بد نصیب ماں کی یہی خواہش تھی۔ میں تمہیں اس حویلی اور شاہوں کی جائیداد کا وارث بنانا چاہتی ہوں“ وہ اس کی پیشانی چوم کر دل سے بولیں۔

”مگر خالہ اماں! ایسا کس طرح ممکن ہے۔ شرمجھ سے بڑی ہیں۔ میں ان کی بڑی بہنوں کی طرح عزت کرتا ہوں“ وہ متوحش سا ثریا جہاں کو دیکھتا رہا۔

”خوش نصیبی دروازے پر دستک دے تو آگے بڑھ کر کواڑ کھول دیتے ہیں۔ احمق مت بن، آج تک میں تیرے انتظار میں ابھی تک شرم کو اس دہلیز پر بٹھائے ہوئے ہوں۔ میں چاہتی تھی تو پڑھ لے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جا۔ اس جاگیر کو سنبھالنے کے قابل ہو جا۔ میں نے تیری خاطر اپنی کوکھ سے جنم لینے والی بیٹی پر بہت ظلم کیا ہے اب تو نے میرا مان رکھنا ہے۔ دیکھ شاہ سائیں کے سامنے مجھے شرمندہ مت کرنا“ انہوں نے بے تحاشا روتے ہوئے اپنی چادر اتار کر مہمند کے قدموں میں رکھ دی۔

”خالہ اماں! کیا کر رہی ہیں آپ؟“ وہ لرزیدہ آواز میں چادر اٹھا کر ان کے سر پر پھیلائے لگا تھا۔

”بتا..... کیا جواب ہے تیرا“ انہوں نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ مہمند کی آنکھ سے ایک آنسو گر کر قالین میں کہیں جذب ہو گیا تھا۔ اس نے دوزانو بیٹھ کر اپنے ہاتھ خالہ اماں کے گھٹنوں پر رکھ دیئے۔

”اس طرح میرا امتحان مت لیں خالہ اماں“

”اتوار کی شام کو نکاح ہے“ وہ سنی ان سنی کر کے اپنا حکم سن رہی تھیں۔

”خالہ اماں! ایک مرتبہ پھر سوچ لیں“ اس کا دل کر لا رہا تھا۔ محبت کی کوئلیں ابھی

پھوٹی ہی تھیں کہ کس بے دردی سے انہیں نوح دیا گیا تھا۔ اس کے تصور میں ام زینب کا چہرہ تھا۔ اس چہرے سے مہمند عباس نے عشق کیا تھا۔

”مجھے خود کو ایک سمجھوتہ بھری زندگی گزارنے کے لیے تیار کر لینا چاہئے“ وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا حویلی سے بہت دور چلا گیا تھا اور ادھر حویلی میں ثمر جہاں اور مہمند عباس کے نکاح کا اعلان کر دیا گیا۔

”مرجان بی بی نے سنا اور دل تھام کر رہ گئی۔

”سدا کی بخت آور ہو ثمر جہاں! اور ہم ہیں تم لوگوں کے نگہوں پر پلنے والے بے زبان لوگ۔ ہمیں جب چاہو اپنے مطلب کے لیے استعمال کر لو۔ آخر جو رزق تم لوگوں کا ہمارے حلق میں اترتا ہے اس کا حق بھی تو ادا کرنا ہے“

وہ نفرت بھرے لہجے میں زبر لب بڑبڑاتی تھی۔ اس کے دل نے بھی تو چپکے سے مہمند عباس کی تمنا کی تھی۔ آج کسی اور کانٹک آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ اگلی صبح مرجان بی بی اپنی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر پھینکی سی ہنس رہی تھی۔

ثمر جہاں کو دو جہان کی خوشیاں مل گئی تھیں۔ جمعہ کو نکاح کی رسم ادا کی گئی تھی۔ اردشیر پردوؤں کے نکاح کی خبر بجلی بن کر گری تھی۔ مہمند سے اس کی نفرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

مہمند آج تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ بڑی حویلی والے اس سے اتنی نفرت کرتے کیوں ہیں؟ اردشیر سے جب بھی کبھی ملاقات ہوتی وہ اسے لفظوں کے تیروں سے چھلنی کر دیتا۔

”محض وراثت میں حصہ لینے کے لیے تم نے اپنے سے بڑی عمر کی عورت سے شادی کر لی“

ان کی شادی کے کچھ عرصہ بعد صبا اور فیضہ کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ ثمر جہاں کے ہاں پہلا بیٹا ہوا تو پورے تین دن تک دیکھیں پکتی رہیں۔

ادھر فیضہ کی شادی کے چھ سال بعد پشینہ اور پھر لغونہ پیدا ہوئیں۔ ان ہی دنوں ایک ایکسڈنٹ میں صبا کا انتقال ہو گیا۔ حویلی کے رنگ نبھانے کیوں آہستہ آہستہ مدہم ہو کر اڑ رہے تھے۔

فیضہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گم ہونے لگی تھی اور ثمر جہاں کی آنکھوں کی چمک بجھ کر رہ گئی تھی۔ مومن کے بعد مہر ماہ کی پیدائش پر کچھ پیچیدگی ہو جانے کی وجہ سے صبا کے صرف تین ماہ بعد ثمر جہاں بھی آنکھیں موند گئی تھی۔ حویلی کے درو دیوار پر ادا سیوں نے ڈیرہ جمالیا تھا۔

ثریا جہاں، دو جوان بچوں کی اچانک موت پر اندر سے ٹوٹ کر رہ گئی تھیں۔ شاہ سائیں کے شانے

جھک گئے تھے۔

اتنی بڑی حویلی میں ثریا جہاں بولائی بولائی پھرتیں۔ ان کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ مگر ابھی کچھ اور استحانات باقی تھے۔ بعض دفعہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال بھی دل سے سکون اور خوشی کو منادیتا ہے۔ کچھ یہی حال ثریا جہاں کا تھا۔ بیٹی کی خوشیوں کو قائم دائم رکھنے کے لیے انہوں نے مہمند کے دل کو اجاڑ دیا تھا۔ اب صمیر کو کم از کم اس کی خوشی سے محروم کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے بڑی چاہ سے ام زینب کا رشتہ ناجائز مہمند نے بہت شدت سے مخالفت کی تھی۔

”اس خطے میں کیا لڑکیاں ختم ہو گئی ہیں صمیر کے لیے“

”مگر مہمند پتر! یہ صمیر کی خواہش ہے“ ثریا جہاں نے نرمی سے کہا۔

”آپ نے کب سے دوسروں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا ہے“ اس کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ وہ تیز قدموں سے نکل گیا۔ ثریا جہاں سوچوں میں گم بیٹھی اسے جاتا دیکھتی رہیں۔

☆☆☆

”تم بابا جان سے کب بات کرو گے صمیر! اب کیا مسئلہ ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نیا بہانہ نیا جھوٹ تیار کر کے لے آتے ہو“ زینب نے ناراضی سے کہا۔

”ابھی تو ثمر آپا کا غم تازہ ہے۔ لالہ کے قبر کی مٹی تک سوکھی نہیں اور میں کیسے شادی کی بات چھیڑ دوں۔ تم بھی کمال کرتی ہو“ صمیر نے ناراضی سے کہا۔

”ثمر آپا کے غم کی بات تم نے خوب کہی ہے۔ تائی جی نے مرجان بی بی سے مہمند بھائی کا نکاح کر دیا ہے۔ ابھی تو ان کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہوگا“ زینب نے رنجیدگی سے کہتے ہوئے باڑ میں سے ایک پیلا پھول توڑ کر تھیلی پر رکھ لیا۔

”مجبوری تھی..... اماں بھی کیا کرتیں اس عمر میں مومن اور منشی سی مہر ماہ کی سناری ذمہ داری ان ہی پر آپڑی تھی۔ چھوٹے بچوں کو بھلا کون سنبھالتا۔ ان کی سوز و ریا تھیں، پھر

مرجان بی بی پہلے بھی انہیں بہت خوش اسلوبی سے سنبھال رہی تھیں، سو اماں کا فیصلہ تو بہتر ہی رہا ہے۔ مہر ماہ تو مرجان بی بی سے خوب مانوس ہو چکی ہے۔ مہمند بھائی کے اکھڑے اکھڑے رویوں کے باوجود کبھی بی بی مرجان کی پیشانی پر سلوٹ نہیں آئی“ صمیر کے لہجے میں اداسی تھی۔

”تمہاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے صمیر! مگر لالہ اب میری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ رات کو بھی وہ اسی سلسلے میں بابا جان سے بات کر رہے تھے کیونکہ لالہ اور بھابھی نے جلد ہی ابراؤ

چلے جاتا ہے اور وہ میری ذمہ داری سے فارغ ہونا چاہتے ہیں۔“ زنبب جھنجھاکر بولی۔

”تمہارے لالہ نے میرا ایک قرض چکانا ہے زنبب! انہیں کہنا ابھی ابراؤ جانے کا خیال دل سے نکال دیں“

”کون سا قرض؟“ زنبب ٹھٹھکی۔

”ایک فرض ہے ان پر میرا۔ شاید وہ تو بھول بھی چکے ہوں گے“ وہ دور کہیں خلاؤں

میں دیکھ رہا تھا۔

”میں تمہاری بات سمجھی نہیں“ اس نے حیرانی سے کہا۔

”سمجھ جاؤ گی بہت جلد“ صہیر نے پھٹکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجالی تھی۔

”نجانے کبھی کبھی تمہیں کیا ہو جاتا ہے صہیر!“ زنبب الجھی۔

”ماضی کی ہوا پرانے رنوں کو ادھڑاتی ہے“ اس کے لہجے میں ٹوٹے کاچ چڑ رہے تھے۔

”خیر چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ جا ب کا کیا بنا؟“ زنبب نے بے زار ہو کر موضوع ہی

بدل دیا۔

”ایک دو آفرز ہیں مگر میں نے ابھی سوچا نہیں ہے جا ب کے متعلق“

”کیوں؟“ اس کی آنکھوں میں حیرانی در آئی۔

”میں ابھی کچھ عرصہ تک اپنے ارد گرد کی دنیا کو جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں اور پتا ہے

تمہیں زنبب! کہ میری دنیا کون سی ہے“ وہ ایک دم اس کی طرف پلٹ کر بغور اس کے چہرے کی

طرف دیکھنے لگا تھا۔

”بتاؤ تو پتا چلے نا“ وہ نگاہ چرا کر پھر سے پھولوں کی کنج کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کچھ

فاصلے پر جھیل کے ٹھنڈے میٹھے پانی میں گرمی کی شدت سے ٹڈھال ننھی چڑیا منہ مار رہی تھی۔

”میری دنیا صرف تم ہو ام زنبب! میں نے تم سے اوائل عمری میں محبت کی ہے۔

میری زندگی میں، میرے دل میں صرف تم ہی تم ہو اور جب میں مروں گا تو تب بھی میرے دل

میں صرف تمہارا ہی احساس اور خیال ہوگا۔ کبھی میرے دل اور میری محبت سے بدگمان مت ہونا

میرا اور تمہارا روح کا تعلق ہے۔ کیا تمہیں نہیں لگتا زنبب! کہ آقا اور مہمند بھائی کی شادی بے جوڑ

تھی۔ نہ ان کے ذہن ملے تھے، نہ دل اور میں جانتا ہوں کہ یہ مجبوری کا بندھن کیوں باندھا گیا تھا“

وہ بھیگی آواز میں خود کا می کر رہا تھا، یوں کہ کچھ فاصلے پر موجود زنبب اس کی کچھ کچھ

باتیں ہی سمجھ سکتی تھی۔

”تم میرے لالہ کیساتھ بزنس کیوں نہیں کر لیتے۔ وہ ان دنوں ایک اور فیکٹری لگانے

کا سوچ رہے ہیں۔ تم پانٹر شپ کر لو۔ کچھ عرصہ تک تمہیں خوب تجربہ حاصل ہو جائے گا۔ پھر

بھلے سے اپنا بزنس الگ کر لینا“ زنبب نے ایک بہترین مشورہ دیا تھا۔ صہیر نے ایسے ہی بے

خیالی سے سر ہلا دیا۔

”میں تو کبھی زمینوں پر تیار فصل دیکھنے نہیں گیا اور تم فیکٹری کی بات کر رہی ہو“ وہ

بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکرایا۔

”سب ذمہ داریاں مہمند بھائی کے کندھوں پر ڈال رکھی ہیں۔ کبھی تم بھی ان کا

احساس کر لیا کرو“ زنبب نے خفگی سے کہا۔

”میں اس معاملے میں نا اہل ہوں“ صہیر نے زنبب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھایا اور

اس کے کان کے قریب جھولتی ہوئی لٹ کو ہٹاتے ہوئے بولا، ”مجھ جیسے بے روزگار سے شادی کر

کے تمہیں کیا ملے گا“

”حویلی کی راجدھانی“ زنبب مسکرائی۔

”حویلی میں تو اب بھی راج کر رہی ہو“ صہیر نے حیرانی سے کہا۔

”میں تمہاری حویلی میں راج کرنا چاہتی ہوں۔ تائی اماں جیسا لباس زیب تن کروں

گی۔ یہ گلایوں میں مونٹے مونٹے کھنکیں گے۔ پیروں میں پازیمیں بجیں گی۔ ان ہی کی

طرح سب پر رعب ہوگا میرا“ وہ مزے سے بولی۔

”اماں فیضہ بڑی ہیں۔ رعب تو ان ہی کا ہوگا، سب پر اور ان ہی کے فیصلے کو اہمیت

دی جائے گی“

”اماں فیضہ نے کب کب کسی پر رعب جمایا ہے۔ ان کی تو آواز ہی اتنی نرم ہے۔ میں ان

کے حصے کا رعب سب پر جماؤں گی“

”خواتین لوگوں کی بد دعائیں اکٹھی کرنے کی کیا ضرورت ہے“ صہیر نے اسے

فورا ہی ٹوکا۔

”دعائیں بھی بہت ہیں، میرے پاس اب اٹھو مغرب کی اذان ہونے والی ہے“

”کیا دعا مانگو گی؟“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بے ساختہ مسکرایا۔

”منہ دھو رکھو تمہارے حصول کے لیے نہیں ہے“ زینب نے لا پرواہی سے کہا۔

”کیوں؟“

”تم تو آل ریڈی میرے ہو“

”اتنا بھروسہ مجھ پر“ صہیر کے قدموں کی رفتار سست ہونے لگی تھی۔

”ہاں“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

”اور اگر کبھی یہ بھروسہ ٹوٹ جائے تو“ وہ کچھ گم صم سا بول رہا تھا۔

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا“ زینب کی آنکھوں میں کیسا یقین تھا۔ صہیر کا دل کہیں ہاتال

میں گرنے لگا۔

”فرض کرو..... میں بدل جاؤ، وقت بدل جائے کچھ ایسا ہو جائے جو تمہاری توقع سے

بالکل برعکس ہو۔ پھر کیا کرو گی“

”وقت بدل سکتا ہے حالات بدل سکتے ہیں مگر تم کیوں بدلو گے“ اس نے لہجے میں

نفذی سمو کر قدموں کی رفتار تیز کر دی تھی۔

”ایک وعدہ کیا تھا خود سے آپا! اب مجھے لگتا ہے بدلہ چکانے کا وقت قریب آ رہا ہے

اور اب میں سوچتا ہوں کہ زندہ رہ کر بھلا کیا کروں گا۔ کیا کوئی دل کے بغیر زندہ رہ سکا ہے۔

ارد شیر شاہ نے آپ کو ٹھکرا دیا۔ آپ کا مجرم اپنی زندگی کی رنگینیوں میں مگن ہے اور آپ شہر خموشاں

میں گہری نیند سو رہی ہیں۔ ابھی تو آپ کو جینا تھا آپا! مومن اور مہر ماہ کی خوشیاں دیکھنا تھیں۔ ان

کے لاڈ اٹھانے تھے۔ آپ نے اتنی جلدی کیوں ہم سے رخ موڑ لیا ہے آپا!“ اس کی آنکھوں

سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

ام زینب کی قسمت کا فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ ایک اور دل درد سے آشنائی پانے والا تھا۔

اک اور آنکھ سے نیند روٹنے والی تھی۔ اک اور دل پر شام اترنے والی تھی۔

صہیر عبد الوہاب نہیں جانتا تھا کہ اس کی لاڈلی آپا شہر جہاں کو ارد شیر شاہ نے نہیں مہمند

عباس کی بے رخی نے مارا ہے۔ اسے پچھتاؤں کے کوڑوں نے مارا ہے۔ اسے ایک غلط فیصلے پر

سر جھکا دینے کی اذیت نے مارا ہے اسے ایک بے جوڑ بندھن میں بندھ جانے کی اس ذلت نے

مارا ہے جو سات سالوں تک اس کا نصیب بنی رہی تھی۔

☆☆☆

”میری زندگی شروع سے ہی طوفانوں کی زد میں رہی ہے میں بہت چھوٹا تھا جب

ایک رات میرا باپ زخمی حالت میں گھر آیا اس کا پورا وجود کچھڑ میں لت پت تھا اسے نشے کی کمی

محسوس ہو رہی تھی اور وہ اپنے جسم کو نوچ کھسوت رہا تھا اسی حالت میں تڑپتے ہوئے گالیاں دیتے

چیتنے چلاتے میرے باپ نے جان دے دی مجھے تیبی کے بعد احساس ہوا کہ یتیم ہونا تو بہت

فائدہ مند ہے کم از کم میں نشے کا بیٹا کھلوانے کی ذلت سے بچ گیا ہوں۔

زندگی کا ایک دور نواب شاہ میں ختم ہو گیا تھا ایک نئے دور کا آغاز شاہ عبد الوہاب کی

حویلی میں ہونے والا تھا میری ماں مجھے اپنی بہن کی محل نما حویلی میں لے آئی تھی۔ یہاں میری

دلچسپی کے لیے بہت کچھ تھا مگر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا کیونکہ یہ سب میرا نہیں تھا۔ اس پر یعنی

آپ کا، صادق دلالہ اور صہیر کا حق تھا۔ میں نے کبھی کسی کی چیز چھیننے کی کوشش نہیں کی مگر سہاگ

رات میں اس نے ثمر سے صاف کہا تھا۔

”صرف ایک بات کہنا چاہوں گا۔ میرا اور آپ کا رشتہ خالہ اماں نے چلے کیا ہے۔

میرا سر ہمیشہ ان کے سامنے ان احسانات کی وجہ سے جھکا رہے گا، جو انہوں نے میری ماں اور مجھ

پر کیے ہیں۔ مجھے شاہ سائیں کی دستار کی عزت اپنی جان سے بھی پیاری ہے۔ آپ کو کبھی بھی مجھ

سے شکایت نہیں ہوگی۔ میں آپ کے تمام حقوق بھی پورے کروں گا۔ آپ کو کبھی بھی میری زندگی

میں کوئی عورت نظر نہیں آئے گی مگر کبھی اس دل میں جھانکنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ ورنہ میری

اذیتوں میں برابر کی حصہ دار بن جائیں گی“

شادی کی پہلی رات وہ اپنے شوہر کے منہ سے جو کچھ سن چکی تھی۔ اس پر اگلی بہت سی

راتیں جاگتا اور صرف سوچنا ہی تو تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ مہمند عباس کے خوابوں کا محور کوئی

اور تھا۔ اس کے دل پر کسی اور کی حکومت تھی آخر تھی وہ کون؟ کچھ کھوجنے اور جاننے کی جستجو نے

اسے بے چین کر دیا تھا۔

اس نے مہمند پر کڑی نگاہ رکھنا شروع کر دی وہ اس کے معمولات کا بغور جائزہ لیتی

رہی اور پھر ایک رات اس نے مرجان بی بی کی کچھ باتیں چپکے سے سن لیں مرجان کی اور سے

نہیں خود سے مخاطب تھی وہ بھی ایک طرف محبت کی کچھ اذیتیں سوغات میں لیے بیٹھی تھی۔

ثمر جہاں کو خیال گزرا کہ شاید مہمند، مرجان بی بی کی محبت میں مبتلا ہے۔ اس کے اندر

حسد کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ وہ بہت رشک کے عالم میں مرجان بی بی کے حسین نوخیز حسن کو

دیکھ رہی تھی۔ اس کے سیاہ بال پوری پشت پر آشبار کی مانند بکھرے تھے۔

☆☆☆

مومن پیدا ہوا..... حویلی میں ایک جشن کا سماں تھا۔ اس دن مرجان بی بی بھی بہت خوش تھی اس کے ترشے گلابی ہونٹ مومن کے رخساروں کو چوم رہے تھے وہ مومن ہے بے تحاشا پیار کرتی تھی شرم جہاں نے اسے دیکھا تو جھپٹ کر مومن کو اس کی گود سے لے لیا۔

”آپا! میں آپ کی ان حرکتوں کا پس منظر جانتا ہوں“

”جانتی ہو تو اپنا منہ دھو لے کر یہاں سے دفع کیوں نہیں ہو جاتیں“ شرم کا لہجہ زہر آلود تھا۔

”آپ کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا“ مرجان نے تمسخر نہ لگا ہوں سے اسے دیکھا۔

”کم از کم میں اس جلاپے کی اذیت سے نجات پاؤں گی“

”آپ کبھی بھی اس اذیت سے چھکارا نہیں پاسکیں گی“ مرجان نے سابقہ لہجے میں کہا تھا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو“ شرم بلند آواز میں چلائی۔

”کیوں خود کو مزید پریشان کرتی ہیں آپا! کیا آپ کے اطمینان کے لیے یہ کافی نہیں کہ جسے آپ نے چاہا اسے پالیا۔ جس سے محبت کی، وہ آپ کا ہم سفر ہے۔ آپ اس کے بیٹے کی ماں ہیں۔ آپ کی خوشی اور سکون کے لیے تو بس اتنا ہی کافی ہونا چاہئے“ مرجان نے نرمی اور تحمل سے کہا۔

”جس بھنی میں جل رہی ہوں میں..... اس اذیت کا اندازہ تم کیسے کر سکتی ہو؟“

”اگر وہ مجھے بن مانگے مل جاتا تو میں تمام عمر شکرانے کے نفل ادا کرتی۔ میرے اطمینان کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہونا تھا چاہے اس کے دل میں کسی اور کی صورت ہی کیوں نہ سخی ہوتی“ مرجان نے اس کے شانے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر چٹائی سے کہا تھا۔

”اتنی قناعت اور صبر میں کہاں سے لاؤں“ شرم بے بسی سے بولی۔

”آپ جو کچھ سمجھ رہی ہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے“ مرجان نے بال سیٹے اور دورانق پر ڈوبتے سورج کو دیکھ کر یاسیت سے بولی۔

”صاف صاف بات کرو“

”کمال ہے آپا! آپ ان کی خلوتوں کی ساتھی ہو کر انہیں جان نہیں سکیں۔ ان کے دل

میں جھانک نہیں سکیں۔ ان کی آنکھ میں کس کا عکس ہے۔ آپ کو اتنے سالوں بعد بھی پتا نہیں چلا“ مرجان کی آواز میں تاسف تھا اور وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی۔

”مہمند عباس، ام نذیب کی محبت میں گرفتار ہیں آپا“

شرم جہاں کو لگا تھا کہ پوری حویلی آن کی آن میں اس کے اوپر آگری ہے۔

☆☆☆

یہ جون کے آخری ہفتے کی بات تھی۔ صبح صبح حویلی میں صہیر کا پیغام پہنچ گیا تھا کہ گاؤں کی حدود کے اختتام پر کوئی اسے لینے آجائے۔ ڈرائیور چھٹی پر تھا۔ مہمند پیغام ملتے ہی جیب لے کر مطلوبہ جگہ پہنچ گیا تھا۔ گرمیوں کی شدید ترین دوپہریں تھیں۔ پرندے تک گھونسلوں میں چھپے اگکھ رہے تھے صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی تھی مگر صہیر کا نام و نشان نہیں تھا۔ جب رات کے سائے پھیلنے شروع ہوئے تو مہمند نے بھناتے ہوئے واپسی کا قصد کیا۔ اسی پل ایک گاڑی فرارٹے بھرتی اس کے قریب سے گزری تھی۔ تھوڑا سا آگے جا کر گاڑی ڈرائیو کرنے والے نے مرمر میں سے دیکھا تھا اور پھر گاڑی دو سیکنڈ میں بیک ہو کر مہمند کے قریب آ کر۔

”کیوں بھی کون سی ڈیوٹی بھگت رہے ہو۔ شاہوں کی چاکری سے فرصت مل جائے تو میری فیکٹری میں آ جانا بہت شاندار جاب مل جائے گی۔ خواخواہ اپنی ایم بی اے کی ڈگری زمینوں میں جھونک رہے ہو“ مقابل کی بادامی آنکھوں میں نفرت ہلکے لے رہی تھی، الفاظ شعلوں میں لپٹے تھے مہمند کا چہرہ احساس توہین سے سرخ ہو گیا۔

”میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں آپ کو بھی اپنی عزت کا پاس ہونا چاہئے“

مہمند لب بھینچ کر کھڑکی پر جھکا تو گویا پلکیں ساکت رہ گئیں۔

اردشیر کے برابر سیٹ پر ام نذیب بیٹھی تھی اس کا دل یکبارگی بہت زور سے دھڑکا، کچھ کہنے کے لیے لب پھڑ پھڑائے تھے۔ وہ تیزی سے پلٹا اور پھر جیب کی طرف بڑھ گیا۔ اپنی کم مائیگی کا احساس روح کو رگید رہا تھا اس لیے جب گل خان زمین کا کوئی مسئلہ لے کر آیا تو مہمند نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا وہ منہ بنا تا پلٹ گیا۔

”یہ زمینیں صہیر کی، جائیدادیں صہیر کی، حویلی صہیر کی، عزت بھی اسی کی، میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ عزت بھی نہیں میں کیوں خود کو خرچ کر رہا ہوں تنفر سے سوچتے ہوئے وہ اٹھا اور حویلی کی طرف چل دیا۔ ٹریا جہاں شاید اس کی منتظر تھیں۔ اسے اندر آتا دیکھ کر فوراً الپک کر آئیں۔

”میرے بچے! تھک گئے ہو“ اس کے سرخ چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ محبت سے گویا ہوئیں۔ مہمند بغیر کے میز ہیاں چڑ گیا تھا۔

پھر اس کے مزاج میں آہستہ آہستہ تبدیلی نظر آنے لگی۔ وہ چڑچڑا اور بد مزاج ہوتا جا رہا تھا شاہ سائیں اگر زمینوں کے متعلق کوئی مشورہ دیتے تو وہ بغیر سنے بے زاری سے اٹھ جاتا۔

البتہ شمر کے ساتھ اس کے رویے میں تبدیلی نہیں آئی تھی وہ شمر سے پہلے کی طرح ہی بات چیت کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی مومن کو اٹھا کر جی بھر کے پیار کرتا۔ شاید اس لیے بھی کہ مومن میں صرف اسی کی شاہت تھی۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا شمر پہلے سے زیادہ تنگ مزاج اور غصیلی ہوتی جا رہی تھی۔ بات بے بات مہمند سے الجھ پڑتی۔ اسے اپنی بڑھتی عمر کا بھی احساس تھا۔ اس رات بھی ایک معمولی سی بات پر وہ مہمند سے الجھ پڑی تھی بات اتنی بڑھی کہ مہمند غصے کے عالم میں کمرے سے باہر نکلنے لگا۔

”تم تو مجھ سے جان چھڑانے کے بہانے ڈھونڈتے ہو“ وہ غصے سے پھنکاری۔  
”کس کے حسن نے تمہیں دیوانہ کر رکھا ہے“ اس کا لفظ لفظ گویا تیزاب میں ڈوبا تھا مہمند رک گیا اور اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ شمر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”کیوں خود کو جلا رہی ہو ان دیکھی آگ میں شمر! میں نے تو کبھی کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ کبھی تمہارے حق کو کسی اور پر نہیں لٹایا“

”سب جانتی ہوں میں بزدل انسان جسے چاہتے تھے اس کا نام کیوں نہیں زبان پر لا سکے“ شمر گویا پھٹ پڑی۔

”میں تم سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا“ مہمند کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔  
”تم کیا سمجھتے تھے میں کبھی بھی جان نہیں سکوں گی“

”اگر تم جان ہی چکی ہو تو اب ہنگامہ کرنے کا بھلا کیا مقصد ہے؟“ مہمند کب تک برداشت کرتا۔ اب تو اس کا ضبط کا پیانا لبریز ہو چکا تھا۔

”تم نے مجھ سے جائیداد کی خاطر شادی کی ہے۔ تم مرد تھے انکار بھی کر سکتے تھے“  
شمر چلائی۔

”بات کو مت بڑھاؤ شمر!“ وہ ایک مرتبہ پھر بڑے ضبط سے بولا

”میری بات کا جواب دو“

”تمہاری فضول اور بے سرو پا باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں“ وہ چمک کے دوسری طرف آکر لیٹ گیا تھا۔

”یہ کہو کہ تمہارے پاس سرے سے کوئی جواب ہے ہی نہیں“ شمر نے تنک کر کہا۔

”میں نے تم سے شادی جائیداد کی خاطر نہیں خالہ اماں کے احسانات کے بوجھ کو اتارنے کے لیے کی ہے ہمت اور حوصلہ ہے سچ سننے کا تو سنو تمہاری بڑھتی عمر کی وجہ سے خالہ اماں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں اور اب تم نہیں صرف اور صرف تمہارا احساس کمتری بول رہا ہے بدگمانیوں کی اس دھند کو ارد گرد سے ہٹا لو شمر! ورنہ اپنا نقصان کر بیٹھو گی“ اس نے بازو آنکھوں پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

”میں تمہارے سارے کرتوت جان گئی ہوں۔ تم نے گھانے کا سودا نہیں کیا۔ ہر شے میں برابر کے حصے دار بنے ہو“

وہ گویا اپنے حواس کھونے لگی تھی حسد کی آگ نے اسے جلا کر رکھ بنا دیا تھا مہمند چپکے سے بستر سے اٹھا اور دبے قدموں سے باہر نکلتا چلا گیا جبکہ شمر اب اور زور زور سے چلانے لگی تھی۔

☆☆☆

وہ ارد شیر کی خوشگوار زندگی کے بارے میں کسی سے بھی سستی تو نجانے کیوں زیاں کا احساس بڑھنے لگتا۔ اس نے واقعی خسارے کا سودا کیا تھا نہ وہ مہمند کی بن سکی تھی نہ مہمند کو اپنا بنا سکی تھی۔ نہ اسے چاہنے کا ڈھنگ آیا تھا نہ چاہت لینے کا سلیقہ آیا۔ فیضہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھی۔  
”کیوں خود کو تھکا رہی ہیں شمر آپا“

”فیضہ! کیا کروں چھاؤں کا طلب میرا دھوپ ہاتھ میں لے لی ہے“ ان دنوں وہ بہت پریشان سی پوری حویلی میں بولائی بولائی پھرتی تھی۔ نجانے ثریا جہاں کو بیٹی کی آنکھوں میں پھنستی ریت نظر کیوں نہیں آتی تھی اور ادھر مرجان بی بی تاسف سے کہتی۔

”شمر آپا! تم کبھی بھی مطمئن ہونے والے لوگوں میں سے نہیں ہو تمہیں تو اسی پر قناعت کر لینی چاہئے کہ مہمند عباس، خدا نے تمہارے نصیب میں لکھ دیا ہے۔

”مگر مجھے لگتا ہے میں بہت بد نصیب عورت ہوں کبھی کبھی ارد شیر کی بادامی آنکھوں کے شکوے نجانے کیوں نیند سے جگا ڈالتے ہیں اور وہ کتنا اعلا ظرف مرد ہے جس نے آج تک

اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا کہ انکار میری طرف سے ہوا تھا۔ اب وہ دل کی باتیں مرجان کے ساتھ شیئر کرنے لگی تھی۔

”جو ہو چکا اسے بھول جاؤ اپنے بچے اور شوہر کی طرف توجہ دو خسارے گننے بیٹھو گی تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“ مرجان بی بی نرمی سے اس کے ہاتھ دباتی۔

”کبھی کبھی سوچتی ہوں ارد شیر جیسا مرد میرے انکار پر خاموش کیسے ہو گیا۔ وہ بولے تو درود یو ارلز نے لگتے ہیں آخر اس نے اپنی توہین پر خاموشی کیوں اختیار کر لی تھی۔“

”شمر کھوئے کھوئے لہجے میں ماضی کی راکھ کریدنے کی کوشش کرتی۔  
”آپا! تعلیم انسان کو شعور بخشتی ہے وہ پڑے لکھے انسان تھے سمجھ گئے ہوں گے کہ آپ کی محبت کا مرکز کوئی اور ہے۔“

”اسی بات کا تو صدمہ ہے وہ میرے بارے میں نجانے کیا سوچتا ہوگا۔“ وہ بے قراری سے کہتی۔

”آپا! اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے؟“ مرجان اسے سمجھانے کی کوشش کرتی۔ مگر اس کے بچھتاؤ ختم نہ ہوتے۔

☆☆☆

پورا احمد آباد جانتا تھا کہ ارد شیر اور مہمند عباس کی کبھی آپس میں نہیں بنی۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے خار کھاتے ہیں ارد شیر کی نفرت تو سمجھ میں آتی تھی۔ مہمند عباس کی وجہ سے اس کے خاندان کی لڑکی نے اس کے وجود کی نفی کی تھی۔ اسے ٹھکرا دیا تھا کسی بھی مرد کے لیے ایک عورت کا ٹھکرا دینا باعث اذیت ہی نہیں غیرت پر تازیانہ ہوتا ہے پھر ارد شیر جیسا مرد جس کے لیے ملے جیسی لڑکی نے اپنا خاندان تک چھوڑ دیا تھا۔

ارد شیر کے لیے شمر جہاں کا انکار ایسا نیزہ تھا، جو اس کی غیرت پر سیدھا جا لگا تھا۔ مگر وہ بہت زیرک اور معاملہ فہم مرد تھا۔ اپنے خاندان کی عزت کو اچھالنا یا پھر شاہوں کی بیٹی کی اس جرات اور بے باکی کا اعلان خود اس کی اپنی توہین بھی تھی اس میں اس نے شمر جہاں کو ہی نہیں خود کو بھی ذلتوں کے عذاب سے بچالیا تھا مگر دونوں حویلیوں میں گویا بھونچال آ گیا۔

وہ نہ صرف اپنے باپ بلکہ تایا کی نظروں سے بھی گر چکا تھا۔ وہ جب جب گئے وقتوں کی اذیتوں کو یاد کرتا مہمند سے اس کی نفرت میں مزید اضافہ ہوتا اسے گویا یقین تھا کہ مہمند عباس

نے محض شمر جہاں کے حصے کی جائیداد بٹھیلانے کی خاطر اس سے شادی کی ہے سو وہ ارد شیر کے نزدیک ایک لالچی انسان تھا۔

ان دنوں شمر جہاں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اسی لیے مرجان بی بی ہی مومن کو سنبھال رہی تھی مہمند کے کھانے پینے اور آنے جانے کے متعلق بھی سارے حساب اسی کے پاس تھے وہ صبح اٹھ کر مہمند کا لباس استری کر کے لٹکا دیتی اور جوتے بھی چمکتے ہوتے۔ مومن کو بھی نہ ہلا دھلا کرتی کر دیتی۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ مہمند کی سوچوں پر کون قابض ہے یا فی الحال وہ شمر جہاں کی ملکیت میں ہے۔ وہ اپنا محبوب سمجھ کر اسے چاہتی رہی تھی اور مومن پھر اس کے مہمند کا اکلوتا فرزند تھا سو مومن کو مرجان بی بی کی طرف سے بہت سی محبتیں ملی تھیں۔ مرجان بی بی کو شمر سے بھی انسیت تھی کبھی کبھی شمر کے آنسو اسے پہروں رلانے کا سبب بنتے تھے البتہ وہ فیضہ سے بہت خار کھاتی تھی شاید اس لیے بھی کہ ان کا تعلق بڑی حویلی سے تھا۔

شمر کو مہر ماہ کی پیدائش سے پہلے ہی اختلاج قلب کے علاوہ گھٹیا کا درج چٹ گیا تھا ان دنوں مرجان بی بی نے سچ مچ حویلی میں رہنے اور یہاں کا رزق کھانے کا حق ادا کر دیا تھا اس نے شمر کی بے انتہا خدمت کی تھی درد اور بے چینی کی وجہ سے تمام رات شمر جاگتی رہتی تھی اور تڑپتی رہتی مرجان بی بی پوری رات شمر کے پاس رہتی کبھی اس کا سر دباتی اور کبھی پیر۔ شمر کی بیماری کے دوران وہ گھن چکر بنی رہی تھی ادھر حویلی میں ہر وقت مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا فیضہ کو باورچی خانے سے اک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اور پھر چھوٹی بچیوں کی دیکھ بھال گھر کے دیگر کاموں کی وجہ سے وہ اپنی تائی اور شمر کے قریب نہیں آ سکتی تھی، جبکہ مرجان بی بی اس کی تائی کے دل میں بھی اپنا مقام بنا چکی تھی۔

آج صبح سے پھر شمر کی صحت خراب تھی۔ ڈاکٹر دومرتبہ آ کر چیک اپ کر کے گئی تھی مگر شمر کی بے چینی پہلے سے بھی بڑھ رہی تھی وہ اک پل کے لیے بھی مرجان کو اپنے پاس سے اٹھنے نہیں دے رہی تھی۔

پھر نجانے کیا ہوا کہ شمر ایک دم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کافی دیر رونے کے بعد اس نے اپنا آنسوؤں سے دھلا چہرہ اٹھا کر مرجان بی بی کی طرف دیکھا اور بولی۔

”سات سالوں کی بے سکونی اب ختم ہونے کے قریب ہے مجھے افسوس رہے گا کہ میں نے کچھ غلط فیصلوں میں اپنے لیے خود صحرا خرید لیا ہے میں نہیں جانتی کل کا سورج کیا پیغام



لاتا ہے بس اتنی سی میری درخواست ہے کہ میرے بچوں کو اپنے سینے سے لگا لینا مرجان! انہیں ممتا کی وہی گرمی مہیا کرنا جو میں چاہ کر بھی نہیں دے سکی ہوں میں اپنے مومن اور اس نئے آنے والے کو تمہاری آغوش میں دیتی ہوں۔

”آپا! اللہ کے واسطے خود کو سنبھالیے اللہ آپ کو لمبی عمر عطا کرے۔ آپ خود اپنے بچوں کی ساری خوشیاں ساری خواہشیں پوری کریں“ مرجان نے ثمر جہاں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر چوما۔

”مجھے لمبی عمر کی بددعا تو نہ دو“ وہ اپنے ایک تواتر سے بہتے آنسو پونچھ رہی تھی۔

”آپ اس قدر مایوس کیوں ہیں“

”میرے اندر جینے کی تمنا ختم ہو گئی ہے“ ثمر نے نیکی کی پشت سے سر نکایا اور بے آواز رونے لگی۔

”آپا! میں مہمند سائیں کو بلا لاتی ہوں وہ ہی آپ کو تسلی دیں گے“ مرجان اس کے زرد چہرے میں کھنڈی زردیوں کو دیکھ کر پریشان ہو اٹھی۔

”رہنے دو مرجان! بس تم میرے پاس بیٹھی رہو“ ثمر نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

”آپا! آج صبحیر، مومن کا یکن ہاؤس میں ایڈمیشن کروا آیا ہے“ مرجان نے اس کا دھیان ہٹانا چاہا۔

”ہوں..... جانتی ہوں“

اس پل دروازہ چرہ کی آواز سے کھلا اور پھر اندر آنے والے کو دیکھ کر مرجان سر پر چادر درست کرتی اٹھ گئی۔

”کیسی طبیعت ہے؟“ مہمند بھاری آرام دہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہوں“

”میرا دل گھبرا رہا تھا، سوچا تمہیں ایک نظر دیکھ آؤں“

”بہت شکریہ“ ثمر نے بھاری آواز میں کہا۔

”تمہیں مجھ سے بہت شکایتیں ہیں۔ حالانکہ میں نے کبھی تمہیں دانستہ دکھ دینے کی

کوشش نہیں کی“ مہمند نے دھیمی آواز میں کہتے ہوئے اس کے ماتھے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھا۔ ثمر کو لگا

تھا گویا جلتے سلگتے دل پر سادوں کی بوندیں گرنے لگی ہیں۔ وہ دھیرے دھیرے آنکھیں موند رہی تھی۔ دور مسجد میں فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ صبح صادق کا وقت تھا ابھی پونچھنے میں بہت وقت درکار تھا ایک ایک آسمان بادلوں سے ڈھک گیا تھا اور ایک تواتر سے آسمان سے بارش برسنے لگی۔

ثمر جہاں نے ایک کمزور سی بچی کو جنم دے کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ حویلی میں ایک مرتبہ پھر صف ماتھ بچھ گئی۔ ہر آنکھ غم تھی۔

نصفی مہر ماہ کا کسی کو ہوش ہی کہاں تھا۔ نجانے کس وقت مرجان کو خیال آیا تو وہ تقریباً بھاگتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھی۔ بچی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی بھوک کی وجہ سے بلک رہی تھی۔ مرجان نے اسے گود میں اٹھایا اور دودھ لینے کی غرض سے پکن کی طرف بڑھ گئی۔

آہستہ آہستہ زخم سلنے لگے تھے ثمر جہاں کی پہلی برسی کے بعد شاہ سائیں نے مہمند کا نکاح مرجان سے کر دیا تھا اور مرجان نے ان دو بچوں کی خاطر اپنے اندر کے ہر احساس کو مٹا ڈالا تھا۔ ان ہی دنوں بہت سالوں بعد پہلی مرتبہ ثریا جہاں بڑی حویلی میں نینب اور صبحیر کے رشتے کی بات کرنے اور تاریخ طے کرنے لگی تھیں۔

شادی کی ڈیٹ کیا فکس ہوئی دونوں حویلیوں میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ غم سے نڈھال ان دو خاندانوں نے اپنے اپنے گھر کی ان آخری خوشیوں کو بھر پور انداز میں منانے کے بارے میں سوچا تھا۔

مرجان ڈرائیور کے ہمراہ مومن کو سکول سے لینے گئی تھی۔ فیضہ اور نینب بھی ان کے ہمراہ شہر گئی تھی۔ شاپنگ کی غرض سے دونوں طرف شادی کی زور و شور سے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ صبحیر ان دنوں بہت کم کم گھر میں آتا تھا وہ بہت خاموش رہنے لگا تھا حالانکہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے والی تھی۔

شادی سے دو تین دن پہلے نینب نے حویلی میں فیضہ سے بات کرنے کی غرض سے فون کیا مرجان بی بی اور فیضہ ان دنوں گھن چکر بنی ہوئی تھیں آج بھی وہ دونوں شہر روانہ ہو چکی تھیں نینب بابا رفون کر رہی تھی مگر دوسری طرف بڑی کی ٹون سنائی دیتی۔ تنگ آ کر فون رکھنے ہی والی تھی، جب صبحیر کی آواز ایئر پیس میں سے ابھری۔

”ادی فیضہ سے بات ہو سکتی ہے“ نینب نے نچلا لب دانٹوں تلے دبا کر شرارت سے کہا۔

”ادی فیضہ کے علاوہ کسی سے بات نہیں کر سکتے“

نہنہ کو محسوس ہوا تھا کہ صبحیر کی آواز بھاری بھاری سی ہے۔

”ادی کے دیور کے علاوہ سب سے بات کر سکتی ہوں“ وہ کھلکھلائی۔

”تو پھر آج جی بھر کے باتیں کر لو“

”کیوں تم کہیں پر دیس جانے والے ہو؟“ نہنہ نے شرارت سے پوچھا۔

”شاید.....“ وہ ہنکار سا بھر کے خاموش ہو گیا تھا۔

”مجھے ساتھ لے کر نہیں جاؤ گے؟“

”تمہیں تو عالم بالا میں بھی ساتھ لے جاؤں گا“ وہ غیر سنجیدہ نہیں تھا۔ نہنہ اس کے

لہجے کے اتار چڑھاؤ کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔ ویسے بھی ملن کے دن قریب تھے اور ان کے انگ انگ سے سرشاری کی لہریں پھوٹ رہی تھیں۔

”کیوں اکٹھے مرنے کا ارادہ ہے“ نہنہ نے مسکراہٹ روک کر پوچھا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ بعض گھڑیاں قبولیت کی ہوتی ہیں۔

”ہم ہی مون کیا پیراڈائز میں منائیں گے“ وہ معصومیت سے بولی۔

”آج چار بجے جھیل پر جاؤں گا کیا تم آؤ گی“ صبحیر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاں، آجاؤں گی“ نہنہ نے فوراً ہی ہامی بھر لی۔

”ٹھیک ہے میں تمہارا انتظار کروں گا“ صبحیر نے فون رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں

گہری سوچ کی پرچھائیں تھیں۔ وہ چار بجے سے کچھ پہلے ہی نکل آیا تھا۔ جھیل کنارے ایک قطار میں لگے بڑے درخت کس قدر اداس لگ رہے تھے۔ ناریل اور شہتوت کے درختوں سے گویا ابو ٹپک رہا تھا۔ رات کی رانی، سورج کبھی کو منہ موڑتا دیکھ کر کرلانا لگی تھی اور پھر صبحیر نے دیکھا کہ اس کا پھول پھول مر جھا کر شاخوں سے گر رہا ہے۔

جھیل کی دائیں جانب سیاہ چادر میں اپنی نہنہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اوپر آرہی تھی۔ صبحیر کے قدم اسی طرف اٹھنے لگے۔ اسے یوں لگ رہا تھا نہنہ نے اپنے گرد سیاہ چادر کو نہیں سیاہ رات کو لپیٹ رکھا ہے یہ رات صبحیر اور نہنہ کی خوشیوں کو نگلنے والی تھی۔

”صبحیر! تم وقت کی پابندی کب سے کرنے لگے ہو“ نہنہ نے قریب آتے ہوئے

چھوٹی سانسوں سے کہا۔

”آغا سائیں سے پوچھ کر آئی ہو؟“

”نہیں، ملیہ بھی کو بتایا ہے“

”یہ لوگ ابھی گئے نہیں“ صبحیر نیلے آسمان پر تیرتے بادلوں کو دیکھ کر بول رہا تھا۔

”میرام اور محبت تو بورڈنگ میں ہیں اور بھابھی کا بچوں کے بغیر دل نہیں لگتا۔ اس

لیے زیادہ شہر میں ہی رہتی ہیں۔ اب تو خیر شادی کے سلسلے میں آئی ہیں“ وہ کچھ شرمائی شرمائی

سپہا دل میں اتر رہی تھی۔ صبحیر نے نگاہ چرائی۔

”میری ادی کو بھیج دو اب..... کچھ میکے والوں کا بھی ان پر حق بنتا ہے“ وہ مصنوعی خفگی

سے کہہ رہی تھی۔

”ان کے بغیر گھر کا نظام نہیں چل سکتا“

”کیوں مر جان بی بی کہاں ہے“ نہنہ نے تنک کر پوچھا۔

”مہر ماہ اسے کچھ کرنے ہی نہیں دیتی۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ بی بی ہر وقت

اسے اٹھائے رکھے“ صبحیر نے دھیرے سے بتاتے ہوئے نہنہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بہت پیار آ رہا ہے“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

”دل چاہ رہا ہے تمہیں دل میں اتار لوں۔ تمہاری چمکتی آنکھوں کو ستاروں سے بھر

دوں۔ میرا جی چاہتا ہے تمہارے رخساروں کی سرخیاں برقرار رہیں۔ میرا ساتھ ہو یا نہ ہو،

تمہارے بخت کا ستارہ ہمیشہ روشن رہے۔ یہ میں نے تمہارے لیے گلے کا بارخدا تھا۔ یہ پہن لو،

ہمیشہ میری یاد دلائے گا تمہیں“ صبحیر نے ایک مخملی ڈیبا جیب میں سے نکال کر نہنہ کے ہاتھ میں

تھما دی تھی۔ نہنہ جو گم صم کی کھڑی تھی ایک دم چونک سی گئی۔

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو صبحیر! یہ تحفہ تم دو دن بعد بھی تو مجھے دے سکتے ہو“

”آج میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔ میں نے کبھی

تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں نہیں سوچا“ وہ نہنہ کی بات سنی ان سنی کر کے بہت سنجیدگی

سے کہہ رہا تھا۔

”میں رہوں یا نہ رہوں تمہیں بہت خوش رہنا ہے ہمیشہ“

”تم نے مجھے یہاں اپنی فضول باتوں سے دہلانے کے لیے بلایا ہے“ ام نہنہ کی

آنکھیں نمکین پانیوں سے بھری آئیں۔

”میں چاہتا ہوں تمہاری آنکھ میں کبھی آنسو نہ آئے“ وہ زینب کے گال پر پھسلتا موتی اپنی انگلی کی پور میں سمیٹ کر بولا تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ شاد رہو“ صہیر نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا۔

”میں چاہتا ہوں کہ چند سال بعد تمہیں یاد بھی نہ رہے کہ تمہاری زندگی میں کبھی صہیر نام کا کوئی مرد تھا میں وہ ناسور ہوں جو ام زینب کی مسکان کو دیمک کی طرح چاٹ لوں گا اس کی آنکھوں کی روشنیوں کو نگل لوں گا“

صہیر اب زیر لب نجانے کیا کیا بڑا رہا تھا۔ زینب کا دل کہیں ہسپتال میں لمحہ بہ لمحہ گزر رہا تھا۔ وہ ساکت سی صہیر کی آنکھ میں اترتی نمی کو دیکھتی رہی۔

☆☆☆

جس طوفان کی آمد کا دھڑکا فیضہ کو پورے دل سے خوش نہیں ہونے دیتا تھا وہ طوفان پورے جلال کے ساتھ دونوں حویلیوں کو تہس نہس کر گیا۔

آج شام کو صہیر اور ام زینب کی مہندی کا فنکشن تھا دن بھر کس قدر مصروفیت رہی تھی۔ رات کو مرجان بی بی مہر ماہ کی ننھی کلائیوں میں چوڑیاں پہنا رہی تھی۔ اس نے خود کو بھی خوب سجایا تھا۔ ثریا جہاں نے اپنا روایتی لباس پہن کر فیضہ کے ہاتھ میں اپنے خاندانی کڑے تھما دیئے۔ اپنی دونوں پوتیوں کے گلے میں سونے کی زنجیریں ڈالیں۔ برقی قمقموں سے سج گھر کو بچے بہت اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ ڈھولک کی تھاپ دور دور تک سنائی دے رہی تھی کہ اچانک نجانے کہاں سے عجیب سا شور اٹھا۔

”ام زینب نے خودکشی کر لی ہے۔ ام زینب مر گئی ہے بسطین شاہ کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی نے خود کو اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا“

”کیا بکواس ہے؟“ فیضہ کی چلاتی آواز نے بچوں کو سہا ڈالا تھا اور ادھر مہمند عباس کے ہاتھ سے نوٹوں سے بھرے لفافے زمین پر گر گئے۔

”کہہ دو یہ جھوٹ ہے“ وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔ ان کے حواس کھونے لگے تھے۔ مہمند نے بڑے حوصلے اور ضبط کا مظاہرہ کر کے فیضہ کو دونوں کندھوں سے تھما۔

”مہمند! زینب مر گئی ہے“ ان کی سرگوشی نما آواز نے مہمند عباس کے دل کو زخم زخم کر دیا تھا۔ اردشیر کی بادامی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ اس نے طیش کے عالم میں پسٹل لوڈ کیا اور

روتی چلاتی عورتوں کی بھیڑ چیرتا باہر کی طرف نکلتا چلا گیا۔ اس کے کانوں میں بین کی آوازیں تھیں۔ عورتوں کی چیخ و پکار اور باپ کا غم کے بوجھ سے نڈھال چہرہ..... جھکی ہوئی کمر اور بوڑھی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں۔

اس کا رخ ڈیرے کی طرف تھا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق صہیر ڈیرے کی عالی شان عمارت میں موجود تھا اس تک زینب کی خودکشی کی خبر ابھی نہیں پہنچی تھی شاید ڈیرے کے ملازمین نے اردشیر کو وحشت کے عالم میں صہیر کے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس نے زوردار ٹھوکر سے کمرے کا دروازہ توڑ دیا تھا۔ گل خان اور خیر دین خوف سے تھر تھرانے لگے۔

”کیا کہا تھا تم نے زینب کو..... وہ تم سے ملنے کے لیے گئی تھی نا“ وہ بھوکے زخمی شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ صہیر اطمینان کے عالم میں کرسی پر جھولتا رہا۔ گویا اسے یقین تھا کہ اردشیر ضرور غصے سے بھناتا ہوا آئے گا۔

”بڑی جلدی آن پہنچے ہیں ارد لالہ! آپ میرے اندازے کے مطابق آپ کو سوا سات بجے آنا چاہئے تھا“

جواباً اس کا اطمینان قابل دید تھا۔ اردشیر کے اندر سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔

”بتا غیبت! کیا کہا ہے تو نے زینب سے“

”گالی مت دینا لالہ!“ اس نے انگلی اٹھا کر گویا وارننگ دی تھی۔

”اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہہ دو“ اردشیر نے پستول نکال کر صہیر کے دل کا نشانہ لے لیا تھا۔ صہیر برابر کرسی جھلاتا رہا۔

”بہت ذلت محسوس ہو رہی ہے نا! شادی کے کارڈ بٹ چکے ہیں اور میں نے بارات لانے سے انکار کر دیا ہے۔ ایسی ہی ذلت سے میری آپا بھی گزری تھیں۔ جب آپ نے انہیں دو خاندانوں کے سامنے رسوا کر دیا تھا۔ کسی عورت کو ٹھکرا دینے کی توہین اور ذلت کے عذاب اپنی بہن سے پوچھیے گا“ صہیر نے نفرت سے کہا تھا اور زمین پر تھوک دیا۔

اردشیر کو لگا تھا کہ وہ پورے قد سے زمین بوس ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے زینب کا زرد چہرہ اور تڑپتا ہوا وجود گھومنے لگا۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ اس کے سامنے ہی جھیل تک گئی تھی اور پھر واپس کیسے لڑکھڑاتے قدموں سے آئی۔

وہ لان میں بیٹھا تھا۔ زینب کو اتار دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

”کیا بات ہے زینب“ اس نے زینب کو روکنا چاہا تھا مگر وہ سنی ان سنی کر کے اندر کی طرف بھاگ گئی۔ اس نے دیکھا کہ زینب کا وجود جھٹکے کھارہا ہے۔ کسی انہونی کے احساس نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا اس کے پیچھے گیا۔

”زینو! کہاں جا رہی ہو؟“ اسے اپنے کمرے کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ سرعت سے اسے پکڑنے کی غرض سے زینب کے پیچھے لپکا۔ دوسرے ہی پل زینب کا بازو اس کے ہاتھ میں تھا۔

”کیا بات ہے گڑیا“ وہ پریشان سا پوچھنے لگا۔

”مت ہاتھ لگائیں مجھے۔ نفرت ہے مجھے آپ کے وجود سے“ زینب نے چلا کر کہا۔

”زینبی! پاگل ہو گئی ہو“ اردشیر نے خفت سے اسے ڈپٹا۔

”ہاں، پاگل ہو چکی ہوں..... آپ کے جرم کی سزا سن کر آرہی ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے نہ ماتم کرو نہ چیخوں نہ چلاؤں“

”میں کچھ سمجھانیں۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟“ اردشیر نے اسے غصے کے عالم میں جھنجھوڑ دیا۔

”صبر نے اپنی بہن کے ٹھکرائے جانے کا بدلہ مجھ سے لیا ہے۔ وہ کبھی بھی بارات نہیں لائے گا۔ وہ کبھی بھی آپ کی زینب کو بیاہنے نہیں آئے گا۔ دوسروں کی بیٹیوں پر ظلم ڈھاتے ہوئے کبھی اپنے آنگن کی طرف بھی دھیان دے لینا چاہئے۔ آپ کی وجہ سے شہر آپا کی زندگی دوزخ بنی رہی۔ وہ ایک بے جوڑ شادی کو نباہنے پر مجبور ہوئیں۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا، مگر مجھے بھی اس ہجر کی آگ میں جلنا ہے جس میں شہر آپا جلتی رہیں..... اور میں اس ذلت اور اس رسوائی کا سامنا نہیں کر سکتی۔

میں شہر آپا کی طرح بہادر نہیں ہوں۔ میں بہت بزدل ہوں لالہ! میں صبر کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وہ خود بھی اپنی لگائی آگ میں جلے گا اور مجھے بھی جلاتا رہے گا اور میں“

آنسوؤں کا گولا اس کے حلق میں پھنس چکا تھا۔ وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں طے کرنے لگی تھی۔ وہ اک پل کے لیے رکی اور پلٹی تھی۔

”آپ کی وجہ سے مہمند عباس کو اپنے گلے میں مجبوری کا طوق ڈالنا پڑا تھا، ورنہ وہ تو کسی اور کو چاہتا تھا“ وہ تنفر سے اردشیر کی طرف دیکھتی اپنے کمرے میں بند ہو چکی تھی اور وہ دروازہ پیٹ پیٹ کر ٹھٹھکے لگا۔

”زینب! دروازہ کھول دو، میں تمہیں سچا کی بتاتا ہوں“ اس کی آواز زینب تک پہنچتی بھی کیسے، وہ تو نیند کی گولیاں نگل چکی تھی ہمیشہ کے لیے سونے کی غرض سے اردشیر کو لگا تھا کہ اب کہ خسارے اسی کا نصیب ہیں۔

”میں نے تمہاری بہن کو نہیں بلکہ اس نے مجھے ٹھکرایا تھا۔ یہ تحریر تمہاری بہن کی ہے۔ ضرور پہچان لو گے۔ وہ اپنے سے نو سال چھوٹے کزن مہمند عباس کے عشق میں گرفتار تھی۔ میں نے صرف اپنی ہی نہیں تمہاری بہن کی عزت کو بھی اپنے انکار میں محفوظ کر لیا تھا۔ ورنہ شاہوں کی بیٹیوں کی داستانیں سر بازار ہر ایک کی زبان پر ہوتیں۔ تمہاری بہن نے شادی کی، اس کے بچے بھی ہوئے اور وہ عزت کی موت مری جبکہ میری ام زینب نے خودکشی کر لی ہے وہ تمہاری جدائی سے بہتر موت کو سمجھتی تھی سو اس نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لی ہیں۔ کل ہم نے اسے تمہارے ہمراہ سرخ لباس میں رخصت کرنا تھا۔ آج اسے سفید کفن پہنا کر رخصت کر دیا جائے گا۔ تم اپنی انا اور نام نہاد غیرت کی قبر پر فتح کے جھنڈے گاڑ لو“

اردشیر کے ہاتھ سے پستول گر چکا تھا۔ وہ ڈیرے کی طویل راہدار یوں سے گزرتا ہوا لرزتے قدموں سے شہر خوشاں کی طرف چلا گیا، جہاں ام زینب کو دفن کرنے کے انتظامات ہو رہے تھے۔

”زینب نے خودکشی کر لی“ صبر کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ وہ ایک دم بھاگتا ہوا باہر کی طرف لپکا اور پھر اس نے چیخ چیخ کر اردشیر کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔

”زینب نہیں مر سکتی لالہ! کہہ دیں یہ سب جھوٹ ہے“ اردشیر پلٹ آیا تھا اور اب صبر اسے جھنجھوڑتے ہوئے چلا رہا تھا۔ پھر صبر نے جھک کر زمین سے فل لوڈ پستول اٹھالیا۔

☆☆☆

ساری رات سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھتے گزر گئی تھی۔ اگلی صبح بہت سی اداسیاں سینے طوع ہوئی۔ نانا جان نے فیصلہ سنا دیا تھا پھر کس کی جرأت تھی کہ کوئی اختلاف کرتا۔ وسیع رقبے پر پھیلے دو باغات اور خاندانی قیمتی زیور میں سے مہر ماہ کا حصہ الگ کر دیا گیا۔ یہ ان کی خاندانی روایت تھی جو پشت با پشت سے چلی آرہی تھی۔ بیٹیوں کو ان کا حق بغیر کسی لڑائی جھگڑے یا تکرار کے نکاح کے وقت ہی دے دیا جاتا تھا۔

گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔ مہر ماہ نوٹ کر رہی تھی کہ مرجان بی بی

نہ جانے کس آنکھن میں ہیں۔ جس عورت نے انہیں ماں سے بھی بڑھ کر پیار دیا تھا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر لوریاں سنائی تھیں، اس سے محبت ایک فطری سی بات تھی اور اس کی زبان سے نکلے لفظ مہر ماہ کے لیے حکم کا درجہ رکھتے تھے۔ اسے بی بی سے بہت محبت تھی اس طرح مومن بھی انہیں بہت چاہتا تھا۔ اس کے بابا جان سے بہت سے اختلافات تھے مگر بی بی کے سامنے وہ کبھی اونچی آواز میں بھی نہیں بولے تھے۔

مہر ماہ جانتی تھی کہ بی بی بھی اس نئے رشتے کے حق میں نہیں تھی مگر نانا جان کے سامنے آواز بلند کرتا بھی کون؟ وہ شروع سے ہی بڑی حویلی والوں کے لیے دل میں کینہ رکھتی تھیں۔ مہر ماہ باغ میں بٹھلتی ہوئی اپنے پورشن کی طرف آگئی تھی۔ دس سال پہلے بابا جان نے حویلی کے دائیں جانب جدید طرز کا اپنا ذاتی پورشن تعمیر کروایا تھا۔

مہر ماہ نے لاؤنج میں قدم رکھا تو بی بی کی بلند آواز سن کر ٹھٹھکی گئی۔

”اپنی بیٹی کو سولی پر چڑھانے سے بہتر ہے اس کا خود اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ اردشیر کے بیٹے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ میری مہر و کسی خاندانی سازش کا شکار نہیں ہوگی“ بی بی تنہا ہی اس کا مقدمہ لڑ رہی تھیں۔

”آپ تو ہیں ہی بے حس۔ ساری زندگی بچی سے کبھی پیار کے دو بول نہیں بولے۔ کبھی شفقت سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ نہیں رکھا۔ کیا اس لیے کہ وہ شہر آبا کا پوتہ ہے۔ آپ کو اسے دیکھ کر اپنے نقصان یاد آنے لگتے ہیں۔ میں اپنی بچی کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی ہونے نہیں دوں گی شاہ سائیں کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا“ بی بی نے غصے کے عالم میں اپنی بات مکمل کی۔

”یہ شاہ سائیں کا نہیں بچپائیت کا فیصلہ ہے۔ اور بچپائیت کا فیصلہ ماننا میری مجبوری ہے۔ مجھے اپنی بیٹی سے کیوں نہیں محبت، بات صرف نکاح کی حد تک ہے۔ میں مہر و کو رخصت تو ہرگز نہیں کروں گا“

”آپ کہہ رہے ہیں کہ رخصتی نہیں کریں گے، جبکہ فیصلہ بھابھی تو رخصتی کا جوڑا بھی لے آئی ہیں“ بی بی کے لہجے میں پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔

”وہ میرا ہیڈک ہے“ وہ اخبار اٹھا کر اٹھ گئے تھے۔ اماں فیصلہ جبین کی تیاریاں خوب جوش و خروش سے کر رہی تھیں۔ خاندان بھر میں سب کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ سید عبدالوہاب شاہ کی نواسی کا بطنیں شاہ کے پوتے سے جمعہ کے مبارک دن نکاح ہے۔ جس نے بھی سنا گویا

دنگ رہ گیا۔ صلح کے ساتھ اس نئی رشتہ داری نے سب کے دلوں میں رشک اور حسد کے جذبات موجزن کر دیئے تھے۔

جس دن بڑی حویلی والے باقاعدہ تاریخ طے کرنے کے ساتھ شگون کے طور پر چھوٹی سی رسم کرنے کے لیے آئے اس دن بڑی حویلی والوں اور مومن کے دوستوں نے فضا میں فائرنگ کر کے بھرپور خوشی کا اظہار کیا۔

دبیز قالین پر بٹھلتے ہوئے مہر ماہ نے ان آوازوں کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ یہ تڑتڑاتی گولیاں فضا میں نہیں اس کے دل میں پیوست ہو رہی تھیں۔ اس نے پانیوں سے لبریز آنکھوں کو مسلا اور دوڑا نو قالین پر بیٹھ گیا۔

”تو کیا نانا جان نے صہیر ماما کے قاتلوں کو معاف کر دیا ہے یا پھر بھتیجی کی محبت غالب آگئی ہے۔“

بہت سے سوال ذہن کے درپچوں میں جھانک رہے تھے مگر پوچھنے کی ہمت حویلی کی عورتوں میں سے کسی کی نہیں تھی۔

پشیمین کہتی تھی کہ مجرم تو ہم ہیں۔ بڑی حویلی والوں کا نقصان تو زیادہ ہوا ہے۔ امت زینب خالدہ کی خودکشی، اردشیر ماما کا ایکسیڈنٹ اور اس ایکسیڈنٹ کا ذمہ دار اس کے بابا جان کو ٹھہرایا گیا تھا۔

پشیمین کے نزدیک اس کے انھیال والے تو بہت اعلیٰ ظرف تھے جنہوں نے صلح میں پہل کی تھی۔ پرانی دشمنی کو بھلا دیا۔

اور مہر ماہ عباس جانتی تھی کہ کون کتنے بڑے ظرف اور وسیع دل کا مالک ہے یہ صلح اچانک اٹھ آنے والی محبت اور اپنی غلطیوں کے احساس ہو جانے کے باعث نہیں ہوئی تھی۔ وجہ تو کچھ اور تھی جس سے سب ناواقف تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ مہمند عباس کس طوفان کی لپیٹ میں آنے والے ہیں۔ بڑی حویلی والوں نے بدلہ چکانے کا ایک الگ طریقہ سوچا تھا۔ اب کے وار کرنے والا کوئی اور تھا۔ جس کی آن بان اور وجاہت کے چرچے تھے۔ جس کی سحر طراز آنکھوں اور پر غرور مسکراہٹ کو دیکھ کر وہ کانپ اٹھی تھی۔ جو قول کا پکا اور وعدے کا سچا تھا۔ اور جس نے گھنے درختوں کے جھنڈ کے نیچے سبز پہاڑ سے اترنے والے ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے کے پاس کھڑے ہو کر نفیر بھری مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کہا تھا ”تم اگلے کچھ دنوں میں میرا شاہ کی خواب گاہ میں ہوگی“

”ہم اپنے دشمنوں کو دلیز کے پار نہیں اترنے دیتے۔ بڑے شاہوں نے نجانے کون کون سی خوش فہمیاں پال رکھی ہیں“ وہ میرام شاہ کے تکبرانہ جملے اور غرور پر جلیلا اٹھی۔

”تم میرے ارادوں کی چٹنگی کے متعلق جانتی نہیں ہو“ میرام شاہ جگر جگر کرتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”جو آپ چاہتے ہیں ایسا تو قیامت تک سوچے گا بھی نہیں“ وہ تنفر سے بولی۔

”ہم سوچنے میں وقت ضائع کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ ہم تو عمل کرتے ہیں“ میرام شاہ کے لبوں پر ایک دفعہ پھر سے مسکراہٹ چمکی۔

”بہت غرور ہے خود پر“

”نہیں، اسے اعتماد کہتے ہیں۔ آپ بہت غلط جج منٹ کرتی ہیں“ وہ بر جستہ بولا۔

”زیادہ اور اسمارٹ مت بنیئے۔ کہیں منہ کے بل گر نہ جائیے گا“ مہرماہ نے طنز یہ کہا ”ہم گریں گے اور آپ سنبھال لیں گی۔ اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہوگی“ وہ اس کے طنز کو شہد کا جام سمجھ کر پی گیا تھا۔

”کبھی بھول کر بھی ایسا ویسا مت سوچنا“ مہرماہ نے وارنٹک دینے والے انداز میں کہا۔

”میرام شاہ کی نگاہ میں جو ایک دفعہ اتر جائے، وہ ہمیشہ کے لیے مقید ہو جاتا ہے ایک بات ذہن نشین کر لینا مہرماہ عباس! تم پر میرے نام کی مہر لگ چکی ہے اور میں اپنی عزت کسی اور کے حوالے کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا ہمیں اپنی عزت اور غیرت جان سے بھی عزیز ہے“ وہ اسے بہت کچھ جتا چکا تھا ”آپ بھول رہے ہو شاہ! کہ کس سے مخاطب ہو“

”جانتا ہوں کہ تم مہمند عباس کی نور نظر ہو“ اس کے چہرے کا رنگ یک لخت بدل گیا تھا۔ آنکھیں خون چھلکانے لگیں۔ گلابی لب بھیج گئے تھے۔ مہرماہ کا سانس حلق میں ہی اٹک گیا تھا۔ اس کے خون آشام لہجے میں نجانے کیا بات تھی کہ مہرماہ کو زمان و مکاں بھول گئے۔ وہ اٹنے قدموں تقریباً بھاگتے ہوئے حویلی پہنچی تھی۔ اکھڑی سانسیں ہموار کرتے ہوئے وہ ابھی تک شاک کی کیفیت میں پٹنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بسطین شاہ کے گھر کے کسی فرد سے ہم کلام ہو کر آ رہی ہے۔

ٹھیک دو دن بعد بسطین شاہ کی طرف سے آنے والے صلح کے پیغام نے اس کے حواس معطل کر دیئے تھے۔ یہ صلح کا پیغام نہیں تھا بلکہ موت کا پروانہ تھا مہرماہ کے لیے۔ اسی راضی

نامے کی آڑ میں میرام شاہ کون سا بدلہ لینا چاہتا تھا کیا وہ بھول سکتا تھا اپنے باپ اور ماں کے خون سے لت پت بے جان جسموں کو۔ مہرماہ کے رشتے سے ایک تو اماں فیضہ کے میکے کے دروازے کھل جاتے اور دوسرے شاہ سائیں بڑی حویلی والوں کے احسانوں کے بوجھ سے زیر بار ہو جاتے۔ ایک تیرے دو شکار کرنا اسے ہی کہا جاتا ہے۔ وہ میرام شاہ کی حکمت عملی منصوبہ سازی، دوسرے معنوں میں عیاری اور مکاری کی دل سے قائل ہو گئی تھی۔ اس نے جو بھی منصوبہ بنایا تھا ابھی تک کامیاب جا رہا تھا۔

شاہ سائیں ان کی نیتوں سے ناواقف اپنا فیصلہ سنا چکے تھے حتیٰ کہ بابا جان کی سخت برہمی، ناراضی اور غصے کا بھی انہوں نے نوٹس نہیں لیا تھا۔ پہلی بار بابا جان اور شاہ سائیں کے درمیان اک سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس صبح بھی بابا جان اور شاہ سائیں کے درمیان ٹکرار ہونے لگی تھی شاہ سائیں اس موضوع پر سرے سے گفتگو کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ بابا جان کا چہرہ توہین کے احساس سے یک لخت سرخ ہو گیا۔ یہ یقین کامل تھا کہ بابا جان اسے جلتی بھی میں ہرگز نہیں جھونکیں گے۔

اس رات وہ بہت مطمئن سی مزے سے سوئی رہی تھی۔ اک طویل نیند نے اعصاب پر خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ اتنے دنوں کی بے چینی کا اثر بھی زائل ہونے لگا۔ بابا جان کی آمد کے ساتھ ہی تمام پریشانیاں اڑن چھو ہو گئیں وہ پچھلے دو روز سے فیکٹری کے لیے کچھ نئی مشینیں خریدنے کی غرض سے شہر گئے تھے۔

ان کی واپسی کے ساتھ ہی گھر کی فضا مکدر ہو گئی تھی۔ صبح ناشتے کی میز پر پھر سے بحث چھڑ گئی۔ بابا جان، شاہ سائیں کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ فیضہ کے چہرے پر ناگواری کے سائے بڑھتے چلے گئے۔

”مہرماہ خون بہا میں جائے گی۔ خون بہا میں دی جانے والی بیٹیوں کا تعلق میکے سے ختم کر دیا جاتا ہے۔ آپ نے ہر پہلو پر یقیناً سوچ رکھا ہے“ بابا جان نے غصیلے لہجے میں کہا۔ شاہ سائیں ایسے خاموش بیٹھے تھے، جیسے یہاں موجود ہی نہیں تھے۔

”مثبت ہو کر سوچو مہمند! ابا جان تمام کدورتیں اور رنجشیں بھلا کر اپنے بڑے بھائی کے پاس آئے تھے۔ انہوں نے بہت چاہ سے مہرماہ کو مانگا ہے تم بھی فراخ دلی کا ثبوت دو اور پھر میرام شاہ سے مہرماہ کی شادی تو ایک اعزاز ہے تم بھی تو میرام کی شخصیت سے اچھی طرح واقف ہو“

اماں فیضہ نے نہایت تحمل سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ان کے نرمی سے جتانے پر ہی اس رشتے سے انکاری تھے۔ وہ دوسرا در شیر تھا۔ ویسا ہی اکھڑا اور مغرور۔

”آپ تو یقیناً خوش ہیں۔ میکے والوں سے ملاقات کے بہانے مل جائیں گے“ ان کا تنفر لہجے سے عیاں تھا۔ زہر میں بجھے الفاظ سن کر شاہ سائیں گویا سنائے میں رہ گئے ان کے چہرے پر شدید برہمی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

”مہمند.....“ وہ سخت لہجے میں گویا ہوئے۔ کس لہجے میں بات کر رہے ہو فیضہ سے“ انہوں نے ناگواری سے ٹوکا۔

”تم بھی اچھی طرح سے جانتے ہو کہ یہ پنجائیت کا فیصلہ ہے، اگر تمہیں اپنی بیٹی سے محبت تھی تو تمہیں اسی وقت خود کو پیش کر دینا چاہئے تھا اور پھر تمہارے سبب خدشات بے بنیاد ہیں“ انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہتے ہوئے گفتگو کو سمیٹا بابا جان غصے کے عالم میں اٹھ کر باہر نکلنے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

ڈائنگ ہال خالی ہو چکا تھا شاہ سائیں اٹھے تو تقریباً سب ہی نے ان کی پیروی کی۔ مہماہ نے سر اٹھا کر دیکھا وسیع و عریض میز کے گرد کھلی کرسیاں خالی تھیں۔ مہماہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی اپنے کمر کی طرف چل دی۔ نانا جان کے حکم کے مطابق وہ آج کل گھر میں ہی مقید تھی۔ کالج جانے سے انہوں نے منع کر دیا تھا۔ پلنگ پر بکھری کتابوں کو اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھیں بھینکے لگیں۔ اسی پل دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ اس نے چہرہ صاف کر کے لاک کھولا۔ سامنے مرجان بی بی کھڑی تھیں۔ وہ انہیں راستہ دینے کی غرض سے سائیڈ پر ہوگی۔ انہوں نے بغور کمرے کی بے ترتیبی کو دیکھا اور پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

”پڑھ رہی تھیں؟“

”نہیں.....“ وہ مختصر بولی تھی پھر اٹھ کر بک ریک میں ترتیب سے کتابیں رکھنے لگی۔ ”تمہارے مستقبل کا فیصلہ ہو چکا ہے تم یقیناً باخبر ہو چکی ہو“ کمرے میں پھیلی گھمبیر خاموشی کو مرجان بی بی کی آواز نے توڑا۔ ان کے چہرے پر تفکرات کا جال سا بن گیا تھا۔ مہماہ نے بیسی پلکیں اٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا وہ کافی بے چین نظر آرہی تھی۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے بی بی!“

”ہوں.....“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔

”مومن لالہ کب آئیں گے؟“

”پتا نہیں، رات کو بات ہوئی تھی میری اس سے۔ آنے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا“ انہوں نے غائب دماغی سے جواب دیا۔

”بی بی! لالہ کی بھی یہی خواہش ہے وہ نانا جان کی فیصلے سے مطمئن ہیں اور انہیں خبر ہے کہ میں اور بابا جان رضامند نہیں“ مہماہ آہستگی سے بولی۔

”اسی لیے وہ تم سے اور مہمند سے خفا ہے۔ فون پر بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا“

”میں جانتی ہوں“ اس کی آنکھیں پھر سے لبالب بھر گئیں۔

”شاہ سائیں کچھ ٹھیک نہیں کر رہے۔ تمہارے بابا سخت پریشان ہیں۔ انہیں فیصلہ منظور نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں تم سے بات کمروں“ بی بی نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ کچھ حیران سی انہیں دیکھنے لگی۔

”کیسی بات؟“ مہماہ تعجب سے بولی۔

”یہی کہ تم انکار کر دو“ مرجان بی بی نے گویا اس کے سر پر ہم پھوڑا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

”انکار کر دو..... یعنی کہ بغاوت“ وہ خوف زدہ سی بڑبڑائی۔

”تمہارے بابا یہی چاہتے ہیں“ مرجان بی بی اس کے دونوں ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے سرگوشیاں بولی تھیں۔ مہماہ کو لگا تھا گویا حویلی کی چھت آن کی آن میں اس کے اوپر آگری ہے۔

”نانا جان کے سامنے سر اٹھاؤں“ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ بے یقینی سے بولی۔

”میں ایسا نہیں کر سکتی بی بی! اماں! کبھی نہیں“ سختی سے کہتے ہوئے وہ بے قراری سے کھڑی ہو گئی۔

”اماں! نانا جان میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ اور پھر اگر پنجائیت نے وعدہ نہ پورا کرنے کی صورت میں کوئی اور فیصلہ بابا جان کے لیے سنا دیا تو“ اس پہلو پر تو مرجان بی بی نے بھی نہیں سوچا تھا کچھ پل کے لیے وہ بالکل خاموش رہ گئیں۔ مہمند کو داؤ پر لگانا تو کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتی تھیں۔

☆☆☆

سیاہ آسمان کے وسط میں چمکتے چاند کو دیکھ کر اس نے کتنی ہی مرتبہ نانا جان کے بند

کمرے کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا مگر اس سے ایک قدم بھی نہیں چلا جا رہا تھا۔ وہ خود میں کیے ایسی ہمت پیدا کر لیتی، جو حلی کے درو یوار ہلا ذاتی۔

بی بی اماں نے جو اسے راہ دکھائی تھی، بظاہر وہ کٹھن لگتی تھی مگر آئندہ آنے والی زندگی کی کٹھنوں سے زیادہ مشکل نہیں تھی مگر وہ کیسے نانا جان کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت کرتی۔ بہت دیر سوچنے کے بعد اس نے پشینہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ خود کو مضبوط کرتی پشینہ کے کمرے میں چلی آئی۔

”اللہ کا شکر ہے کہ تم بھی حجرے سے باہر نکلی ہو۔ آج تو ہماری عید ہوگی ہے“ پشینہ اپنے برابر میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے طنزیہ بولی۔

”میں نے سوچا ہے کہ بوت کی طرح آنکھیں بند کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے۔“

”آپ اتنی بہادر کیسے ہو گئی ہیں؟“ پشینہ نے ایک مرتبہ پھر طنزیہ کہا، لگتا ہے بی بی نے اچھی طرح سمجھا بچا کر بھیجا ہے۔

”تم لوگ بی بی اماں سے اتنے بدگمان کیوں ہو؟“ مہرماہ نے ناگواری سے ٹوکا۔ ”نہیں، تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہم ان سے بدگمان نہیں ہیں۔ ایک لحاظ سے ان کے خدشات درست بھی ہیں۔ ان کی سوچ ایک ماں کی سوچ ہے، پشینہ نے فراخ دلی سے انہیں سراہا اور بولی ”بہر حال ان کی تم سے محبت پر شک نہیں کیا جاسکتا۔“

”اسی لیے میں نے ایک فیصلہ کیا ہے“ وہ بہت دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ”کون سا فیصلہ؟“ پشینہ چونکی۔

”میں نانا جان کے سامنے انکار کر دوں گی“ اس نے دل کڑا کر کے بالآخر کہہ ہی دیا۔

”کیا.....؟“ پشینہ کی آنکھیں حیرانی سے پھیل گئیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات بگڑنے لگے تھے۔

”تم پاگل ہو چکی ہو..... انکار کرو گی۔ دادا سائیں کے سامنے سر اٹھاؤ گی۔ تمہیں حویلی کی عزت اور وقار کا قطعاً احساس نہیں۔ اور پھر پچائیت نے اگر تمہارے بابا جان یا پھر مومن کوسر اسنادی۔ تم آخر کیا کرنا چاہتی ہو؟“ پشینہ کی آواز صدمے سے پھٹ سی گئی تھی۔

”خون بہا میں“ عورت“ یا پھر زمین ہی کیوں دی جاتی ہے اصل مجرم کوسر اسنادی

”مہرماہ بے خوف لیے بولی۔

”تو پھر اپنے بابا جان کو سراسنوادو“

”میرے بابا جان بے گناہ ہیں۔ اس حادثے کو خواہ مخواہ قتل کا نام دیا گیا ہے۔ میرے بابا کے دشمنوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہوگا“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا تھا اور مزید بولی۔

”بابا نے پچائیت کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ اس ایکسیڈنٹ میں ان کا عمل دخل نہیں۔ ارد شیر ماما کی گاڑی میرے بابا کی جیب سے نکل رہی تھی اور پھر لڑھکتی ہوئی کھائی میں گر گئی۔ مگر ان کی سچائی کو جھوٹ پر مبنی کہاوٹ سمجھا گیا تھا، کیونکہ ان دنوں ارد شیر ماما پر صہیر ماما کے قتل کا الزام تھا اور سب ہی جانتے تھے کہ بابا جان نے صہیر ماما کی نماز جنازہ پڑھنے کے بعد قسم کھائی تھی مگر وہ صہیر ماما کے قاتل کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں گے۔ جرگے نے اسی قسم کی بنا پر فیصلہ سنایا تھا ورنہ ثبوت تو کسی کے پاس نہیں تھا۔“

”بہر حال تمہارے بابا نے بھی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا تھا۔ اگر وہ سچائی پر ہوتے تو خون بہا میں اپنی بیٹی دینے کے فیصلے پر کبھی بھی ہامی نہ بھرتے“ پشینہ نے سفاک حقیقت بیان کی۔

”میں فیصلہ کر چکی ہوں“ مہرماہ نے مضبوطی سے کہا۔

”ایک اور بات پر بھی نظر ثانی فرمالیجے گا مہرماہ صاحبہ! کہ آپ کے انکار کو میرا مالہ اپنی انا کا مسئلہ بنالیں گے۔ بات پھر پچائیت تک جائے گی۔ بس سال پرانے قصے دہرائے جائیں گے۔ ام زینب خالہ کی خودکشی کے پیچھے کیا وجہ تھی۔ ایک دفعہ پھر شراہوں کی حویلی کی باتیں پچائیت اور جرگوں میں کی جائیں گی اس گھر کی بات کو چار دیواری میں ہی منٹ جانے دو۔ ورنہ سوائے رسوائی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

پشینہ تلخی سے کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ وہ زرد چہرے لیے پسینے سے شرابور ابھی تک سر جھکائے وہیں دوزانو بیٹھی تھی، جب پشینہ کارڈ لیس ہاتھ میں پکڑے پھر سے آگئی۔

”لو بات کرو مومن سے“ کارڈ لیس زبردستی اس کے ہاتھ میں تھامتے ہوئے اس نے انتہائی کٹیلی نگاہوں سے مہرماہ کو گھورا۔

”ہیلو.....“ اس نے ڈرتے ڈرتے دبی آواز میں ہیلو کہا تھا جو اب مومن آگ بگولا ہو کر چلا یا۔ وہ کافی دیر گرجتا رہا ہرستارہا۔ جب دل کی بھڑاس نکل گئی تو دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔



جب مومن خاموش ہوا تو غصے سے چلا اٹھی۔

”لالہ! میں مٹی کی مورت نہیں ہوں۔ میرے بھی کچھ خواب ہیں۔ کچھ خواہشات ہیں،“  
”حویلی میں پیدا ہونے والی عورتیں نہ خواہشیں پالتی ہیں، نہ خواب دیکھتی ہیں۔

ہمارے خاندان میں دور نزدیک کوئی بھی تمہارے جوڑ کا نہیں ہے۔ تم جانتی ہو خاندان سے باہر شاندی ہم اپنی تو بہن سمجھتے ہیں۔ نانا جان نے پشینہ کی منگنی میرے ساتھ کی تھی اور لغو نہ کا نام محبت کے ساتھ سنا جا رہا ہے اور اگر تمہاری شادی میرام سے نہ ہوئی تو پھر تازہ زندگی کے لیے اسی حویلی کے ایک کمرے میں رہنا پڑے گا تمہیں۔ اور اگر ہمارے بابا نہ ہوتے تو اماں کو بھی ارد شیر ماما کے ٹھکرائے جانے کے بعد اسی حویلی کے ایک کمرے میں بند رہنا تھا ہمیشہ کے لیے۔ یا پھر تمہارے ساتھ وہ ہی عمل دہرایا جائے گا۔ ابھی بھی وقت ہے سوچ لو، میں اور بھی بہت سی زندہ حقیقتیں تمہیں دکھنا چاہتا ہوں، بتانا چاہتا ہوں، مگر شاید ابھی تمہاری آنکھیں کھلنے کا وقت نہیں آیا۔“

وہ بول بول کر تھک چکا تھا اسی لیے اس نے بغیر خدا حافظ کہے فون رکھ دیا۔ وہ گم صم رہ گئی تھی۔ اس کے اندر قیامت کا سناٹا تھا۔ گویا اس پر سکتے ہی کی کیفیت طاری تھی۔ اس اذیت ناک خاموشی کو بڑی حویلی والوں کی آمد نے توڑا تھا۔

آج سے تین دن بعد اسے نانا جان کی حویلی چھوڑ کے جانا تھا۔ بی بی اماں نے کہا تھا کہ تم صرف نکاح کے لیے رضامندی دینا۔ باقی کا معاملہ وہ خود سنبھال لیں گی۔

☆☆☆

جمعہ کی شام پشینہ کے ہمراہ دو خوب صورت لڑکیاں ہاتھ میں بھاری بھاری سے شاپرز اٹھائے اندر چلی آئیں۔

”یہ موہیہ اور انیہ ہیں..... میرام لالہ کی بہنیں،“ پشینہ کے تعارف کروانے پر وہ دونوں لڑکیاں مسکراتے ہوئے اس کے قریب چلی آئی۔ وہ بہت تپاک سے اس سے ملی تھیں۔ کچھ دیر بعد نکاح کی رسم ادا کی گئی تھی۔ اس کے بعد نانا جان اس کے کمرے میں چلے آئے۔

”تم میری شرکی نشانی ہو مہر ماہ! میں ہمیشہ تمہیں خوش اور آباد دیکھنا چاہتا ہوں،“ انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ جبکہ مہر ماہ تو بابا جان کا انتظار کر رہی تھی۔ پشینہ نے اسے بتایا کہ وہ گھر میں موجود نہیں ہیں۔

”بابا جان کو اس وقت تو یہاں ہونا چاہئے تھا،“ اس نے اداسی سے سوچا تھا۔ کچھ دیر

بعد پھر سے موہیہ اور انیہ چلی آئیں۔

”چلیے بھابھی جان! آپ چنچ کر کے آئیں..... پھر ہم آپ کو میک اپ وغیرہ کرتے ہیں۔“

”اس سب کی کیا ضرورت ہے؟“ مہر ماہ نے کچھ پریشانی کے عالم میں کہا۔  
”کیوں بھی دوہن تو سرخ سوٹ پہن کر ہی لگیں گی آپ..... جاپے بھی یہ ڈریس زیب تن کر لیجیے،“ موہیہ نے کہا تو اندر آتی پشینہ نے زبردستی اسے واش روم کی طرف دھکیلا۔  
”بی بی اماں کہاں ہیں؟“ پشینہ نے آواز میں بولی۔

”وہ ادھر ہی ہیں انہوں نے کہاں جانا ہے تم ذرا جلدی چنچ کر کے آؤ،“ پشینہ نے ایک مرتبہ پھر اسے واش روم کی طرف دھکیلا۔ اسی پل دروازہ کھول کر فیضہ اندر چلی آئی تھیں۔ وہ لب بھینچ کر سر جھکائے واش روم کی طرف گئی۔

”موہیہ اور انیہ نے کچھ تصویریں بنانی ہیں۔ اسی لیے تمہیں تیار کرنا ہے“ وہ باہر آئی تو پشینہ نے گویا جتا کر کہا۔ انیہ میک اپ کا سامان کھولے بیٹھی تھی۔

وہ خاموشی سے انیہ کے سامنے بیٹھ گئی۔ موہیہ نے اس کی کلائیوں میں چوڑیاں اور گجرے پہنائے۔ پشینہ نے سر پر دوپٹہ سیٹ کیا۔ وہ آپس میں بہت بے تکلفی سے بات چیت کر رہی تھیں۔

”موہیہ! تمہاری چوڑیاں تو بہت اچھی ہے،“ پشینہ نے دوپٹے میں نہیں لگاتے ہوئے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا تو انیہ جھٹ سے بولی۔

”یہ خالص لالہ کی پسند سے آیا ہے۔ انہیں لہنگے اور گھیر والی فرائیں پسند نہیں ہیں۔ اسی لیے یہ سوٹ خریدا ہے“

”تم سے میری تعریف برداشت نہیں ہوئی،“ موہیہ نے انیہ کو آنکھیں دکھائیں۔ اب وہ دونوں سامان سمیٹ کر وسائی کے ہاتھ گاڑی میں رکھوانے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔

”یہ کیا تماشا ہے پشینہ!“ ان کے اٹھتے ہی وہ زچ ہو کر چلائی۔  
”خاموشی سے بیٹھی رہو۔“

پشینہ مسلسل بجتے فون کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ دوسری طرف شاید مومن لالہ تھے۔ پشینہ نے فون اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد وہ ابھی ابھی خدا حافظ

کہہ کر پٹنگ پر بیٹھی ہی تھی جب فیضہ بی بی اماں اور نانا سائیں اندر چلے آئے۔

اماں فیضہ کے ہاتھ میں قرآن پاک تھا جو انہوں نے نانا سائیں کے ہاتھ میں احترام سے تھما دیا۔ مہرماہ کے حواس معطل ہونے لگے تھے کسی انہونی کے خوف نے اسے لرز دیا تھا۔ اس کا دل خوف کی زیادتی کی وجہ سے پہلو میں کانپ رہا تھا۔ پھر نانا سائیں نے اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے کر نجانے کیا بات کی تھی اسے تو اپنی ساعتوں کے مفلوج ہونے کا خدشہ لاحق ہو گیا تھا وہ کچھ سن نہیں رہی تھی کچھ دیکھ نہیں رہی تھی اور نانا سائیں کے وجود سے اٹھتی محبت کی گرمی۔

وہ ان کے ساتھ گھنٹی جاری تھی اور وہ نجانے اسے کہاں لے کر جا رہے تھے پھر نجانے کس نے اس کا ہاتھ تھاما اور کس نے گاڑی میں بٹھایا..... اور گاڑی نجانے کون سی انجانی منزلوں کی طرف رواں دواں تھی..... اس کے ذہن میں صرف ایک ہی سوچ پھن پھلائے بیٹھی تھی۔ ”بابا جان اس وقت کہاں ہیں۔ کیا انہیں خبر نہیں کہ مہرماہ کو زندان میں قید کیا جانے لگا ہے۔ اسے زندہ درگور کرنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ اسے پچاسیٹ کے فیصلے کی سمیٹ چڑھا دیا گیا تھا“

☆☆☆

اسے سبطین شاہ کی حویلی میں نہیں لایا گیا تھا..... یہ ”ملیر لاج“ تھا گھر میں ہر طرف خاموشی کا راج..... موہیدہ اور انیہ نجانے کہاں چلی گئی تھیں اسے شنگ روم کے ایک صوفے پر بٹھا کر چھوٹے نانا دوسری گاڑی میں تھے اور یقیناً وہ بڑی حویلی میں چلے گئے تھے۔

ایک دم ہی خوف کی تیز لہر اس کے من میں اتری تھی۔ وہ سرعت سے صوفے پر سے اٹھی۔ گلال وندو سے باہر جھانکا، ہر طرف کالی رات نے پھن پھلائے ہوئی تھی۔ وہ خوف زدہ سی پیچھے ہٹی، اتنا بڑا گھر اور وہ بالکل ہی تنہا۔ اسے لگ رہا تھا خوف کے مارے ضرور ہارٹ فیمل ہو جائے گا، وہ تو کبھی آج تک تنہا کمرے میں نہیں سوئی تھی۔

شنگ روم سے باہر نکل کر وہ کوریڈور میں آئی..... کچن کے برابر بھی سیڑھیاں تھیں۔ ساتھ ایک اور آہوی دروازہ تھا۔ وہ پہلے سیڑھیاں چڑھ کے اوپر گئی۔ ہر کمرے میں جھانکا۔ ٹیرس کا دروازہ بھی بند تھا۔ اس کے دل کی رفتار بھی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ اسی خوف کے زیر اثر وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی۔ پھر کچھ سوچ کر کچن میں جھانکا۔ فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی مگر خوف کی وجہ سے پانی تک نہ پیا گیا۔ وہ بوتل اور گلاس کچن میں رکھ کر باہر نکل آئی تھی۔ ابھی وہ

دوبارہ شنگ روم میں جانے کا سوچ رہی تھی جب کچن کے برابر والے بیڈ روم سے کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ ماتھے پر آیا پسینہ پونچھ کر دل کڑا کیے اس نے دروازے کی ناب گھما کر جوں ہی دروازہ کھولنے کی کوشش کی ایک جھٹکے کے ساتھ خود بخود دروازہ کھٹکا چلا گیا۔

اس کے منہ سے برآمد ہونے والی چیخ بھی بے ساختہ تھی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”سک کچھ نہیں“ وہ گڑبڑا کر پیچھے ہٹی۔

”کچھ چاہیے تھا؟“

”نہیں، مہرماہ نے پیشانی سے پسینہ پوچھا۔

”پھر کیا کر رہی ہو؟“ وہ مسکرایا۔

”مم..... میں نے سمجھا کہ اس گھر میں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں خوف زدہ ہو گئی

تھی۔“ مہرماہ نے ہٹکا کر جواب دیا۔

”میں تمہیں آج کی رات تو کم از کم تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا“ میرام کے ہونٹوں پر

مسکراہٹ تھی۔

”خود ہی بیڈ روم تک آگئی ہو تو اب دو قدم چل کر بیڈ تک آ جاؤ“ وہ آنکھوں میں

شرارت لیے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مہرماہ کو پہلے قدم پر ہی جھٹکا لگا۔

”رک کیوں گئی ہو آؤنا“ میرام نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے کہا تھا۔

”یہاں بیٹھو..... میں ایک فون کر کے آتا ہوں“ وہ اسے بیڈ پر بٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی شاید وہ کھانا لے کر آیا تھا۔

”بھئی تم تو بڑی فرماں بردار ہو۔ جس زاویے پر میں بٹھا کر گیا ہوں اسی جگہ اسی پوزیشن

میں بیٹھی ہو“ اس نے ٹرے بیڈ پر رکھ دی تھی۔ اب وہ روم فریج میں سے کولڈ ڈرنک نکال رہا تھا۔

”مہر.....“ بڑے دلار سے پکارا گیا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی بلکہ اس کا سر کچھ اور

جھک گیا تھا۔

”مہرماہ صاحبہ! ذرا سر اٹھا کر اوپر دیکھئے ہم اتنے بھی ڈرواؤ نے نہیں“ اس نے بیسی کا

ایک ٹن اس کی طرف بڑھایا۔

”محترمہ! شاک کی کیفیت سے نکل آئیے“ وہ پلیٹ میں اس کے لیے چاول نکال رہا تھا ”مجھے دیکھ کر اکثر خواتین حواس کھو بیٹھتی ہیں۔ اس میں تمہارا کوئی تصور نہیں۔ میری پرستائی ہی کچھ ایسی ہے۔ یہ لو کھانا شروع کرو“ وہ پلیٹ زبردستی اس کے ہاتھ میں تھا کہ خود صوفے پر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”یہ مجھے اس طرح باتوں سے نارچ کرے گا“ اس نے اذیت سے سوچا۔ وہ انتقام کا نشانہ بنائی گئی تھی۔

”سنا ہے۔ بہت بہادر ہیں آپ، بڑے سائیں کے سامنے انکار کرنے والی تھیں“ لبوں پر دھیمی مسکراہٹ سجائے وہ اس کے سچے سنورے روپ کو بغور دیکھ رہا تھا۔  
”ویسے تم ہو کافی خوشخوار..... بچ کر رہنا پڑے گا۔ بتاؤ، دوستی چلے گی یا دشمنی“ جگر جگر چمکتی نگاہیں مہرماہ کے آرا پارا تر رہی تھیں۔

”دشمن چاہے جس رشتے میں بھی ہو دشمن ہی رہتا ہے“ مہرماہ نے بھرائی آواز میں لبوں کا قفل توڑ ہی دیا تھا میرام شاہ نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے انٹرکام کا بٹن دبا کر پھر سے اسے دیکھنے کا شغل جاری رکھا۔

”تمہاری آواز اچھی ہے“

”نوازش ہے“ وہ کھانے کی ٹرے دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔

”ابھی تو صرف آواز کی تعریف کی ہے، جب پوری مہرماہ کو سراہوں گا تو پھر تو نوازشات کے ڈونگرے برسا دو گی۔ ادھر ڈریسنگ روم ہے اور ساتھ ہی واش روم کا دروازہ ہے“ وہ مہرماہ کو ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے دیکھ کر گویا سمجھ گیا تھا کہ اب وہ مزید دلہنا پے کی ایکٹنگ نہیں کر سکتی۔ اسی بل دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

”شاہ جی! مکرم ہوں“ میرام کے پوچھنے پر باہر سے آواز آئی تھی۔

”آ جاؤ یار“ وہ صوفے پر نیم دراز سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

”جی حکم“ مکرم مودب سا پوچھ رہا تھا۔

”یہ برتن اٹھا کر لے جاؤ اور کھانا فریج میں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ بچوں کے لیے

لے جانا“

”کچھ اور“ وہ مزید ہدایات لینے کے لیے کھڑا تھا۔

”موہاں فون کو بھی چار جنگ پر لگا دو“ میرام نے ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھارتے ہوئے کہا۔

”جی بہتر“ مکرم نے حکم کی تعمیل کے بعد برتن اٹھائے اور باہر نکل گیا۔ میرام کافی دیر اس کا انتظار کرنے کے بعد ڈریسنگ روم کا دروازہ ناک کرنے لگا۔

”نہرو! سو گئی ہو کیا۔ باہر آؤ پشیدہ کی کال ہے“

”اس وقت فون کیا ہے پشیدہ نے“ میرام کی توقع کے عین مطابق وہ فوراً ہی باہر نکل آئی تھی۔

”کہہ رہی تھی اب صبح کال کرے گی“ میرام نے سنجیدگی سے جھوٹ بولا۔

”اچھا.....“ وہ بچ مان گئی۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی ”میں خود پوچھ لوں اسے شاید کوئی کام ہوگا“

”اس بے چاری کو اس وقت تم سے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے کام تو مجھے ہیں تمہارے ساتھ جو تم سمجھ نہیں رہیں“

میرام شاہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا۔ وہ کچھ خوف زدہ سی ہاتھ چمڑانے لگی تھی۔ میرام نے گرفت ذرا اور مضبوط کر لی۔

”آپ کی بہنیں کہاں چلی گئی ہیں؟“ وہ اپنے اندر کے خوف کو ختم کرنے کی وجہ سے بے سبب بول رہی تھی۔

”اپنے گھروں میں“

”کیا مطلب، یہ ان کا گھر نہیں ہے“ مہرو نے حیرانی سے پوچھا۔

”اول ہوں..... یہ تمہارا گھر ہے یا پھر محبت کی بیوی کا ہوگا“ وہ بیڈ پر تکیہ درست کر کے لیٹ گیا۔

”پھر موبیہ اور انیہ کیا الگ الگ گھر میں رہتی ہیں؟“ مہرماہ واقعی حیران تھی۔

”بھئی شادی کے بعد اچھی لڑکیاں اپنے شوہروں کے گھروں میں رہنا پسند کرتی ہیں“

میرام اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”کیا موبیہ اور انیہ کی شادی ہو چکی ہے“ اس انکشاف پر وہ ششدر رہ گئی تھی۔

”ہوں“ میرا شاہ اس تکرار سے بے زار ہو رہا تھا اسی لیے مختصر بولا۔

”کس کے ساتھ“ مہر ماہ نے بے ساختہ پوچھا۔ کیونکہ اپنے خاندان میں تو کوئی ان کے جوڑ کا تھا ہی نہیں۔

”انیہ کی شادی ہمارے ماموں زاد زبیر سے ہوئی ہے جبکہ موہبیہ کی خالہ کے بیٹے شازم سے..... اب کیا کھڑے کھڑے انٹرویو لوگی، بیٹھ جاؤ۔ بلکہ لیٹ جاؤ۔ تم بھی تھک چکی ہوگی“ اسے بت بنا بیڈ سے کچھ فاصلے پر کھڑا دیکھ کر میرا م نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے بیڈ پر دھکیلا تھا۔ مہر ماہ شرمندہ سی سنبھل کر سیدھی ہوئی۔ پھر تکیہ سیدھا کر کے سمٹ کر لیٹ گئی۔ میرا م بھی دوسری طرف آ کر لیٹ چکا تھا۔

”تو کیا آغا سائیں خاندان سے باہر رشتہ دینے پر رضامند ہو گئے تھے“ مہر ماہ نے بے چینی سے پوچھا۔

”نہیں، بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا“

”شاہوں کی بیٹیاں غیر خاندان میں چلی گئیں تو کیا واقعی وقت بدل چکا ہے“ اس نے بہت خوشگوار سی سوجا۔

”تمہارا کیا خیال ہے انیہ اور موہبیہ کی شادی نہیں ہونی چاہئے تھی“ میرا م نے کروٹ بدل کر اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیا۔ اچانک ہی اسے موقع کی نزاکت کا خیال آیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دراز میں سے ایک ٹمبلین کیس نکالا۔ یوں ہی لیٹے لیٹے دو ٹنگن نکال کر اس نے مہر ماہ کی کلائی تھام کر پہنا دیئے۔

”یہ تمہاری رونمائی کا تحفہ..... پسند آیا ہے یا نہیں“ وہ مہر ماہ کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ تو حیران بلکہ ششدر تھی۔ کبھی کلائی میں دکتے ٹنگن کو دیکھتی اور کبھی برابر میں لیٹے میرا م شاہ کو۔ کس قدر چھپا جانے والی شخصیت تھی اس کی، مہر ماہ کے دل نے ایک بیٹ مس کی۔

”خون بہا میں آنے والی عورتوں کو بستر پر تو جگہ مل جاتی ہے مگر رونمائوں کے تحفے نہیں دیئے جاتے۔ تمہیں اتنی سی بات سمجھانے کے لیے مجھے کتنا وقت درکار ہوگا“

اس نے ہاتھ بڑھا کر مہر ماہ کو اپنی ہانہوں کے حلقے میں لے لیا تھا اور وہ لرزتی کانپتی اپنے دل کی دھڑکنوں کو شمار کرنے لگی تھی، جو نجانے کیوں اس پل بغاوت پر اتر آئی تھیں۔

اس کی ڈیڑھ ماہ بعد محبت سے ملاقات ہوئی تھی محبت شاہ، ارد شیر شاہ کا دوسرا بیٹا تھا، جس کے ساتھ لغونہ کا نصیب جڑنا تھا۔ میرا م کے برعکس وہ بہت شوخ طبیعت کا تھا۔

”امریکہ میں مومن، میرا م اور میں اکٹھے تھے۔ میرا م کی اے کے بعد بینک آف امریکہ میں جاب کرنے لگا تھا پھر نجانے کیا ہوا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس آ گیا اب یہاں سٹی بینک میں جاب کرتا ہے“ پشینہ اور لغونہ اٹھ کر کچن میں گئیں تو محبت اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ دو گھنٹے مسلسل اسے ہنساتا رہا تھا۔ مہر ماہ زندگی میں پہلی مرتبہ اس قدر ہنسی تھی۔

”آپے کچن میں چلتے ہیں“ محبت مسکراتے ہوئے بھوک بھوک چلاتا ہوا اٹھا تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی آ گئی۔

”کیا بنا رہی ہو؟“ محبت نے ایک گرم گرم کباب اٹھا کر منہ میں رکھا۔

”میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ ہمارے پیچھے کچن میں نہیں آنا بیٹھ کر مہر و کا دماغ چاٹنے ہو میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ یہ بہت اچھی سامع ہے قطعاً بور نہیں ہوگی“

پشینہ نے اسے دوسرا کباب اٹھا کر دیکھ کر گھورا۔ مہر ماہ، پشینہ اور لغونہ کو مصروف دیکھ کر آنا گوندھنے لگی تھی۔ پھر اس نے نرم نرم سے پھٹکے اتارے ”بہت عرصہ بعد دیسی قسم کا لچ کروں گا“ کچن سے اٹھتی خوشبوؤں کی مہکار سے محبت کی بھوک اور چمک اٹھی تھی۔

”تم ذرا انیہ اور موہبیہ کو تو فون کرو“

مہر ماہ کو ایسی نزاکتوں کا کہاں خیال رہتا تھا۔ پشینہ کو ہی کہنا پڑا۔ ڈیڑھ ماہ ہو چکا تھا اس کی شادی کو مگر وہ ابھی تک اپنے خول میں کئی اجنبیوں کی طرح ہی رہ رہی تھی۔ اکثر سوچوں میں گم ہو جاتی۔ بابا جان اور بی بی اماں نے شادی کے بعد سرسری سا بھی رابطہ نہیں کیا تھا اسے تو اب پتا چلا تھا کہ آنا فانا بابا جان کی غیر موجودگی میں نکاح کیوں کیا گیا تھا۔ بی بی اماں بھی مجبور تھیں، یقیناً بابا جان نے انہیں سختی سے منع کیا تھا کہ مہر ماہ سے رابطہ نہیں رکھنا۔ یہ باتیں اسے پشینہ نے بتائی تھیں اور وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ اسے تو ابھی تک بابا جان کی ناراضی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ تو ان کے ناکردہ گناہ کی سزا کے طور پر میرا م شاہ کی بیوی بنی تھی پھر ان کی ناراضی اور غصے کی آخروہ کیا تھی۔

بڑی حویلی والے قتل کا بدلہ قتل چاہتے تھے، خصوصاً ملیجہ کے میکے والوں نے بہت عرصہ تک پنچائیت کے فیصلے کو قبول نہیں کیا تھا وہ لوگ مہمند عباس کو چھانسی کے تختے تک لے جانا

چاہتے تھے مگر نانا جان نے اپنی ازلی روایت کے مطابق مہمند عباس کی بیٹی کو باپ کی ڈھال بنادیا تھا مگر بابا جان نجانے کیوں بغاوت پر اتر آئے تھے ابھی بھی وہ سوچوں میں ایسی گم ہوئی کہ لاؤنچ میں سے آتی آوازوں پر دھیان ہی نہیں دیا۔ انیہ نے پیچھے سے اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر چونکا دیا تھا۔

”بھابھی جان! یہ کچن کے کام ابھی سے۔ چلیے باہر، یہاں کام کرنے والے بہت ہیں۔“  
 ”تم چلو میں ابھی آتی ہوں“ وہ جلدی سے چیزیں سیٹنے لگی۔ پشینہ نے ٹیبل پر کھانا لگا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد نانا جان اور اماں فیضہ بھی آگئی تھیں۔ مہر ماہ تو اس سر پرانز پر ابھی تک حیران تھی۔  
 ”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ سب آرہے ہیں“ وہ پشینہ سے الجھ پڑی۔  
 ”تمہاری یہ حیران صورت پھر کیسے دیکھنے کو ملتی“ پشینہ نے اس کے بازو میں چٹکی بھری۔  
 سب لوگ کھانے کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے، جب مہر ماہ چپکے سے اماں فیضہ کے قریب آئی تھی۔ انہوں نے شفقت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پوچھا ”میزی بیٹی خوش تو ہے۔ میرا اچھا ہے نا؟“

”سر جھکا کر آہستگی سے بولی“ اماں! بی بی اماں اور بابا جان کیسے ہیں؟“  
 ”مرجان تم سے ملنے کو بہت بے قرار ہے مگر.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔  
 ”مگر کیا؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا۔

”مہمند کا مزاج بہت برہم ہے اور پہلی مرتبہ شاہ سائیں سے دودھو جھگڑا کیا ہے اس نے اور نجانے کیوں میرا دل پھر سے بہت بے چین ہے۔ پھر سے کسی اور طوفان کی آمد کے اندیشے مجھے خوف زدہ کر رہے ہیں۔ ہمیں ادھوری خوشیاں ہی ملتی ہیں ہمیشہ“ وہ خود بہت پریشان تھیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف کے سائے تھے۔

”اماں! کیا میں کچھ دنوں کے لیے آپ کیساتھ حویلی نہیں جاسکتی۔“  
 ”ابھی کچھ عرصہ تم یہیں رہو..... جب حالات بہتر ہوئے تو میں خود تمہیں لے جاؤں گی“ انہوں نے نرمی سے اس کے ہاتھ دبائے۔ نوبتے تک انیہ اور موہیہ بھی چلی گئی تھیں، ان سے پہلے نانا جان اور اماں بھی واپس چلے گئے۔ پشینہ اور لغونو کو لے کر بڑی حویلی روانہ ہو گیا تھا۔ مہر ماہ ایک مرتبہ پھر تہوار گئی۔

میراں پچھلے دو دن سے شہر سے باہر گیا تھا۔ آج رات تک اس نے واپس آ جانا تھا۔

ابھی وہ کچن میں برتن سمیٹ رہی تھی، جب سیکنہ نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ مہر ماہ کچھ حیران سی ڈرائنگ روم میں آئی تو دو اجنبی خواتین کو دیکھ کر ٹھٹھکی گئی۔  
 ”مجھے آج بھی محبت کو روک لینا چاہئے تھا“ وہ تاسف سے کلاک کی طرف دیکھ کر مہمان خواتین کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تم میرا کی بیوی ہو؟“ انتہائی ماڈرن سی سرخ سفید خوشبوؤں میں بسی عورت نے نیکی نگاہ سے اسے دیکھ کر تلخی سے کہا۔ اس کے ساتھ بہت ماڈرن سی لڑکی بھی بغور اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

”آپ کون ہیں؟“ اس نے شائستگی سے پوچھا۔  
 ”میں میراں کی ممانی ہوں اور یہ میری بیٹی لائبہ ہے۔ میراں کو بلاؤ، مجھے اس سے ضروری کام ہے“ انہوں نے کافی نخوت سے سر جھٹک کر کہا۔  
 ”وہ تو گھر میں نہیں ہیں“

”تم ارشدیر کے قتل کے بدلے آئی ہو۔ نجانے ابھی تک وہ جاہل لوگ پرانی رسوں اور رواجوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، ورنہ تمہارا میراں کے ساتھ بھلا کیا جوڑ ہے۔ کبھی اپنی معمولی سی شکل آئینے میں دیکھی ہے“ اس عورت کے لہجے میں نامعلوم حسد کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔  
 ”آپ کیا مہر کو یہی بتانے کے لیے آئی ہیں آئی!“ اسی پل میراں دنداناٹا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا۔ آئی اور ان کی بیٹی دونوں ہی بری طرح گڑبگڑا گئیں۔

”میراں تم کب آئے ہو بیٹا!“ آئی کی آواز میں شہد چٹکنے لگا تھا۔  
 ”جب آپ اپنے خوب صورت خیالات کا اظہار کر رہی تھیں“ وہ ناگواری سے بولا پھر مہر ماہ کو جانے کا اشارہ کر کے آئی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ غصے کے عالم میں پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔  
 ”مہر ماہ میری بیوی ہے وہ کسی کے قتل کے بدلے میں نہیں آئی۔ بلکہ میں خود اپنے دل کی رضامندی سے اسے بیوی بنا کر لایا ہوں۔ وہ جیسی بھی ہے، مجھے دل و جان سے قبول ہے اور میں کسی کو مہر ماہ پر انگلی اٹھانے کی اجازت نہیں دوں گا“

وہ تلخی سے کہتا خود بھی اٹھ کر چلا گیا تھا اگر مہر ماہ چند پل کے لیے رک جاتی تو اسے اپنے نصیب پر رشک آنے لگتا۔

”کیا؟“ اس نے تعجب سے میرام کی طرف دیکھا۔

”یہی کہ تمہیں ایک چنا منا سا بے بی لادیتے ہیں“

”آپ بھی نا“ وہ شرما کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

”سر تو دباؤ“

”مجھے کام کرنا ہے“ مہرماہ ایک مرتبہ پھر ڈسٹنگ میں مصروف ہو چکی تھی۔

”اچھا گلا ہی دباؤ“

”لایبہ سے کہیں“

”کیوں؟“ میرام نے حیرانی سے اسے گھورا۔

”وہ یہ کام بہت اچھی طرح کرے گی“

”تمہارے ذہن پر لایبہ کیوں سوار ہوتی جا رہی ہے“ میرام نے اس کا ہاتھ تھام کر

زبردستی خدمت کروانا شروع کر دی تھی۔

”رقیب جو ٹھہری“ وہ مسکرائی۔

”بہت بولنے لگ گئی ہو؟“ میرام نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

”آپ کی محبت کا اثر ہے“

”بہت چالاک ہوتی جا رہی ہو“ اس نے مہرماہ کے گال پر چٹکی بھری۔ مہرماہ کا ابا اعتماد

انداز سے اچھا لگ رہا تھا۔

”چالاک نہیں، حاضر جواب کہیں“ وہ برجستہ بولی۔

”تم وہ ہی شاہ سائیں کی حویلی والی مہر و ہو۔ چپ چاپ اور دبوسی“ میرام نے

مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

”نہیں، میں تو میرام کی شاہ کی مہر و ہوں“ وہ ہنسی۔ میرام کے ہونٹوں پر بھی جاندار

مسکراہٹ ابھری تھی۔

”تمہارے روپ کی اس دھوپ میں کچھ دیر سستانہ لوں“ اس کا لہجہ مہرماہ کی قربت کی

گرمی اور لیس کی مہک سے بیکٹنے لگا تھا۔

”مجھے ابھی بہت کام کرنے ہیں“ مہر و نے لاڈ جتایا۔

”ارے، بھاڑ میں ڈالو تمام کاموں کو“ اس نے مہر و کو ایک جھٹکے کے ساتھ خود پر گرا کر

”مہر و! آنٹی ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ تم اتنی خوبصورت تو نہیں ہو، وہ آنکھوں میں

شرارت لیے آئینے میں اس کے عکس کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تو کسی خوبصورت کو لے آنا تھا“ مہرماہ جل کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

”میری ویسے بھی آپ کے نزدیک اہمیت ہی کیا ہے۔ دو چار دن بعد آ کر دیکھ لیتے

ہیں“ وہ کمرے میں پھیلی چیزیں سینتی ناراضی سے کہنے لگی۔

”یہ تو بہت ہی غلط بات کر رہی ہو۔ بھلا اہمیت کیوں نہیں تمہاری۔ اکلوتی بیوی ہو۔

دل پر پتھر رکھ کر محبت کے ڈائلاگ بھی دو چار بول ہی دیتا ہوں۔ تمہارے حقوق میں کبھی کوتاہی

نہیں کی۔ تمہاری زلفوں کے سائے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ کبھی کام کے بغیر گھر سے باہر رات

نہیں گزاری۔ حسین عورتوں کی طرف کبھی نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا“ وہ اسے آنکھ مار کر بالوں میں

انگلیاں چلانے لگا تھا۔

”کسی اور کو لے آتا تو تمہارا کیا بنتا تھا مہر و! میں نے تو تمہاری ذات پر بڑا احسان کیا

ہے“ میرام کی آنکھ میں شرارت تھی۔

”تو نہ کرتے“ وہ ترشی سے بولی۔

”پھر تم نے مجھے بد دعائیں دینا تھیں..... حویلی والوں نے تمہارا چاند سے یا پھر

قرآن سے نکاح کر دینا تھا..... میں کیسے تمہاری زندگی تباہ ہوتے دیکھ سکتا تھا“ میرام نے لہجے

میں مصنوعی رقت بھر کر کہا۔

”آپ کو مجھ سے اتنی کیوں ہمدردی تھی؟“

”تم نے مستقبل میں میرے بچوں کی اماں جو بننا تھا“ وہ پاؤں جھلاتا مزے سے

بولی۔ مہرماہ قدرے جھینپ کر رخ موڑ گئی۔

اس نے بیڈ شیٹ بدل کر ڈسٹنگ کرنا شروع کر دی تھی۔ میرام نے ناگواری سے

اسے دیکھا اور ٹوکا۔

”اس فضول کام سے بہتر ہے کہ تم میرا سر ہی دباؤ۔ ہر وقت ماسی بنی رہتی ہو“

”تو کیا کرو.....؟ کوئی اور مصروفیت بھی تو نہیں“ وہ ڈسٹنگ چھوڑ کر میرام کا

سر دبانے لگی تھی۔

”تمہاری مصروفیت کے لیے اب کچھ سوچنا پڑے گا“ میرام نے پرسوج انداز میں سر ہلایا۔

زور سے بھیجتا۔

”آپ بھی نامیرام! کوئی کام نہیں کرنے دیتے“ اس نے ٹھنک کر کہا۔

”اس سے بھی بڑا کوئی کام ہے“ میرام شاہ کا بہکا بہکا لہجہ محبتوں کے خمار میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے مہر ماہ کو ایسے بازوؤں میں سمیٹا تھا گویا کوئی نازک آگینہ ہو۔

☆☆☆

میرام کی محبتوں نے اسے اپنا اسیر کر لیا تھا وہ بھول چکی تھی کہ وہ ارد شیر شاہ کے قتل کے بدلے میں آئی ہے یا پھر اس کی شادی اس کے باپ کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے اسے تو بس اتنی خبر تھی کہ میرام شاہ اس کی زندگی میں تازہ ہوا کا جھونکا بن کر آیا ہے اور پھر حویلی کی عورتیں کہاں اتنی بانصیب تھیں۔ مہر کو تو اپنی قسمت اور بلند بخت پر رشک آنے لگا تھا اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو کس قدر خوش ہوتی۔

وہ اکثر میرام سے کہتی تھی کہ ”آپ اس قدر خوب صورت ہیں اور میں اتنی عام سی ہوں پھر بھی آپ نے میرے ساتھ شادی کرنے پر شاہ سائیں کو اس قدر مجبور کیا تھا حالانکہ آپ کو مجھ سے بہتر لڑکی مل سکتی تھی“

”یہ عام اور خاص کیا ہوتا ہے مجھے تو تم ساری دنیا کی عورتوں سے زیادہ خوبصورت لگتی ہو“

”آپ نے تو مجھے صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا پھر میں آپ کے حافظہ میں کیسے محفوظ رہ گئی؟“ وہ الجھ کر پوچھتی تھی اور میرام مسکرانے لگتا۔

”جب تم بہت چھوٹی تھیں تب ہی تم پر میرے نام کا ٹھپہ لگ گیا تھا۔ میری انا اور غیرت کو یہ گوارا نہیں تھا کہ میں تمہیں حویلی کے زندان میں قید کر دوں یا پھر انتظار کی سولی پر لٹکا دو۔ حالانکہ مجھے تو نہیں لگتا کہ کبھی تم نے میرے بارے میں سوچا ہوگا“ وہ یقین سے کہتا تھا مہر ولفی میں سر ہلانے لگتی۔

”میں نے بھی شعور سنبھالتے ہی آپ کا نام اپنے نام کے ساتھ سن رکھا تھا مگر میں آپ کے بارے میں کبھی سوچنے کی جرأت نہیں کر سکی، میں چاند کی تمنا کرتی بھی کیسے کہ کبھی اس چاند نے شاہ سائیں کی اونچی حویلی کے درجوں میں جھانکا ہی نہیں تھا“ وہ میٹھی نگاہوں سے اسے پہروں نکلتی۔

سردیوں کے آغاز کے ساتھ ہی بخار اور زکام نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس کی طبیعت کی خرابی کا سن کر انیہ کچھ دن رہنے کے لیے آگئی تھی۔ مہر ماہ بھی اس کی وجہ سے بہل گئی۔

وہ دونوں ہی سردیوں کی نرم گرم دھوپ کا مزہ لینے کی غرض سے لان میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

انیہ اپنی شادی کے واقعات سنارہی تھی۔

”ایک بات پوچھوں..... برا تو نہیں مانو گی“ کچھ دیر سوچنے کے بعد مہر ماہ نے آہستگی سے پوچھا۔

”ارے، اس میں اجازت لینے والی کیا بات ہے۔ آپ بلا جھجک پوچھ سکتی ہیں“

”تم دونوں کی غیر خاندان میں شادی ہوئی ہے آغا سائیں کا کیا رد عمل تھا۔ کیا وہ

آسانی سے مان گئے تھے؟“

”نہیں، آغا سائیں تو بمشکل ہی مانے تھے۔ اس سب کا کریڈٹ لالہ کو جاتا تھا۔

ورنہ میں اور موبیہ نے تو صدیوں پرانی رسومات کی بھینٹ چڑھ جانا تھا کیونکہ ہمارے بھی جوڑ کا رشتہ خاندان میں نہیں تھا اور آغا سائیں ہمیں گھر بٹھانا منظور کر لیتے اور کسی اور خاندان میں ہرگز نہ جانے دیتے۔ نجانے لالہ نے کن دلائل سے آغا سائیں کو منایا تھا شاید بابا کی قسم دے کر۔ بابا اور امی دونوں نے ہی ہمارے بچپن میں رشتے طے کر دیے تھے“ انیہ کی آنکھیں ماں باپ کی یاد سے نم ہونے لگیں۔

”ایک اور بات پوچھ لوں؟“ اس نے ایک مرتبہ پھر جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”بولیے نا بھابی جان! آپ کو ہنستا بولتا دیکھ کر ہمیں کس قدر خوشی ہوتی ہے“ انیہ نے

محبت سے اس کے ہاتھ تھامے۔

”میرام شاہ کی زندگی میں کبھی کوئی عورت نہیں رہی، میرا مطلب ہے وہ تو اتنے

شاندار ہیں۔ ساری زندگی یورپ میں رہے۔ کلاس فیلوز، کولیکڑ، وہ مزید کچھ پوچھنے سے پہلے ہی خاموش ہو گئی۔

”بھابی! لالہ کا ریکارڈ تو بڑا صاف ستھرا ہے اگر ان کے ماضی میں کوئی عورت ہوتی تو

پھر وہ اپنا حال اور مستقبل ہرگز بھی آپ کے ساتھ وابستہ نہ رکھتے۔ وہ کچھ معاملوں میں بہت فیر ہیں یہ مت سمجھیے گا کہ میں ان کی بہن ہوں اور ان کی برائیوں پر بھی پردہ ڈالوں گی مگر میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ لالہ نے کبھی آپ کے علاوہ کسی اور کو نہیں سوچا۔ ہم نے تو ہمیشہ آپ کو ہی اپنی بھابی کے روپ میں دیکھا ہے اس گھر میں چلتے پھرتے۔ لالہ اور محبت اکثر آپ کا نام لیتے تھے اور لالہ کو اماں فیضہ نے اول روز سے ہی باور کروا دیا تھا کہ آپ ان کی منگیتر ہیں اور انہوں نے کہا

تھا کہ میرا ام! تمہارے سامنے اک وسیع جہان ہے۔ تمہیں شاید زندگی میں بہت سی چیزیں اچھی لگیں۔ مگر ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ مہرماہ کو تمہارے علاوہ حویلی میں کوئی اور بیاہتے نہیں آئے گا۔ پورج میں گاڑی رکنے کی آواز کے ساتھ ہی انیہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میرا خیال ہے لالہ آگئے ہیں۔ میں زیر کو فون کرتی ہوں تاکہ وہ مجھے لے جائیں“ وہ اپنا پروگرام ترتیب دے رہی تھی، جب میرا بھی لاؤنچ کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

”میں آپ کے گھر کیا رہنے کے لیے آئی ہوں۔ آپ تو بہت ہی لاپرواہ ہو گئے ہیں۔ ذرا کلاک کی طرف دیکھیں۔ گیارہ بجتے ہیں صرف پچیس منٹ رہ گئے ہیں“ انیہ نے لگے ہاتھوں میرا مکی لا پرواہیوں کو جتنا بھی ضروری سمجھا۔

”آج کچھ دیر ہو گئی ہے تم کہاں جا رہی ہو؟“ وہ اپنا پرس اور کپڑوں والا شاہ پر اٹھا کر لائی تو میرا م نے حیرانی سے پوچھا۔

”اپنے گھر“

”اس وقت؟ صبح چلی جانا، بلکہ میں تمہیں آفس جاتے ہوئے ڈراپ کر دوں گا“

”مہربانی آپ جناب کی..... میرے میاں کو کھانے پینے میں دقت کا سامنا ہے۔ آپ خود کیجیے اپنی بیگم کی تیمارداری“

انیہ نے صاف جھنڈی دکھادی تھی۔ فون تو وہ زیر کو کر ہی چکی تھی۔ اب اس کے آنے کا انتظار تھا۔

”اگر ابھی جانا ہے تو میں چھوڑ دیتا ہوں۔ تم زیر کو منع کر دو اور رہی بات تیمارداری کی تو وہ تو ہم جی جان سے کرتے ہیں“ آخری فقرہ وہ مہرماہ کے کان کے قریب جھک کر بولا تھا۔ وہ سرخ سی زخ موڑ گئی جبکہ انیہ موبائل پر زیر سے رابطے میں مصروف تھی۔ کچھ دیر بعد زیر اسے لینے کے لیے آ گیا تھا۔ سوانیہ پھر آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

”آپ کیوں کوئے میں چلی گئی ہیں۔ ہوش کی دنیا میں آجائیے“ میرا م نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ گڑ بڑا کر اسے دیکھنے لگی۔

”کھانا لگاؤں“

”نہیں صرف دودھ کے دو گلاس لے آؤ“ وہ اپنے بیدروم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”دو گلاس کس کے لیے“ مہرماہ نے حیرانی سے پوچھا کیونکہ میرا م بھی جانتا تھا کہ وہ

دودھ پینا پسند نہیں کرتی۔

”ایک میرا اور دوسرا بھی میرا..... آپ کو کون سی خوش فہمی لاحق ہو گئی کہ میں زبردستی آپ کو دودھ پینے کی افادیت پر لیکچر دے کر پلوانے کی کوشش کروں گا“

وہ ر کے بغیر مزے سے بولتا ہوا اندر چلا گیا تھا، جبکہ وہ قدرے جھپٹتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی جب وہ گرم دودھ لے کر آئی تو میرا م کمپیوٹر پر مصروف تھا۔ وہ کچھ دیر تو ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر کچھ سوچتے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھی۔

”بات سنئے“ اس نے دھیمے سے پکارا۔

”جی سنائیے“

”ادھر منہ کریں نا“ میرا م کی نگاہیں کمپیوٹر اسکرین پر جمی دیکھ کر وہ جھنجلائی۔

”میں کانوں سے سنتا ہوں“

”پلیز میرا م!“ اس نے میرا م کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

”سنائیے بلکہ فرمائیے“ میرا م کام ادھر چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں کچھ دنوں کے لیے حویلی چلی جاؤں“

”کیوں؟“ اس نے صغریں اچکا کر مہرماہ کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ناگواری تھی۔

”ایسے ہی دل گھبرا رہا تھا۔ شادی کے بعد میں ایک دفعہ بھی بی بی اماں سے ملنے نہیں گئی“

”ملنے کی ضرورت بھی نہیں..... تمہارے والد محترم کے مزاج برہم ہیں۔ مجھے ان کی خاموشی سے خطرے کی بو آ رہی ہے“ اس نے سختی سے منع کر دیا۔

”مگر کیوں؟“ وہ تعجب سے بولی۔

”یہ تو تمہیں سوچنا چاہیے تمہارے والد محترم نے اپنی اکلوتی بیٹی کے نکاح میں شمولیت اختیار نہیں کی ہے نا حیرانی پس تعجب کی بات“ وہ استہزائیہ بولا۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ مہرماہ کی آنکھوں میں ناگواری درآئی۔

”جو تم سمجھنا نہیں چاہتیں“ اس کا انداز ہنوز وہ ہی تھا تسخرانہ۔

”وہ شہر سے باہر گئے تھے اور نا جان نے اچانک میرے نکاح کی تاریخ فائل کر دی تھی“

”بہت بھولی ہو تم مہرماہ! وہ شہر سے باہر تھے ملک سے نہیں۔ ایسی بھی کیا مجبوری تھی

کہ وہ اچانک منظر سے غائب ہو گئے“ میرا م نے تلخی سے کہا تھا اور ایک دفعہ پھر کمپیوٹر کی طرف



متوجہ ہو گیا۔

”آپ کو میرے بابا جان کے متعلق کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں“ وہ مشتعل سی اٹھ کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن اک عجیب واقعہ رونما ہوا امر جان بی بی بذات خود ڈرائیور کے ہمراہ اسے لینے کے لیے آگئی تھیں۔ دو ماہ اور بائیس دن بعد انہیں بالآخر مہر ماہ کا خیال آ ہی گیا تھا۔ وہ بی بی اماں کے سینے سے لگ کر کتنی ہی دیر روتی رہی۔

”میرام نے تجھے کیا قید کر رکھا ہے۔ ایک دفعہ بھی ملنے نہیں آئی“

”ایسی تو کوئی بات نہیں، بس مصروفیت“ اس نے وہی مصروفیت کا گھسا پٹا بہانہ بنایا۔

”بس، رہنے دے..... بس جانتی ہوں تو کتنی صابر ہے اور یہ بڑی حویلی والے کس قسم کی سوچ رکھتے ہیں“ انہوں نے تنفر سے کہا۔

”آپ بیٹھے نانی بی اماں“ اسے آداب میزبانی یاد آئے تو سرعت سے بولی۔

”میں یہاں بیٹھے نہیں، تجھے لینے کے لیے آئی ہوں“

”سچ اماں“ وہ چمک کر بولی۔ اس کی آنکھیں بھی چمکنے لگی تھیں۔ جب سے اس کی شادی

ہوئی تھی پہلی مرتبہ میکے سے بلاوا آیا تھا۔ اک فطری سی خوشی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

”اب جلدی سے تیاری کر..... ہمیں ابھی حویلی جانا ہے۔“

انہوں نے نرمی سے کہا۔ وہ خوشی خوشی اپنے بیڈروم کی طرف بڑھی۔ آدھے گھنٹے میں

اس نے تیاری کر لی تھی۔ پھر اچانک اسے میرام سے پوچھنے کا خیال آیا۔ ابھی وہ سیل اٹھانے لگی تھی، جب فون کی بپ بجنے لگی۔

”میرام کا لنگ“ موبائل اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔

”میں ابھی آپ کو فون کرنے ہی والی تھی۔“ اس نے چھوٹے ہی کہا۔

”خیریت“ میرام نے حیرت سے پوچھا۔

”بی بی اماں مجھے لینے کے لیے آئی ہیں“ اس نے خوشی سے بھرپور آواز میں بتایا۔

ان کے ساتھ چلی جاؤں؟

”نہیں“ اس نے سختی سے منع کیا تھا۔

”مگر کیوں؟“ مہر ماہ کو بھی غصہ آ گیا۔

”میں مناسب موقع دیکھ کر خود تمہیں لے کر جاؤں گا“

”تو کیا میں بی بی اماں کو انکار کر دوں“ وہ اسی ناگوار لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”ہاں“

”میں ایسا نہیں کر سکتی“ مہر ماہ کا انداز دو ٹوک تھا۔

”تم گھر سے باہر نکلیں تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا“ وہ غصے سے پھنکارا۔

”میرام آپ.....“ مہر ماہ کی آواز صدمے کی شدت سے پھٹ سی گئی تھی۔ اسی پل

مرجان بی بی نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھپٹ لیا۔

”ہم نے مہر ماہ کو تمہارے ہاتھ بچا نہیں تھا۔ نکاح کیا تھا تمہارے ساتھ“

مرجان بی بی اشتعال کے عالم میں عجائبی کیسا بولتی رہیں۔ دوسری طرف وہ بھی بھلا کم

تھا کیا۔ مہر ماہ خوف سے کانپتی رہی۔ پھر بی بی اماں نے موبائل زبردستی اس کے کان سے لگایا۔

”اگر یہ میری اجازت کے بغیر اس گھر سے گئی تو نتائج کی ذمہ دار خود ہوگی۔ میں اسے

واپس نہیں لاؤں گا“ دوسری طرف وہ غصے سے دھاڑ رہا تھا۔

بی بی اماں نے موبائل اس کے کان سے ہٹا کر آف کیا اور پھر اس کا بازو ہاتھ میں

دبوچے باہر کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ گھسنتی ہوئی ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ دماغ میں گویا سائیں

سائیں ہو رہی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے گویا تارے ناچ رہے تھے۔ بی بی اماں نے اسے گاڑی

میں بٹھایا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کچھ بولنا چاہتی تھی مگر باوجود کوشش کے وہ کچھ بھی بول نہ پائی۔

☆☆☆

اسے حویلی سے آئے سات دن ہو گئے تھے۔ مگر ابھی تک اماں فیضہ یا پھر پشیدہ ان

کے پورشن میں نہیں آئی تھیں۔ مہر ماہ کو بہت عجیب اور ناگوار لگا۔ اس نے بی بی اماں سے ذکر کیا تو

وہ تنفر سے بولیں۔

”تمہیں کڑھنے کی ضرورت نہیں۔ کھاؤ پیو اور خوش رہو“

انہوں نے تو دو لفظوں میں بات سمیٹ دی تھی مگر مہر ماہ بھلا خوش رہ سکتی تھی۔

ہر گزرتے دن اسے کچھ غلط ہو جانے کا احساس شدت سے ستا رہا تھا کبھی کبھی وہ سوچتی کہ اسے

بی بی اماں کے ساتھ نہیں آنا چاہئے تھا۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ دل میں دوسو سے بھی بڑھ رہے تھے۔ اس دن زیادہ ہی بے چینی بڑھی تو وہ پشینہ کے پاس خود ہی آگئی۔

”کیسے یاد آگئی ہے ہماری؟“ پشینہ نے اسے دیکھتے ہی طنز کیا۔

”تم نے بھی تو ملنا گوارا نہیں کیا“ مہر ماہ کے لبوں پر بھی شکوہ مچلنے لگا۔

”ابھی بھی تمہیں یہاں آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی“ لغو نہ بھی اٹھ کر ان کے قریب

چلی آئی۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ کیا میرا تم لوگوں سے تعلق ختم ہو گیا ہے؟ کیا میں یہاں نہیں

آسکتی؟“ وہ الجھ کر غصے سے بولی۔

”کم از کم ان دنوں میں نہیں آنا چاہئے تمہیں“ لغو نہ بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”مگر کیوں؟“

”بہت جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔ تمہارے بابا جان اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتے

ہیں“ پشینہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی بتانا پڑا۔

”کیسی بے عزتی؟“ اس کی آنکھوں میں حیرانی اتر آئی۔

”شاہ سائیں نے نکاح کے بعد تمہاری رخصتی کر دی تھی، جبکہ تمہارے بابا جان ایسا

نہیں چاہتے تھے“ پشینہ کچھ اور بھی بتانا چاہ رہی تھی مگر دوسائی کی آمد نے گفتگو کے سلسلے میں منقطع

کر دیا تھا۔

”آپ کو مہمند سائیں بلارہے ہیں بی بی!“

”بابا جان آگئے ہیں“ وہ فوراً ہی دوپٹہ درست کرتی دوسائی کے پیچھے چلی آئی۔ بابا جان

اپنے کمرے میں تھے۔ وہ دروازے پر دستک دے کر اندر چلی آئی۔

”بابا جان! آپ نے بلایا ہے“ مہر ماہ نے جھک کر سلام کرنے کے بعد احترام سے پوچھا۔

”ہوں..... یہاں بیٹھو“ انہوں نے مہر ماہ کے لیے اپنے برابر میں جگہ بنا کر بیٹھنے کا

اشارہ کیا۔

”مہر! یہ کچھ پیپر ہیں ان پر سائن کر دو“ بابا جان نے بغیر تمہید کے چند کاغذات

نکال کر اس کے سامنے رکھے۔

”یہ کیسے پیپر ہیں بابا جان“ اس نے بغیر کاغذات پر نظر ڈالے ہاتھ میں پین پکڑ کر

سرسری سا پوچھا۔

”خلع کے کاغذات ہیں“ انہوں نے گویا مہر ماہ کے سر پر آتش فشاں کا پھاڑ پھوڑ دیا

تھا۔ وہ ششدری ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

”میں ان کاغذات پر کیسے دستخط کروں بابا جان!“ اس نے خوف کے عالم میں کانپتے

ہوئے کہا۔

”تمہیں ان پیپرز پر دستخط کرنے ہوں گے۔ یہ میری عزت کا سوال ہے“ انہوں نے

درشت آواز میں کہتے ہوئے پیپر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

”بابا جان! میں ایسا نہیں کر سکتی“ وہ لرزتی آواز میں بولی۔

”اگر تم دستخط نہیں کرو گی تو مجبوراً مجھے میرا م سے طلاق کا مطالبہ کرنا پڑے گا میں

اردشیر کے بیٹے کو بطور داماد قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس سے کلام کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

بہتر یہی ہے تم سائن کر دو۔“ مہمند عباس نے سفاکی کی انتہا کر دی تھی۔

”یہ باتیں تو پہلے سوچنا چاہئیں بابا جان! کیا آپ اپنی بیٹی کے ماتھے پر طلاق کا

جھومر سجائیں گے۔ ہماری اگلی پچھلی نسلوں میں آج تک کسی نے طلاق کا طوق گلے میں نہیں

لٹکایا۔ آپ مجھے زمانے کی نظروں میں بد نما کرنا چاہتے ہیں“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

”اگر تم خلع نہیں لینا چاہتیں تو ٹھیک ہے۔ میرا شاہ عنقریب تمہیں طلاق دینے والا

ہے“ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس کے سر پر گویا دھماکہ کیا تھا۔

”کیا.....؟“ وہ تھرا کر، اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

☆☆☆

”کیا اتنی سی بات کی وجہ سے میرا شاہ مجھے طلاق دے گا کہ میں اس کی اجازت کے

بغیر آگئی ہوں اس کی آنکھوں سے گویا ساون کی جھڑی لگ گئی تھی۔ اس نے خلع کے پیپرز پر دستخط

کر دیئے تھے۔ میرا شاہ اسے طلاق دیتا۔ یہ تو بہن تو اسے کسی صورت گوارا نہیں تھی۔ مگر دل پر

بے چینیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ تمام رات اس کی جاگتے ہوئے اور روتے ہوئے گزر جاتی۔

اماں فضع، پشینہ اور شاہ سائیں کیسے چپ سے ایک دوسرے سے نگاہ چرائے

پھرتے۔ ان ہی بوجھل اور اداس دنوں میں مومن کی آمد نے گویا بالکل مجادی تھی۔ اسے یقیناً بابا

جان کے ارادوں کی بھنک پہنچ چکی تھی۔ سو اس کا موڈ بہت خوشگوار نہیں تھا۔ اس نے مہر ماہ سے

کلام کرنا ہی گوارا نہیں کیا۔

اس رات بھی وہ بے چینی کے عالم میں مبتلا رہی تھی۔ جب بہت دل گھرایا تو پانی پینے کی غرض سے نیچے چلی آئی۔ جوں ہی وہ کچن سے پانی پینے کے بعد سیڑھیوں کی طرف آئی تو مومن کے زور زور سے بولنے کی آواز نے مہرماہ کو دہلا دیا۔ ان کی حویلی میں کہاں مرد اس قدر بلند آواز میں بولتے تھے۔ وہ کچھ خوف زدہ سی بابا جان کے کمرے کے دروازے کی طرف آئی۔ اندر سے آتی آوازوں نے مہرماہ کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ مومن سرد آواز اور زہر خند لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”ہر کوئی چہرے پڑھنے کے فن سے آشنا نہیں ہوتا اور آپ جیسے لوگوں کے چہرے پڑھنا آسان ہی کہاں ہیں۔ آپ نے تہہ در تہہ خود کو بہت سے پردوں میں چھپا رکھا ہے بابا جان! اور افسوس کی بات یہ ہے کہ میں اس چہرے کے ہر بھید کو جان گیا ہوں۔ شطرنج کی بساط تو قدرت بچھا دیتی ہے اور مہرے ہم لوگ اپنی مرضی سے چلنے لگتے ہیں۔ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ تقدیر ہمارے برابر، ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ شمر جہاں آپ کی بیوی تھیں نا.....! کیوں کی تھی آپ نے اپنے سے نو سال بڑی عورت سے شادی؟

آپ نے اپنی بیک مضبوط کرنے کے لیے ایک صاحب جائیداد عورت سے شادی کی۔ آپ شاہ سائیں کی آدمی جائیداد کے مالک بن گئے تھے۔ حویلی اور اس گاؤں میں آپ کی پوزیشن مضبوط ہوتی چلی گئی تھی۔ آپ نے گھائے کا سودا نہیں کیا تھا۔ اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ نے اس عورت سے محبت کی یا نہیں۔ اس بے جوڑ ساتھ کو اچھی طرح نبھایا یا نہیں۔ آپ صاحب اولاد بھی ہو گئے آپ کو ایک وارث بھی خوش نصیبی سے مل گیا۔ میرے لیے آپ کے دل میں بہت گنجائش تھی بابا جان! مگر مہرماہ کا کیا تصور تھا۔ کیا وہ آپ کی اولاد نہیں تھی؟ وہ شمر جہاں جس سے آپ نے نکاح تو کر لیا تھا مگر لیکن دل سے قبول نہیں کیا۔ آپ نے دل میں کسی اور کو اور گھر میں کسی اور کو بسایا آپ کی بے اعتنائیوں کے درد اور اذیت نے بہت جلد میری ماں کو تھکا ڈالا۔

یہاں پر بھی آپ کے حصے میں خسارہ نہیں آیا۔ آپ کو بی بی اماں جیسی بے لوث چاہنے والی شریک حیات کا ایک دفعہ پھر ساتھ مل گیا۔ آپ اپنی زندگی میں ہر بازی کو اچھی طرح جیتتے رہے ہیں۔ آپ نے میری منگنی اپنے دل کی رضا مندی سے پشیمینہ کے ساتھ کر دی۔ اس

میں بھی آپ کا نقصان نہیں تھا۔ صباد ما کی آدمی جائیداد بھی آپ کے حصے میں آنے والی تھی۔ ”مہرماہ میری احمق اور بہت ہی بے عقل، نا سمجھ بہن۔ جس کی طنائیں آپ کے ہاتھ میں تھیں“

”خاموش ہو جاؤ مومن“ بابا جان نے نہایت مشتعل ہو کر مومن کو کپکپ کر دانا چاہا۔ مومن ایک مرتبہ پھر پھٹ پڑا تھا۔

”مجھے بولنے دیجیے بابا جان! ورنہ میرے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی“ وہ غصے سے جھگھاڑتے ہوئے بولتا رہا۔

”خون بہا میں آغا شاہ سلطان اپنی بہو اور بیٹے کا خون آپ کو معاف کر چکے تھے۔ شاہ سائیں کے لاکر میں وہ معافی نامہ ابھی تک محفوظ پڑا ہے۔

پھر آپ نے میرا شاہ سے اپنی بیٹی کا نکاح کیوں ہونے دیا؟ آپ کیوں نکاح سے پہلے منظر سے ہٹ گئے تھے۔ حالانکہ آپ کی بیٹی بقول آپ سب کے خون بہا میں جا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ کے جرم کے بدلے میں جا رہی تھی“ وہ ایک مرتبہ پھر بولنا چاہتے تھے جب مومن نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔

”آپ صرف اور صرف مہرماہ کی حصے کی جاداد بھی لکھوانا چاہتے تھے جو کہ نکاح سے پہلے آپ کو ملنے والی نہیں تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ بغیر رخصتی کے میرا شاہ سے طلاق لے لی جائے گی مگر ایسا ہوا نہیں۔ مگر آپ کا منصوبہ اس وقت گزرنے لگا جب شاہ سائیں نے مہرماہ کی رخصتی بھی کر دی۔ نہ صرف میرا بلکہ شاہ سائیں بھی کچھ کچھ آپ کے ارادوں سے باخبر ہو گئے تھے۔ سو انہوں نے میرا م کے کہنے پر رخصتی کر دی تھی۔ یہاں پر آپ کی زخمی انا بلبل اٹھی۔

پھر آپ نے ایک مرتبہ اور غور و فکر کے بعد مہرماہ کو طلاق دلوانے کے بارے میں فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ کیونکہ آپ ارد شیر کے بیٹے سے اپنی بیٹی کا نام جزا نہیں دیکھ سکتے تھے اور دوسرا شاہ سائیں نے مہرماہ کے حق میں مہر میں میرا شاہ سے سبز پہاڑوں والی زمین بھی نہیں لکھوائی تھی۔ اور آپ کی فرمانبردار بیٹی نے آپ کے تمام منصوبوں کو پایہ تکمیل تک آخر پہنچا ہی دیا ہے۔ اس بے عقل نے خلع کے پیپر پر دستخط کر دیے ہیں اور میں آپ کے سامنے یہ پیپر پھاڑنے لگا ہوں۔ اگر بی بی اماں مجھے بروقت باخبر نہ کرتیں تو نجائے کتنی زندگیاں تباہ ہو جاتیں اور پھر میں نے آپ کو زندگی کی سانس تک معاف نہیں کرنا تھا بابا جان!“

مومن کو کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو وہ رخ موڑ کر بابا جان کے زرد اور پسینے سے شرابور چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ درد کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے اپنا سینہ مسل رہے تھے۔

ان کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کے رو برواتی تلخ اور سفاک سچائیوں کا سامنا نہیں کر پائے تھے۔

”بابا جان! آپ ٹھیک تو ہیں“ وہ گھبرا کر ان کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

”میں ٹھیک نہیں ہوں..... اور مجھے ٹھیک ہو کر کرنا بھی کیا ہے۔ احمد آباد سے لے کر حسین مگر تک کی ساری جائیداد اکٹھی کر کے مجھے آخر ملنا ہی کیا تھا۔ ٹھیک ہے میں کچھ معاملوں میں خود غرض رہا ہوں مگر..... کیا تم لوگوں نے مجھے اس قدر لالچی اور کمینہ سمجھ رکھا ہے..... مگر ایک بات تم نے ٹھیک کہی ہے میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نہ اچھا شوہر بن سکا نہ اچھا باپ میری زندگی میں دو عورتیں بیوی کے عہدے پر فائز رہیں دونوں نے مجھ سے عشق کی انتہا تک محبت کی تھی۔ مگر میں..... ان دونوں کے ساتھ ہی مخلص نہیں رہا۔ ان دونوں نے ہی مجھے پوجنے کی حد تک چاہا اور میں ایک..... قبر کی پرستش کرتا رہا ہوں تمام عمر..... اب عمر کی پونجی بھی لٹنے کے قریب ہے اور میں تم سے مہر ماہ سے معافی مانگتا ہوں میں واقعی، بہت خود غرض باپ ہوں۔ تم نے سچ ہی کہا ہے میں بہت برا ہوں، بہت برا“

ان کے ٹوٹے الفاظ لبوں سے بکھر رہے تھے۔ مومن دونوں ہاتھوں سے ان کا سینہ مسلتے ہوئے بی بی اماں کو آوازیں دینے لگا۔ اور بند دروازے کے باہر کھڑی مہر ماہ نہ جانے کب بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

”کیا ہوا ہے مہمند عباس کو؟“ بی بی اماں کی لرزتی آواز حویلی کی دیواروں سے ٹکرانے لگی۔

”بی بی اماں! بابا جان“ مومن نے روتے ہوئے ان کے زانوں پر سر رکھ کر لبوں سے گویا صور پھونکا تھا اور مرجان بی بی بھی دل پر ہاتھ رکھے ٹھنڈے فرش پر بیٹھی چلی گئیں۔ ان کی سانسوں کی دُور بھی تو مہمند عباس کے ساتھ بندھی تھی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان کے بغیر ایک بھی سانس لے سکیں۔

صہیر نے ٹھک کر پستول اٹھایا تھا اور پھر سیدھا اپنے دل کا نشانہ لے لیا۔ ارد شیر لالہ لمبے کے ہزارویں حصے میں اس کا ارادہ بھانپ کر صہیر کے قریب لپک کر آئے۔ وہ ہر صورت اس

کے ہاتھ سے پستول چھین لینا چاہتے تھے۔ اسی اثناء میں وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ لالہ کا ہاتھ پستول کے اوپر تھا جبکہ صہیر کی انگلی ٹریگر پر..... صرف لمحوں کا کھیل تھا اور صہیر نے گولی چلا دی اور صرف چند ہی سیکنڈوں میں اس کا خون سے لت پت وجود زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا۔

یہ وہی وقت تھا جب مہمند نے ڈیرے کی حدود میں قدم رکھا۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے صہیر کو زمین پر گرتے دیکھا تھا اور لالہ کے انسانی خون سے رنگے ہاتھ ان کے جرم کے گواہ بن گئے۔ لالہ، جرگے کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتے رہے۔ جرگے نے بھی لالہ کے حق میں فیصلہ نہ دیا تھا۔ یعنی انہوں نے صہیر کی خودکشی کو تسلیم کر لیا۔ مگر مہمند اپنے دل کو کیسے سمجھاتا۔ اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کے نزدیک وہ جھوٹ کیسے ہو سکتا تھا اور پھرتائی جی ثریا جہاں نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا کہ مہمند سے قسم لی تھی کہ وہ صہیر کے قاتل کو مارنے کی قسم کھائے۔ مہمند نے اس قسم کی لالچ نہیں رکھی تھی۔

بات تو کچھ اور تھی۔ تمہیں آج ان سب حقیقتوں کے بارے میں اس لیے بتا رہی ہوں کہ کل پھر کھائی نادانی نہ کر لینا۔ اپنی خوشیوں کو اپنے ہاتھ سے آگ مت لگانا بیٹی! ہم نے پہلے ہی بہت سے صدمات جھیلے ہیں۔ اب اپنے بچوں کا کوئی غم سہنے کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔

اماں فضا نے اس کے سر پر بوسہ دے کر زری سے کہا تھا اور مہر ماہ آنسو پونجی بے چینی سے بولی۔

”بتائیے ناماں! آپ خاموشی کیوں ہو گئی ہیں“

”شرم آپانے جو تحریر رکھی کے ہاتھ لالہ کو بھجوائی تھی اس کے متعلق مہمند کو بھی خبر ہو چکی تھی۔

وہ حیران تھا کہ ارد شیر جیسے بندے کو شرم جہاں نے آخر کیوں رجحیکٹ کیا ہے پھر اسے جلد ہی وجہ معلوم ہو گئی تھی اور یہ راز مہمند کے سینے میں بھی دفن ہو گیا تھا۔ اس نے بھی کبھی شرم آپا کو جتانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے زینب کی محبت کو بھی کسی مقدس راز کی طرح دل میں محفوظ کر رکھا تھا۔ وہ اس بات سے ناواقف تھا کہ محبت تو خوشبو کی مانند ہوتی ہے اور مہمند کی محبت کی مہک کچھ لوگوں تک پہنچ بھی چکی تھی جن میں مرجان بی بی اور شرم آپا بھی شامل تھیں۔

جب زینب نے خودکشی کی، تب مہمند کے ذہن میں صرف ایک بات زندہ رہی تھی اور وہ بات یہ تھی کہ ارد شیر، شرم جہاں کے رجحیکٹ کرنے کا بدلہ زینب اور صہیر نے لینا چاہتا ہے۔ مہمند کو گویا کامل یقین تھا کہ زینب کو بھی زہر دے کر مارا گیا ہے اور پھر صہیر کو بھی لالہ

نے ہی قتل کیا ہے۔ شاید اس کے گمان میں یہ تھا کہ لالہ، زینب کو مجبور کرتے ہوں گے کہ وہ صمیر کو بھی اسی طرح ریجیکٹ کرے جیسا کہ صمیر کی بہن نے انہیں کیا تھا۔ اگرچہ حقیقت اس کے برعکس تھی زینب کی موت کے بعد میں نے ایک دن بھی مہمند کو پرسکون نہیں دیکھا۔ وہ بہت کم کم زنان خانے آتا تھا۔ وہ بہت چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ میں نے پوری زندگی اس حویلی کی چار دیواری میں گزار دی ہے مگر میں نے کبھی بھی مہمند کے لبوں پر سچی مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ زینب کی محبت نے اس کے دل کو ایسی دیمک لگا دی تھی کہ پھر مہمند کو کوئی رنگ زندگی میں نظر ہی نہیں آیا۔

میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ لالہ کی گاڑی کا مہمند کی جیب کے ساتھ شدید ایکسیڈنٹ بھی مہمند کے اسی جنون کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ اپنے تئیں زینب کے قاتل کو مٹا ڈالنا چاہتا تھا۔ اس ایکسیڈنٹ میں مہمند نے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ لالہ کی گاڑی اگر کھائی میں گری تھی تو مہمند کی جیب بھی پہاڑ سے لڑھکتی ہوئی دریا میں گر گئی تھی۔ مگر مہمند معجزاتی طور پر بچ گیا تھا، جبکہ لالہ اور بھابھی کا وقت آخر آچکا تھا۔

جرگے نے پرانی رنجشوں کے تحت فیصلہ سنایا تھا کہ یا تو مہمند کو قتل کیا جائے یا قصاص اور خون بہا میں اس کی بیٹی کو بڑی حویلی والوں کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر میرے آغا سائیں نے راضی نامے کے کاغذوں پر دستخط کر دیئے تھے۔

اور میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہوں گی کہ تمہیں کسی کے قتل کے جرم میں میرا مہیاہ کر نہیں لے گیا۔ وہ تو برسوں پرانی دشمنی کا خاتمہ چاہتا تھا اور یہی میری دلی آرزو تھی کہ تمہاری شادی میرا سے ہو جائے۔ میں اپنی بیٹیوں کی خوشیوں کو سلامت دیکھنا چاہتی تھی پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ شہر آپا کی بیٹی حویلی کی دیواروں سے تمام عمر سر پٹنی رہ جائے۔

میں نے شاہ سائیں سے چوری چھپے میرا سے رابطہ رکھا تھا۔ میں اکثر اسے فون بھی کر لیتی تھی اور میں اپنے اللہ کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ میں نے میرا کی سوچ کبھی بھٹکنے نہیں دی تھی۔ اور میرے بھتیجے نے میری محبتوں اور خالص جذبوں کی لاج رکھ لی تھی۔ وہ تم سے خفا ضرور ہے۔ مگر یہ ڈنگی تمہاری پہل سے خود بخود ختم ہو جائے گی۔ چلو اٹھو تیار کرو۔ میں اور مومن خود تمہیں میرا سے حوالے کر کے آئیں گے اور بیٹا! مرجان بی بی بھی اسی غلط فہمی کا شکار تھی کہ تم پر شاہ سائیں نے ظلم ڈھایا ہے۔ زیادتی کی ہے۔ شاید وہ اسی لیے زبردستی تمہیں اپنے ساتھ لے کر آئی تھی مگر جب اسے مہمند کے ارادے کی خبر ہوئی تو پھر اس نے مومن کو فوراً ہی مطلع کر دیا تھا، ہم

سب ہی کسی نہ کسی غلط فہمی کا شکار اپنے اوپر زندگی کے کھلے کواڑوں کو بند کرتے رہے ہیں۔ ہم نے خود اپنے لیے آگ خریدی تھی اور پھر اس آگ میں بھڑبھڑ جلتے رہے۔

اماں فضہ نے اپنی نم آنکھوں کو پونچھا تھا اور پھر مہرماہ کی طرف دیکھنے لگی جس کے سانولے معصوم سے چہرے پر بہت دنوں کے بعد روشنی سی پھونٹنے لگی تھی۔ انہوں نے محبت سے اس کی آنکھوں کو چوما اور بولیں۔

”اٹھو بیٹی! دیر مت کرو“

اور وہ لبوں پر مسکان سجائے ”جی بہتر“ کہتے ہو اپنا سامان باندھنے کے لیے کھڑی ہو گئی تھی۔ اماں فضہ نے اٹھ کر بھاری کھڑکیوں کے سارے پٹ کھول دیئے۔ کچھ فاصلے پر مائی اماں کے مزار کا سفید گنبد نظر آرہا تھا۔ مزار کے احاطے میں اڑتی پڑتی نظر درخت کی چھاؤں کے ارد گرد بھٹکنے لگی۔ ام زینب کی قبر پر کسی نے چراغ روشن نہیں کیا تھا کیونکہ اس کی تربت پر ہمیشہ دیا جلانے والا مہمند عباس بھی مائی اماں کے مزار کے احاطے میں گہری نیند سو رہا تھا۔

ایک چراغ بجھ گیا تھا۔ ایک قدیل روشن تھی۔ انہوں نے میرا شاہ اور مہرماہ کے دلوں میں جلنے والی چاہتوں کی شمع کو ہمیشہ کیلئے بجھنے سے بچا لیا تھا اور پھر محبتوں کے چراغ تو ہمیشہ جلتے ہی رہتے ہیں۔ کوئی زندہ رہے یا نہ رہے۔



معجزہ تصور کر رہی تھی۔

جب زندگی ہاتھوں سے نکل رہی تھی اور موت کے بھیاں سناٹوں کی آٹھیں سناکی دینے لگی تھیں۔ تب مجھے بہت شدت سے زندگی اور اس کی رعنائیوں کا احساس ہوا۔ مایوسیوں اور تنہائیوں کا وہ خود ساختہ خول چٹختے لگا تھا۔ جس کے خصار میں عرصہ چار سال سے میں مقید تھی۔

اس دن ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر میں اپنے قدموں پر چلتی رب رحیم کا شکر ادا کرتے ہوئے گھر جانے کے لیے تیار تھی۔ ڈرائیور گاڑی میں سامان وغیرہ رکھ آیا تھا، اور میں امی کے ہمراہ نیچے جا رہی تھی جب ایک نرس نے ہمیں کوریڈور میں روک لیا۔

”مسز ادریس ایوب! آپ کو ڈاکٹر زین بلارہی ہیں“ نرس نے مصروف انداز میں امی کو مخاطب کیا تھا۔ پھر تیزی سے گزر کر آگے کی طرف نکل گئی۔

”افزاء! تم ڈرائیور کے ساتھ گھر چلی جاؤ۔ میں ڈاکٹر زین کی بات سن کر اور مارکیٹ سے کچھ سامان خرید کر همان کے ساتھ آ جاؤں گی“ امی میری طرف دیکھ کر کچھ پل سوچنے کے بعد بولیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ہمایوں بھائیوں کے بچوں نے مجھے آن دبوچا۔

”پھوپھو آگئیں“

وزیلہ بھابھی بھی نیچے آگئی تھیں، اور رخشی نے بھی موبائل کان سے ہٹا کر ایک اچھتی نگاہ میری طرف پھینکی۔ شاید دمیری چال میں کوئی کمی ڈھونڈنا چاہ رہی تھی۔ اور پھر مایوس سی ہو کر دوبارہ بے فون پر مصروف ہو گئی۔ میں لاؤنج میں بیٹھ گئی۔

”دادو آگئی ہیں“ نومی پاپ کارن کھاتے ہوئے چیخا۔

”کہاں ہیں؟“ نوزاد اور نہانے بے قراری سے بولیں۔

”اپنے کمرے میں“ نومی نے پاپ کارن کا خالی پیکٹ کارپٹ پر پھینک دیا تھا اب وہ چاکلیٹ کھانے لگا تھا۔

”امی اپنے کمرے میں چلی گئیں، مگر کیوں؟“ میں کچھ حیران سی امی کے کمرے میں چلی آئی تھی، مگر امی کے چہرے کی طرف دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ چہرہ میری ماں کا تو نہیں تھا۔ یہ چہرہ تو کسی عمر رسیدہ عورت کا دکھائی دے رہا تھا۔ تھکن سے اٹا، جھریوں سے

## سایہ اور سائبان

زندگی کی بساط پر اپنی پسند کے مہرے رکھنے والے کبھی کبھی بری طرح شکست سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہر عروج کو ایک زوال نکلنے کے لیے تیار ہوتا ہے اسی طرح ہر جیت کے تعاقب میں ایک ”ہار“ ازل سے تیار رہتی ہے۔

کیا ایسا بھی کبھی ہوا ہے؟ جیتنے والے ہار جائیں۔ جنہیں سب کچھ مل جائے اور وہ پھر بھی خالی ہاتھ رہیں۔ آج میں خالہ کے گھر سے آئی تو رجا پہلے سے ہی موجود تھی۔ وہ پشیمان اور رنجیدہ تھی۔ بکھری اور الجھی الجھی لگ رہی تھی۔

خسارے اب رجا عباد کے حصے میں چلے گئے تھے اس کی سزا کے لیے یہ ہی کافی تھا کہ وہ تمام عمر اسی حساب کتاب میں الجھی رہتی کہ احزم عباس نے اسے طلاق کیوں دی؟ یہ ناختم ہونے والی اذیت ناک سزا رجا عباد کو کبھی پورے دل سے خوش نہیں ہونے دیگی۔

وہ احزم عباس کو دیوتاؤں کی طرح پوجتی رہی تھی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے کسی کے کانچ جیسے دل کو چور چور کر دیا تھا۔ پھر بھی احزم عباس نے اسے چھوڑ دیا۔

اس کی آنکھوں میں مذامت کے آنسو تھے چہرے پر پشیمانیوں کا جال تھا۔

کبھی وہ فتح سے سرشار تھی، آج شکستہ دیوار کی طرح میرے سامنے تھی۔

یہ وقت وقت کی بات تھی، کبھی تنہائیاں اور آنسو میرا مقدر تھے آج یہ آنسو رجا کی آنکھوں میں بھی ٹھہر گئے تھے۔

☆☆☆

دو ماہ پہلے میں ٹوٹی ٹانگ سمیت ہسپتال کے بستر پر پڑی تھی اور اپنے بچ جانے کو ایک

لبریز اور ان سلوٹوں میں چھپا انجانا سا کرب اور دکھوں کی اک اور نئی داستان رقم تھی۔

”امی! آپ کو کیا ہوا ہے؟ اس قدر زرد کیوں ہو رہی ہیں؟“ میں نے ساکت بیٹھی اور ہولے ہوئے لرزتی اپنی ماں کو جھنجھوڑا لیا تھا۔ مگر ان کے وجود میں اک ذرا سی جنبش تک نہیں ہوئی تھی۔

”امی! خیر تو ہے نا“ میرے لبوں سے فوجہ برآمد ہوا، آپ کو ڈاکٹر زین نے کچھ کہا ہے؟“ میرے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔ امی کی پریشانی، ان کی گہری خاموشی نے میرا دل دہلا کر رکھ دیا، تو کیا ڈاکٹر زین نے امی سے کوئی ایسی بات کی ہے جس کی وجہ سے“ میں اپنی ماں کے چہرے کو وحشت زدہ سی دیکھتی رہ گئی تھی۔ ان کے زرد چہرے پر مایوسیوں کا جال بن رہا تھا۔ ویسی ہی مایوسیاں جو مجھے چار سال پیچھے دھکیل چکی تھیں۔

چار سال پہلے کے گھپ اندھیرے ایک دفعہ پھر سے مجھے اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ میں یادوں کے سمندر میں بہتے دور نکل گئی تھی۔

☆☆☆

یہ اس وقت کی بات تھی جب میں گریجویشن کے بعد تعلیم کو خیر باد کہنے کا اعلان کر چکی تھی۔ امی اور پاپا کی شدید خواہش کے باوجود میں نے مزید نہ پڑھنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ پاپا کے سمجھانے کے باوجود میرا طمینان قابل دید تھا۔

”پاپا! شکر کریں، اس نے روپیٹ کر بی اے کر لیا ہے“ ہمان بھائی سراسر میرا مذاق اڑا رہے تھے میری نالائقی کی تو ویسے بھی خاندان بھر میں دھوم تھی۔ ہمایوں بھائی اور ہمان بھائی دونوں سرکاری اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ہمایوں بھائی کی دو بیٹیاں تھیں، جبکہ ہمان بھائی ابھی تک شادی کے نام سے دور بھاگتے تھے۔

”امی! رجا کو بخار تھا۔ اس کی احوال پر سی کر آؤں“ پچھلے دو گھنٹوں سے میں وقتاً فوقتاً یہی راگ الاپ رہی تھی، مگر امی یوں انجان بن کر اپنے کام میں مصروف تھیں۔ گویا انہوں نے میری التجا کو سنایا نہ ہو۔ مگر مجھے بھی ہمان بھائی چکنا گھڑا اور ڈھیوں کی ملکہ میری ان ہی خوبیوں کی وجہ سے کہتے تھے۔

”وہ بہت غصہ کر رہی تھی۔ ابھی صبح بھی اس کا فون آیا تھا۔ پلیز امی! مان جائیے نا۔ پر اس، جلدی آجاؤں گی“ نہایت مستقل مزاجی سے میں بھی امی کے سر پر سوار تھی۔ امی ہنریاں کانٹنے میں مصروف تھیں۔ وزیلہ بھابھی حسب معمول صبح ہی میکے روانہ ہو گئی تھیں۔ دو بیٹیوں کے

باوجود ان کی روٹین اول روز کی طرح برقرار تھی۔ ناشتے کے بعد وہ ہمایوں بھائی کے ساتھ ہی کسی نہ کسی نئے بھانے کو وجہ بنا کر چلی جاتی تھیں۔ ان کی ہڈ حرامی، کابلی اور نکلے پن سے امی اور میں سمجھوتہ کر چکے تھے۔

ناشتا بنانا، کھانا وغیرہ سب میرے ذمے تھا۔ اوپر کے کاموں کے لیے کام والی آتی تھی۔ البتہ کپڑے خود دھوئے جاتے تھے اور استری بھی میں ہی کرتی تھی چونکہ اب میں بالکل فارغ ہو چکی تھی، سو بڑی جانفشانی کے ساتھ میں نے گھر اور کچن سنبھال لیا تھا۔ اور وزیلہ بھابھی اور بھی آزاد ہو چکی تھیں۔

بھیا اور ہمان بھائی اپنے اپنے دفتر چلے جاتے تھے اور پاپا آفس، تقریباً دس بجے تک جاتے تھے۔ وہ نیوی میں کموڈور کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اب ایک پرائیویٹ ادارے سے منسلک تھے گھر میں خوشحالی تھی۔ روپے پیسے کی ریل پیل تھی، مگر امی کی سادگی اور وضع داری کی وجہ سے ہم لوگ نمود و نمائش سے کوسوں دور تھے۔

”میں نے اروی گوشت اور ہمان بھائی کے لیے کھجڑی بھی بنا دی ہے۔ آپ صرف پھلکے اتار لیجئے گا“ رجا کے گھر جانے کے شوق میں ناشتے کے فوراً بعد میں لُچ کی تیاری بھی کر چکی تھی اور اب اپنے تئیں میں فارغ ہو چکی تھی، بس امی سے اجازت درکار تھی۔

”روز، روز کسی کے گھر جانا مناسب نہیں۔ آئے دن تمہیں ہی اس سے ملنے کا بخار چڑھ جاتا ہے“ امی نے مجھے بری طرح تاز کر رکھ دیا تھا ”یہ کالج کی دوستیاں بس کالج تک محدود ہونی چاہئیں مجھے تمہارا رجا کے گھر جانا پسند نہیں“

”رجا کا ابھی میرے گھر آنے کا بہت دل کرتا ہے اسے بھی میرا گھر دیکھنے کی بہت خواہش ہے مگر آپ تو جانتی ہیں اس کے بابا جان کو، وہ بہت سخت طبیعت کے مالک ہیں۔ ان دونوں بہنوں کو کہیں آنے جانے نہیں دیتے۔ وہ تو بے چاری کبھی اپنے چچا کے گھر بھی نہیں گئی“

”بہت اچھا کرتے ہیں، بیٹیوں کو لور اور پھر نے سے روکنا، سمجھانا والدین کا ہی کام ہے“

”رجا کی کیسے؟“ امی ناگواری سے پوچھنے لگیں۔

”رکشا ہے نا“

”خبردار جو رکشے کا نام بھی لیا“ امی نے غصے سے کہا۔

”تو پھر کیسے جاؤں گی“ میں روہانسی ہو کر منمنائی۔

”آویز سے کہتی ہوں، چھوڑ آتا ہے تمہیں مہارانی کے گھر“ امی فون آئینڈ کی طرف بڑھ گئی تھیں اور میں خوشی سے چپکتے ہوئے کپڑے تبدیل کرنے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

میرے پاپا اور لیس ایوب کی ہم صرف تین ہی اولادیں تھیں۔ بھیا سب سے بڑے تھے، اور ہمان بھائی، بھیا سے آٹھ سال چھوٹے تھے اور میں ان سے بھی چار سال چھوٹی تھی۔ امی، پاپا نے ہمیں بہت محبت بھرا متوازن ماحول مہیا کیا تھا۔ شاید اسی لیے ہماری شخصیت میں کوئی کمی نہیں تھی۔

بھیا کی شادی امی نے اپنی پسند سے کی تھی اور وہ فرمانبردار سے امی کی پسند کو دل و جان سے پسند کر چکے تھے اور اب بیوی کے بھی بہت ہی فرمانبردار قسم کے شوہر تھے۔ ذلیلہ بھابھی بہت خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کی سمجھدار بھی تھیں اور شوہر کو اچھی طرح سے مٹھی میں کرنے کے بعد بے فکر ہو چکی تھیں۔

ہمارا گھر اسی کالونی کے سب ہی گھروں کی طرح جدید طرز تعمیر کا شاہکار تھا۔ تین گھر چھوڑ کر میری خالہ کا گھر اسی کالونی میں تھا۔ خالہ کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ احزم سب سے بڑا تھا اور پھر آویز اور ارقام تھے۔ اریبہ سب سے چھوٹی تھی، اور اس وقت فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ احزم بھی گورنمنٹ کے کسی حساس ادارے سے منسلک تھا اور اس وقت اس کی پوسٹنگ اشاک ہوم میں تھی۔ خالہ اور امی کی دلی خواہش اور مشترکہ کوششوں کی وجہ سے میری اور احزم کی پچھلے سال بہت دھوم تھام سے منگنی ہوئی تھی۔ شادی احزم کی چھٹی ختم ہو جانے کی وجہ سے ملتوی کر دی گئی تھی۔

بچپن سے ہی میرا اور احزم کا نام ایک ساتھ لیا جا رہا تھا بقول امی کے نانی نے ہمارا رشتہ بچپن میں ہی طے کر دیا تھا۔ سو اوائل عمری میں میری آنکھوں نے صرف احزم عباس کے خواب دیکھ رکھے تھے۔ اس کی شخصیت بھی تو نظر انداز کی جانے والی نہیں تھی۔ اسی لیے تو خاندان بھر کی لڑکیاں میرے نصیب پر رشک کرتی تھیں۔

منگنی کے بعد میرے اور احزم کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا، جس کا مجھ سے زیادہ رجا کو قائل تھا۔ وہ ایسی روکھی پھکی غیر رومانٹک منگنی کو سرے سے تسلیم نہیں کرتی تھی۔

”کیا ضرورت تھی خود پر منگنی شدہ کا لبیل لگوانے کا“ رجا منہ بنا کر کہتی ”اے افراء! کہیں

تمہارا احزم کسی اور میں انٹرنلڈ تو نہیں“ وہ مجھے بھی اپنی اونگیوں بوگیوں سے دہلا کر رکھ دیتی ”اللہ نہ کرے“ میں سہم کر دل ہی دل میں رجا کے منہ پھٹ انداز کو کوئی۔ براہ راست تو رجا کو میں کچھ بھی کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ ایک تو رجا کا رعب حسن، دوسرا وہ اپنی غلط بات کو بھی منوا کر دم لیتی تھی۔ احزم کے بعد اگر میرا کسی اور کے ساتھ قلبی رشتہ تھا وہ صرف رجا کا تھا۔ اس سے ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا مجھے اور وہ میری واحد دوست تھی۔

فرسٹ ایئر کی کلاسز اسٹارٹ ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ میں گھاس پر پھسکڑا مارے الگ تھلک سی بیٹھی تھی۔ جب اک سریلی کھٹکتی آواز میری سماعتوں میں اترتی۔

”میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں“

”کیوں نہیں“ میں نے اٹھ کر دیکھ کر بوکھلا کر کہا تھا۔ وہ لڑکی اب حجاب اور گاؤن اتار رہی تھی۔ پھر وہ میرے قریب ہی پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی، جبکہ مجھے تو سوائے اس کے دلکش سراپے اور جگر جگر کرتی نیلی کانچ سی آنکھوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی رنگت دودھ جیسی سفید تھی۔ اس قدر سفید اور بے داغ کہ میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ بال بھی اس قدر چمکیلے، لمبے اور لیشی تھے کہ نگاہیں ہٹنے پر مائل نہیں تھیں۔ بڑاؤن بال، نیلی آنکھیں اور متناسب سراپا، وہ تو پوری قیامت تھی، میرا دل اسے دیکھ کر یوں ڈانواں ڈول ہو رہا تھا تو پھر صنف مخالف کا نہ جانے کیا حال ہوتا ہوگا۔

”میں رجا کا سجاد ہوں“ وہ اپنا تعارف کروا رہی تھی، جب میں قدرے بوکھلا کر سیدھی ہوئی۔

”مم..... مجھے افراء ایوب کہتے ہیں“ میں گڑبڑا کر بولی۔

”فرینڈز؟“ وہ اپنا نرم و نازک ہاتھ بڑھا کے بڑی تمکنت سے پوچھ رہی تھی۔

”اوکے، فرینڈز“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ صرف ہماری کلاس کی ہی نہیں بلکہ پورے کالج کی لڑکیوں کی توجہ کا مرکز تھی۔ ہر کوئی رجا کا دوستی کا خواہاں تھا۔ کمپیوٹر سائنس کی لڑکیاں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہمارے ارد گرد طواف کرتی تھیں۔ وہ کالج کی حسین و ذہین لڑکیوں کی پیش قدمی کے باوجود صرف میرے ساتھ دوستی کے رشتے کو استوار رکھنا چاہتی تھی، میرے لیے یہ بات کسی اعزاز سے کم نہیں تھی۔ اور میں رجا کے سحر میں جکڑ چکی تھی۔

اگر رجا میرے برابر نہ چل رہی ہوتی تو مجھے بھی پہلی نظر میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گندی مائل سنہری گلابی رنگت اور کالی آنکھوں اور کالے ہی بالوں کے آبشار کو اک نظر دیکھ کر



ضرور دوبارہ دیکھنے کی چاہ انگڑائیاں لینے لگتی تھی۔ خصوصاً رجاؤ تو میرے بالوں کو کافی حاسدانہ نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔ کئی مرتبہ وہ میرے بالوں کو کھلا دیکھ کر آہیں بھرنے لگتی تھی۔

”ہائے افزاء! بہت جیلس ہوتی ہوں میں تمہارے بال دیکھ کر، کاش یہ میرے ہوتے“، کبھی کہتی ”افزاء! تمہاری آنکھیں کتنی سیاہ ہیں“

اسے اہم بھی بہت چارمٹک محسوس ہوتا تھا حالانکہ پہلی مرتبہ منگنی کی تصویریں دیکھ کر اس نے ناک بھونچ رہا تھا۔

”بس ایویں ساہے، ہائٹ اچھی ہے اور نقش بھی کھڑے کھڑے ہیں۔ تصویر میں بس ٹھیک ہی لگتا ہے، نہ جانے دیکھنے میں کیسا ہے، کچھ کہہ نہیں سکتی۔ البتہ تمہارے ساتھ سوٹ کرے گا“ رجاؤ کے تبصرے میں تنقید اور تعریف کا ایسا الجھاؤ تھا کہ میرے پلے کچھ بھی نہ پڑا، تاہم میں نے صرف اتنا کہا۔

”اگر منگنی کے فنکشن میں تم آجاتی تو احزم سے ملاقات تو ہو جاتی تھی“

”تم میرے بابا جان کو نہیں جانتیں نا، ہٹلر کے جانشین ہیں“ رجاؤ کا گھرانہ روایتی سا تھا۔ والد سرکاری آفیسر تھے، اب ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ گھر پر ان ہی کا حکم چلتا تھا۔ اس کی والدہ سیدھی سادی مذہبی خاتون تھیں۔ رجاؤ کی ایک سال بڑی بہن تھی اور وہ صرف دو ہی بہنیں تھیں۔ اس کی بہن بی اے کے بعد گھرداری میں مصروف ہو چکی تھی۔

ان کے خاندان میں پردے کا رواج تھا۔ کہیں آنے جانے میں سخت پابندی کا سامنا تھا۔ شادی سے پہلے بیٹیوں کو آزادانہ گھومنے کی اجازت نہیں تھی۔ رجاؤ اپنے ماحول سے سخت کبیدہ خاطر تھی۔

میرے کئی مرتبہ ان کے گھر جانے کے باوجود رجاؤ کو ہمارے گھر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی لیے امی بھی تملاتی رہتی تھیں۔

”وہ زیادہ پردے کی بو بو ہے۔ خود نہیں آسکتی، فون کر کے بلوایا جاتا ہے، اور میری احق بیٹی حکم کی تعمیل کرنے میں دو لمحوں کی دیر نہیں لگاتی“

رجاؤ کی بہن رخصتی بھی ہو بہو رجاؤ کی کاپی تھی۔ ویسی ہی خوبصورت اور نازک اندام اور ان کی والدہ تو تھیں ہی بہت اچھی، اپنی بیٹیوں سے قطعاً مختلف، خاموش اور سادہ سی، صوم و صلوٰۃ کی پابند۔

رجاؤ کے والد بھی بہت رعب داب رکھنے والی شخصیت تھے۔ چہرے پر داڑھی، ماتھے پر نماز کا نشان۔

کالج کو خیر باد کہنے کے بعد بھی میری اور رجاؤ کی دوستی قائم دائم تھی اور امی کو اس دوستی سے اللہ واسطے کا بھر تھا۔

اب بھی انہوں نے جس دل سے مجھے رجاؤ کے گھر جانے کی اجازت دی تھی، میرے جوش پر اوس سی پڑ گئی۔ بہر حال امی کو خفا کرنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

”افزی! جانا نہیں ہے، آویز بایک لے کر دھوپ میں کھڑا ہے، اٹھ بھی چکو“ امی نے کمرے میں جھانک کر فحش سے کہا تو میں آہستہ آواز میں بولی۔

”آویز سے کہیں، میں نے پروگرام بدل دیا ہے“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوئیں۔

”آپ جو نہیں چاہتیں“ میں نے روٹی روٹی آواز میں کہا۔

”اٹھ جاؤ، آویز بے چارہ دھوپ میں کھڑا ہے“ نہ جانے خالہ نے کتنی منتوں کے بعد امی کے کہنے پر آویز کو بھیجا تھا، ورنہ اتنی گرمی میں آویز کو کوئی ہیرے جواہرات دینے کا لالچ بھی دیتا تب بھی وہ باہر نکلنے کی کوشش ہرگز نہ کرتا۔

”سورج سوائیز پر ہے، پرندے تک سب گھونسلوں میں منہ دیے بیٹھے ہیں اور ادھر سیلی کی ہڑک ایسی بیدار ہوئی ہے کہ اس جھلستی گرمی میں محترمہ تیار ہو بیٹھی ہیں، ایسی بھی کیا ایرجنسی تھی“ آویز مجھے دیکھ کر ہی تملانے لگا۔

”بکواس کرنے کی ضرورت نہیں، خاموشی سے لے کر جانا ہے تو چلو“ میں نے آویز کے کندھے پر ایک دھپ رسید کی۔

”شرم کرو، ہونے والا دیور ہوں تمہارا“ آویز بلبلا اٹھا۔

”آویز کے بچے“ میں نے غصے سے کہا تو وہ شرارت بھرے لہجے میں بولا۔

”ہاں، میرے دس سال بعد ہونے والے بچوں کی اٹھلاتی، منمناتی تائی صاحبہ؟“

”بکواس نہیں“ ایک دم ہی میرا چہرہ حیا کی لالی سے رنگین ہو گیا تھا۔

”میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے، تم دونوں ضرور جانتا چاہو گی“ میگزین کے اوراق اٹھتے پلٹتے رجا نے بے ساختہ چیخ مار کر مجھے اور رخصتی کو متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

آج چونکہ چھٹی کا دن تھا اور بھیا اور ہمان بھائی کی گاڑیاں گھر میں ہی موجود تھیں، اسی لیے میں لنچ کی تیاری کرنے کے بعد کوفتہ بریانی ایک باؤل میں ڈال کر رجا کو دینے کے بہانے آئی تھی۔ ڈرائیونگ لائسنس بننے کے بعد مارکیٹ تک میں خود ہی چلی جاتی تھی، اور رجا کے گھر آنا بھی آسان ہو گیا تھا۔ مگر یہ اسی وقت ممکن تھا جب گھر میں گاڑی موجود ہوتی۔

”کیوں نہیں“ میں نے وسیع القسمی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے رجا کی بے سرو پا خواہشات کی طویل ترین لسٹ سننے کے لیے خود کو تیار کیا۔

”چلو افراد میں تمہیں نونہ کے فراک دکھاتی ہوں۔ جاتے ہوئے لیجانا“ رخصتی نے میرا بازو تھام کر اٹھانا چاہا۔ مگر میری نظریں رجا کے رنگ بدلتے چہرے پر تھیں، جو کہ کسی بھی طور مجھے رخصتی کے ساتھ جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

رخصتی نے نونہ کے لیے فراک اور کرتے سیے تھے۔ اب وہ اکثر ہی امی اور نونہ بہا کے لیے کچھ نہ کچھ سلائی کر دیتی تھی، جبکہ امی کو یہ لین دین بھی پسند نہیں تھا۔

رخصتی سلائی کڑھائی میں ماہر تھی۔ بہت شان دار سویٹر کے نمونے بناتی تھی۔ اکثر میرے کپڑے بھی سلائی کر دیتی۔ ابھی پچھلے دنوں اس نے امی کو کشمیری کڑھائی والی چادر تیار کر کے تحفہً بھجوائی تھی۔ اس نے ہاؤس وائف ہوم سے مختلف کورسز کر رکھے تھے۔ جن کے عجیب و غریب نام تھے اور اب تو وہ اکثر ہی امی، بھابھی اور بیٹیوں کے لیے کچھ نہ کچھ بنا کر دیتی رہتی تھی اور میں اپنی سادہ لوحی کے باعث ان کی چالاکیوں سے قطعاً بے نیاز رخصتی کے خلوص اور محبت پر فریفتہ ہو چکی تھی۔

در اصل دوستی تو میری صرف رجا کے ساتھ تھی، مگر رخصتی بھی خود بخود اس زنجیر میں شامل ہو گئی تھی اور اب اس تین کی کنون سے امی سخت عاجز تھیں۔ کبھی رخصتی کا فون آرہا ہے تو کبھی رجا کا۔ کبھی رخصتی میری صورت دیکھنے کے لیے ترس جاتی، تو کبھی رجا میرے فراق میں دیوانی ہونے لگتی تھی اور دوسرے ہی لمحے میں سجاد ہاؤس میں موجود ہوتی۔ رجا کے منہ سے نکلی بات کو لوانا تو میرے اختیار میں ہی نہیں تھا اور نہ ہی رجا کو ناں سننے کی عادت تھی۔ وہ کچھ بھی کہہ دیتی، میں نے ہر صورت سر تسلیم خم رکھنا تھا۔ شاید یہ ہی ہماری دوستی کا اصل راز بھی تھا۔ جیسا کہ ابھی

میری فرمانبرداری نے رجا کے تقاضے میں مزید اضافہ کر دیا تھا اور وہ اپنی لمبی دودھیا گردن اکڑائے رخصتی کو استہزاء دیکھ رہی تھی۔ رخصتی مجھے تابعداری سے کارپٹ پر بیٹھتے دیکھ کر خود بھی دانت پیستے ہوئے بیٹھ چکی تھی۔

”اب بکوبھی“ رخصتی نے تملکا کر کہا۔

”آں..... ہاں“ رجا نے چونکنے کی ایکٹنگ کر کے شرارتا ہم دونوں کی طرف دیکھا

اور بولی۔

”میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟“ میگزین کو صوفے پر اچھا کر وہ دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے جوش سے کہنے لگی۔

”ایک شاندار آدمی کا حصول..... جو ہر لحاظ سے مکمل اور بہترین ہو۔ جسے پہلی نظر میں دیکھتے ہی لمحہ بھر کو میرا دل دھڑکنا بھول جائے۔ جب وہ میرے ساتھ چلے تو لوگ رک رک کر اور پلٹ پلٹ کر دیکھیں، جس میں کوئی بھی کمی نہ ہو، اور لوگوں کی رشک بھری نظریں بس ہم دونوں پر ٹھہر جائیں، اور“

”بس، بس خاموش ہو جاؤ“ رخصتی نے بھنا کر ہاتھ جوڑے۔ میں ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھی۔ رجا ہم دونوں کو ہنسا دیکھ کر غصے سے اٹھ کر جا چکی تھی۔

”یہ تمہارے ہاتھ پر کیا ہوا ہے؟“ رخصتی کی نظریں میرے ہاتھ پر ابھرے پھپھو لے پر پڑیں تو وہ حیرانی اور ہمدردی سے پوچھنے لگی۔

”جل گیا تھا“ میں نے لا پرواہی سے بتایا۔

”اکیسے؟“

”آئل گر گیا تھا۔ نہا کے لیے چپس بنا رہی تھی“ میری بے نیازی میں رتی بھر فرق نہیں آیا تھا، جبکہ رخصتی مجھے خفگی سے ڈانٹنے لگی۔

”کچھ لگایا ہے زخم پر؟“

”برنال لگائی تھی“

”کچھ دودھ میں ہاتھ کو ڈپ کرنا تھا۔ یہ آبلہ تو نہ پڑتا“

”یہ معمولی سا پھپھولا دیکھ کر اس کی ہمدردی اور فکر مندی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔“

”یہ تو معمولی سا ہے۔ ایک دفعہ گرم دودھ میرے پاؤں پر گر گیا تھا“ میں میگزین،

اخبار اور رسائل اکٹھے کرتے ہوئے رخصی کو بتانے لگی تھی۔ بے ترتیبی سے مجھے نفرت تھی۔ گندگی سے جی متلانے لگتا تھا، مگر بد قسمتی سے رجاہ قطعاً نفاست پسند واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس کا کمرہ بھی بے ترتیبی اور پھو ہڑپن کا نمونہ تھا۔ نوکر، چاکر موجود تھے اور اپنی مرضی سے کام کر کے چلے جاتے تھے۔ گھر میں کہیں بھی نفاست یا ترتیب نہیں تھی۔

بچن کا کام آئی خود کرتی تھیں۔ کھانا پکانا ان ہی کی ذمہ داری تھا۔ میں نے اتنے عرصے کے دوران ایک دفع بھی رجاہ یا رخصی کو بچن میں چائے بناتے تک نہیں دیکھا تھا۔ رجاہ کہتی تھی، وہ دنیا میں صرف آرام کرنے کے لیے آئی ہے، اور وہ اپنے قول کو اچھی طرح نبھا رہی تھی۔

”چائے پیو گی افزاء؟“ کچھ دیر بعد رجاہ ناراضی بھلائے لاؤنج میں جھانک رہی تھی۔

”اگر تم خود بناؤ گی تو پیوں گی“

”جو شامہہ پینے سے بہتر ہے، ہم امو کے ہاتھ سے بنی چائے پی لیں“ رخصی نے منہ بنا کر کہا۔

”شوق سے پیو۔ مجھ سے تو بچن میں جھانکا تک نہیں جاتا“ وہ اسے سی لگائے صوفے پر ڈھسے چکی تھی۔

”میں اب چلتی ہوں“ گھڑی کی طرف دیکھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے، کبوتر سب اڑ گئے۔

”امی کا غصہ سوائیزے پر پہنچا ہو گا“ میں گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر کی طرف بھاگی تھی، رخصی اور رجاہ مجھے پکارتی رہ گئیں ”کھانا کھاتی جاؤ، امو نے تمہارے لیے اتنا اہتمام کیا ہے“ رخصی چیختی رہ گئی تھی۔ میں سنی ان سنی کرتی بیرونی دروازہ کھولنے کے چکر میں کسی بلند قامت شخص سے ٹکرانے کے بعد زمین بوس ہو چکی تھی۔

”ہائے میری ناک“ وہ جو کوئی بھی تھا، میرے چیخنے چلانے اور غصہ کرنے سے پہلے دہائی دینے لگا تھا۔

”توڑ دی..... میری اونچی ناک توڑ دی۔ اب سرجری کروانا پڑے گی، اتنا خرچہ، اتنا نقصان۔

”کیا واقعی آپ کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے“ میں لمحے کے ہر اوروں حصے میں تمام صورت حال سمجھ کر حسب معمول بوکھلا چکی تھی۔

”میں کیا ناک کر رہا ہوں“ وہ صدمے کی شدت سے دہلی آواز میں چیخا۔

”نہیں، میرا کہنے کا مطلب یہ نہیں“ میں اور بھی بوکھلائی تھی۔

”تو پھر کیا مطلب ہے؟“ بہت دلچسپی سے پوچھا گیا تھا، اگر میں اس قدر گھبرانہ چکی ہوتی تو مقابل کی آنکھوں میں لپکتی شرارت کو بخوبی سمجھ جاتی۔

”آپ کو ہسپتال لے چلوں، گاڑی ہے میرے پاس“ مجھے اس سے بہتر حل کوئی نہیں لگا تھا۔ اس اچھلتے، کودتے دہائیاں دیتے اور ہائے وائے کرتے نوجوان کو یقیناً گہری چوٹ لگی تھی، مگر چوٹ لگی کس چیز سے تھی؟ میں نے سوچا، غور کیا اور پھر گھور کر اس ایکٹنگ کرتے اجنبی کو دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا سر اس کے کندھے سے لگا ہے، جس کے نتیجے میں جھکا کھا کر میں ہی زمین پر گری بھی تھی اور ناک بہت میزمرہ پکڑ کر چلانے لگے تھے۔

”میں ڈاکٹر ہوں، دکھائیے مجھے اپنی ناک“ میں نے خواہ مخواہ رعب لہجے میں بھر کر کہا۔

”آپ ڈاکٹر ہیں، میں نہیں مانتا“

”آپ بے شک شوق سے نہ مانیے، البتہ ناک کی ٹوٹی ہڈی کا معائنہ تو میں ضرور کروں گی“

میں نے خالصتاً پروفیشنل ڈاکٹرز کی طرح آنکھیں سمجھا پھرا کر اس اجنبی کے دماغ کو گھمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے اس بلاوجہ کے ناک کی کچھ تو سزا ملنی چاہئے تھی۔

”اتنی لمبی ناک کا معائنہ آپ کیسے کریں گی، میں خود ہی کسی حکیم سے دوا لے لوں گا“

بڑی رنجیدگی سے کہا گیا تھا۔

”اونہ، جھوٹا فراڈیا، ناک کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی چیک کروالینا، لگتا ہے قریب کی نظر کمزور ہو چکی ہے، ابے تھے نیل کی طرح ٹکراتے پھر رہے ہو“ میں اچھا خاصا تانڈ کر گاڑی کی طرف بڑھ آئی تھی۔

”حکیم رحمت اللہ صرف ہڈیاں جوڑتا ہے، نظر چیک نہیں کرتا“ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑا بیگ کندھے پر ڈالتا مسکرایا تھا ”بائی داوے آپ افزاء ہیں نا“

”تمہیں میرا نام کس نے بتایا ہے؟“ میں جارحانہ تیور لیے پلٹ آئی تھی۔

”رجاء نے“ وہ ایک دفعہ پھر مسکرایا۔

”رجاء نے“ میں ابھی ”تم رجاء کے رشتے میں کیا لگتے ہو“ میں نے مشکوک نظروں

سے اسے گھورا۔

”میں رجاہ کا فیانی ہوں، اس کی پھوپھو کا بیٹا۔ جہلم سے آیا ہوں، میرا نام اوصاف ہے۔“  
”تم رجاہ کے فیانی ہو“ میں گویا حیران پریشان ہی تو رہ گئی تھی۔

☆☆☆

”تم اوصاف کی مگتیر ہو، اور تم نے مجھ سے اتنی بڑی بات کیوں چھپائی؟“ میں فون پر رجاہ پر برس رہی تھی۔

”میں مگتیر ہوں، اسی گاؤں دی، بدھو اور بالکل عام سے اوصاف کی، ہرگز نہیں، کبھی نہیں، مکینہ جھوٹ بول رہا تھا، ایسا کچھ بھی نہیں“ رجاہ تو آگ بگولا ہو گئی تھی۔

”مگر وہ تو یہ ہی کچھ بتا رہا تھا۔ مجھے تم پر شدید غصہ آیا، اپنی زندگی کی اتنی اہم بات تم نے مجھ سے چھپائی تھی۔ میرا غصہ کرنا تو ضروری تھا“ رجاہ کے بتانے پر میں ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔

”پھوپھو کی کی بڑی خواہش ہے مجھے بہو بنانے کی اور یہ اوصاف بھی بڑے اونچے خواب دیکھ رہا ہے۔ اونہہ، لوگ اپنی صورت آئینے میں نہیں دیکھتے“ رجاہ کے لہجے میں غرور بول رہا تھا، نہ جانے مجھے کیوں بہت برا لگا۔

”اوصاف اتنا بھی برا نہیں“

”کیا خوبی ہے اس میں، شکل تو دیکھ لی ہے تم نے۔ اس لیے میں نے امو کو دو ٹوک جواب دے دیا ہے“

”کیسا جواب؟“ میں حیران ہوئی۔

”یہ ہی کہ میں کم از کم اوصاف سے شادی نہیں نہیں کروں گی“ وہ نڈر انداز میں بولی۔  
”تو پھر امونے کیا کہا؟“ میں نے تجسس دبا کر پوچھا۔

”انہوں نے کیا کہنا ہے، فیصلہ تو بہر حال بابا ہی کریں گے“ رجاہ نے ناگواری سے کہا ”مگر میں اوصاف سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔ حور کے پہلو میں لنگور والی مثال فٹ آتی ہے اونہہ“ وہ بڑے غرور بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”مجھے تو اوصاف میں کوئی برائی محسوس نہیں ہوتی“ میں دل ہی دل میں استغفر اللہ

پڑھتے ہوئے دبی آواز میں بولی ”مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے، وہ سچ جج تم میں انٹرنلڈ ہے“

”صرف انٹرنلڈ نہیں، محبت کا دعویٰ کرتا ہے“ رجاہ نے مسخرانہ ہنسی میں گویا بات اڑادی۔

”تو تمہیں ایک مخلص شخص کی قدر کرنی چاہئے“ میں سمجھانے کا فریضہ انجام دینے کا عہد کر چکی تھی، مگر جہلم نے کچھ بھی نہ سمجھنے کا شاید پختہ ارادہ کر رکھا تھا۔

”تم ہی اس مخلص شخص کی قدر کر لو، ایسا کرتے ہیں فیانی بدل لیتے ہیں، میں تمہارا لے لیتی ہوں، تم اوصاف کو لے لو۔“

”اللہ نہ کرے“ میں نے دہل کر سوچا۔ مجھے احزم سے محبت تھی۔ میری تو کوئی رات اسے سوچے بغیر اور اس کے تصور سے باتیں کئے بغیر نہیں گزرتی تھی اور اس رجاہ نے کیسے سفاکانہ انداز میں میرے دل کو کانٹوں پر گھسیٹ دیا تھا۔

”سوچ سمجھ کر بولا کر رجا!“ میں نے ناگواری سے کہا۔ میرے لہجے میں چھپی نا پسندیدگی اور غصے کو سمجھ کر وہ ہنسنے لگی تھی۔

”مذاق کر رہی تھی، تم تو خواہ مخواہ سیریس ہو جاتی ہو“ وہ میرا موڈ بحال کرنے کے لیے ادھر ادھر کی ہانکنے لگی تھی، مگر میرا سارا دھیان لاؤنج سے آتی آوازوں کی طرف تھا۔

”میرا خیال ہے خالہ آئی ہیں، میں رات کو فارغ ہو کر فون کروں گی“

”کون سی خالہ؟ احزم کی امی!“ رجاہ نے بے ساختہ پوچھا۔

”ہاں“ ارقام دو چھلانگوں میں ہی مجھ تک پہنچ چکا تھا۔

”تم شرط ہار چکے ہو، نکال دو ہزار روپے“ آویز نے بھی دوپل میں ارقام تک پہنچنے کے بعد اس کی گردن دبوچ کر کہا۔

”ابھی پوچھ تو لینے دو افراء سے، یہ بات کس سے کر رہی ہے“ ارقام نے گردن چھڑاتے ہوئے دہائی دی۔

”پوچھنے کی زحمت کیوں گوارا کروں، میں جانتا ہوں، یہ بھلا رجاہ کے علاوہ کسی اور سے بات کر سکتی ہے“ آویز نے میرے ہاتھ سے ریسیور جھپٹ کر کریڈل پر پٹخا۔

”کبھی ہمارے بھائی کو فون کھڑکا لیا کرو“ ارقام شرط ہارنے کے بعد اب آویز کا دھیان بٹانا چاہ رہا تھا۔

”ہمارے بھائی سے کیوں بات کرے رجاہ صاحبہ کسی اور طرف دھیان دینے دیں اسے تو احزم کا خیال آئے نا“

”کبھی اپنے بھائی کو بھی ایسے مشوروں سے نواز دیا کرو“ میں جل بھن کر بولی۔

”تم دونوں دوسری طرف کی خاموشی کو کیا معافی پہناؤ گے“ میرے لہجے میں ٹھکا دینے والی سنجیدگی تھی ”کیا اہم اس رشتے سے خوش ہے؟“

”تم نے کیا سمجھ رکھا ہے، اتنا بھی وہ فرمان بردار نہیں کہ امی کی پسند پر سر جھکا دیتا، ظاہر ہے اس سے پوچھ کر ہی اتنا بڑا فیصلہ کیا گیا ہے“ آویز نے ہلکے ہلکے انداز میں کہا۔

”اہم نے بھی تو کبھی فون کرنا گوارا نہیں کیا، کبھی امی کا حال احوال بھی نہیں پوچھا“ ٹکڑھ میرے لبوں پر مچل ہی گیا تھا۔

”اجحق جو ہوا، اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو روزانہ ہی خالہ کو اک نظر دیکھنے کے بہانے کشاں کشاں چلا آتا“ آویز میرے جھانپڑ سے بچنے کے لیے قدرے دور ہٹ کر بولا تھا، ادھر ارقام خواہ مخواہ تملانے لگا۔

”تم ہی کیوں ہوتے، مجھ میں کیا کمی ہے۔ خالہ کی قریب کی نظر کمزور ہے، ورنہ میرے جیسا داماد تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا“ ارقام کالر کھڑے کر نیچے چکر میں میرے جوتے سے اپنی کمر سکوا بیٹھا تھا۔

”ہائے، ہائے، تم تو بہن ہو، بھابھی ہو افزاء!“ دونوں پینتر ابد لے خوشامد پر اتر آئے تھے اور ادھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

”اللہ جھوٹ نہ بلوائے یہ رجاہ کا ہی فون ہے“ آویز نے وثوق سے کہا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے رہیسیور اٹھایا۔ دوسری طرف واقعی رجاہ تھی۔

”ارقام اور آویز چلے گئے ہیں؟“

”نہیں، ایسے کہاں جائیں گے، وہ تو لچ اور ڈنر کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں“

”رجاہ سے کہو، ہماری روٹیاں گلنے کی ضرورت نہیں“ آویز سے خاموش رہنا محال تھا اور یقیناً رجاہ بھی دوسری طرف سن رہی تھی۔

”اتنا بڑا بہتان“ رجاہ چیچی ”ذرا آویز کو فون پکڑاؤ“

”کیا مطلب؟“ میں تو حیران ہی رہ گئی تھی ”تم کسی اجنبی اور غیر محرم سے بات کرو گی“ میں اس کے گھر کے ماحول سے اچھی طرح واقف تھی۔

”چھوٹی موٹی بے ایمانیاں زندگی کا حصہ ہوتی ہیں؟“ رجاہ کے انداز میں لاپرواہی تھی، ادھر آویز چیخ رہا تھا۔

”اس کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں، منگنی اور شادی کے درمیان والا پریڈ تو بڑا سہانا ہوتا ہے، اور وہ اتنے اہم چانس کو ضائع کر رہا ہے، نہ بیچ میں کوئی رقیب ہے، نہ ظالم سانج“ ارقام تاسف سے کہنے لگا۔

”تم باتوں میں الجھا کر مجھے موضوع سے ہٹانے کی کوشش نہ کرو، نکالو دو ہزار روپے، تم شرط ہار چکے ہو“ آویز نے ایک مرتبہ پھر اس کی گردن دیوچ لی تھی۔

”کیسی شرط؟“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

”یہ آویز کہہ رہا تھا، خالہ کے گھر جانے کا کوئی فائدہ نہیں، وزیلہ بھابھی نے اپنی الگ ڈیڑھ انچ کی مسجد بنائی ہوگی اور افزاء کو رجاہ کی الفت اور اس دوستی نے کسی قابل نہیں چھوڑا۔ یا تو فون سے چپکی رہتی ہے یا رجاہ کے درشن کرنے اس کے سر پر سوار ہو جاتی ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ افزاء اس وقت بھی رجاہ صاحبہ سے ٹیلی فون پر گفتگو فرما رہی ہوں گی۔ بس میں نے بھی نہ جانے کس رو میں شرط لگانے کا کہہ دیا تھا۔ شاید مجھے یقین تھا کہ تم کچن میں معروف ہوگی، مگر تم نے بھی مجھے شکست سے دو چار کرنا تھا، کہہ دو، تم رجاہ سے بات نہیں کر رہی تھیں۔ ورنہ اس دفعہ کی پا کٹ منی سیدھی آویز عباس کے پیٹ میں اتر جائے گی“ ارقام قالین پر لوٹیں لگا تا دہائیاں دے رہا تھا۔

”مگر میں تو رجاہ سے ہی بات کر رہی تھی۔ بے چاری کو رات سے قلو ہے“ میرے لہجے میں رجاہ کے لیے فکر مند تھی۔

”کبھی میرے بھائی کی طبیعت کا بھی پوچھ لیا کرو، پردیس میں نہ جانے کس حال میں ہوگا، اور الکوٹی منگیتر صاحبہ کو سنبلی کی فکر کے علاوہ اور کسی کی کوئی فکر نہیں، چاہے تو فیائسی ہاتھوں سے ہی نکل جائے۔ کسی میم کے ہتھے چھڑ جائے یا کوئی افریقن، امریکن لے اڑے“ ارقام بھی جوش میں ڈرا زیادہ ہی کھلنے لگتا تھا۔ ”اللہ نہ کرے“ میں دلیل کر بے ساختہ بولی تھی اور ان دونوں نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کی طرف آنکھیں منکا منکا کر دیکھنا شروع کر دیا۔

”او..... ہو تو بات دراصل یہ ہے“ ان دونوں نے اب دو گھنٹے تو میرا ریکارڈ لگاتا ہی تھا۔ میں نے اک ٹھنڈی آہ بھری، اب ان منچلے سے شریر کز کو کیا بتاتی کہ پہل عورت کی طرف سے ہو تو عورت اپنے مقام اور سطح سے نیچے آ جاتی ہے۔

”ہونے والی بھابھی! تم نے تو دل خوش کر دیا ہے“ آویز اور ارقام باقاعدہ جھومنے لگے

”بھئی اہم تو خوش قسمت لوگوں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے، ہم دونوں تو خواہ مخواہ جلنے لگے ہیں“

امی نے حلیم بٹائی تو مجھے گاجریں کاٹتے دیکھ کر کہنے لگیں۔

”افزاء! تم کپڑے بدل کر آؤ“

”کیوں امی؟ کہیں جانا ہے؟“ میں اپنے میلے کپڑوں سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔

”رجاء کو حلیم دے آؤ، اس کی امی کو بہت پسند ہے“ وہ دُش میں حلیم ڈال کر ادراک اور

ہرے دھنیا سے گارٹنگ کرتے ہوئے بولیں۔

”کس کیساتھ جاؤں گی؟“ میں نے وزیلہ بھابی کی معنی خیز نظروں کو نظر انداز کرتے

ہوئے پوچھا۔

”آویز سے کہتی ہوں، ہمایوں کی گاڑی گھر میں ہے بائیک کے بجائے گاڑی میں

چلی جانا“ شام کے سائے پھیل چکے تھے شاید، اسی لیے وہ مجھے تنہا نہیں بھیجنا چاہتی تھیں۔ امی

خالہ کے گھر شاید آویز کو بلانے چلی گئی تھیں۔ واپس آئیں تو آویز بھی ان کے ساتھ تھا۔ وزیلہ

بھابی نے نہ جانے کس دل سے گاڑی کی چابی لا کر آویز کو تھمائی تھی۔ میں اسکارف لے کر دُش

اٹھائے تیز قدموں سے چلتی ہوئی گاڑی تک آئی۔

”افزاء یار! یہ خالہ کو کیا ہو گیا ہے، یہ بھی رجاء کے سحر میں گرفتار ہو گئی ہیں۔ آخر اس

نے کیا گھول کر پلا دیا ہے سب کو“ آویز نے تاسف سے پہلاٹرن لے کر کہا۔

”رجاء نے، رُخشی سے سحر پھونک دیا ہے امی، ہمان بھائی کے لیے رُخشی کو اوکے کر چکی

ہیں“ میں نے آویز کی حیران آنکھوں میں جھانک کر بتایا۔

”دوستی تک تو ٹھیک تھا، یہ رشتہ داری کی مِخ ضرور لگانی تھی“ آویز نے ناگواری سے کہا۔

”یہ تم کیوں پھا پھا کنٹینوں کی طرح ٹانگ اڑانے کی کوشش کر رہے ہو“

”کنٹیناں تو تمہاری یہ دونوں سہیلیاں لگتی ہیں“ گاڑی سجاد ہاؤس کے گیٹ کے

سامنے رک چکی تھی۔

”خبردار، جو فضول بکواس کی تو“ میں پیالہ پکڑے فرنٹ ڈور کھول کر باہر نکل آئی۔

”اتنا بیٹھا بھی نہیں ہوتا چاہئے کہ مقابل سالم ہی نگل جائے“ آویز کے لہجے میں

بے پناہ سنجیدگی تھی ”بہر حال، میں سبیں گاڑی میں بیٹھا ہوں، تم ذرا جلدی باہر تشریف لے آنا“

”ہوں، ٹھیک ہے“ میں داخلی دروازے سے اندر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

”میں اتنی پاکیزہ اور باپردہ خاتون سے بات نہیں کر سکتا“ رجاء تک آویز کی آواز

با آسانی پہنچ رہی تھی۔

”پاکیزہ اور باپردہ خاتون خود تم سے بات کرنے کی خواہشمند ہے“ میرے لہجے میں

نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کی آمیزش ہو گئی تھی۔

”کاش اتنے ٹکٹ سے کزنز کے درمیان میں بھی ہوتی“ رجاء کی فونڈگی میں بے

شمار کاش تھے۔

”تم بھی نارجا!“ میں ابھی فون پر بات کر رہی تھی۔ جب ارقام نے چپکے سے پلگ

نکال دیا، ٹوٹوں کی مخصوص آواز سن کر میں نے دانت پیستے ہوئے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا تھا۔

☆☆☆

”امی! رجاء نے بہت اصرار کیا ہے کہ آپ بھی دعوت میں شرکت کریں“ میں ہمیشہ

کی طرح امی سے اپنی ضد منوالینا چاہتی تھی۔ صبح رجاء نے کال کر کے عوت میں شامل ہونے کی

دعوت دی تھی۔ مگر امی ٹال مٹول سے کام لے رہی تھیں۔ مگر جب رجاء کی امو کا فون آیا تو امی کو

ماننا ہی پڑا۔ امی کے ہامی بھرتے ہی میں قلائچیں بھرتی اپنے کمرے میں تیار ہونے کی غرض سے

بھاگی۔ امی کا موڈ قدرے آف تھا، شاید اس لیے کہ میری ان دیکھی سہیلی کو وہ قطعاً پسند نہیں کرتی

تھیں۔ مگر جب رجاء کی امو سے امی کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے رُخشی اور رجاء کو دیکھا تو ان

کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی صاف دکھائی دیے گئی تھی۔ خصوصاً رجاء کی امو، روبینہ آنٹی تو

امی کی پسندیدہ ہستیوں میں شامل ہو گئی تھیں۔ خاموش، سنجیدہ اور بے انتہا سادہ سی روبینہ آنٹی اور

ان کی نازک اندام بیٹیوں کو دیکھ کر امی لُختہ بھر کو خاموش رہ گئی تھیں۔ گویا انہیں یقین نہیں تھا کہ رجاء

کا تعلق کسی وضع دار گھرانے سے ہوگا۔ اب امی کو رجاء کے ہمارے گھر نہ آنے اور آزادانہ گھومنے

پھرنے پر گلے بین کی وجوہات کا پتا چل گیا تھا۔ تب ہی امی بہت مسروری واپس آئی تھیں۔

”آج کل کی لڑکیاں شتر بے مہار پھرتی ہیں۔ سجاد صاحب اور روبینہ نے بچیوں کی

بہت اچھی تربیت کی ہے“ امی، رجاء کے گھرانے کی تعریفوں میں کچھ زیادہ ہی پر جوش ہو رہی

تھیں۔ تب ہی ہمان بھائی گلا کھٹکار کر امی کو شرارت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ امی کو نہ

صرف رجاء بلکہ رُخشی بھی بہت پسند آئی تھی۔ اور وہ رُخشی کے بارے میں کچھ اور سوچ رہی تھیں۔

جبکہ میری تو دلی تمنا پوری ہونے والی تھی۔ اسی لیے میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اتوار کے دن

خالہ کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اور ان کی کام والی بھی طویل بیماری کے باعث ان دنوں لمبی چھٹی پر تھی اور یہ سب گھر سنبھالنا محال تھا۔ تب ہی آویز مجھے لینے آ گیا تھا۔

”کپڑوں کا ڈھیر پڑا ہے، روڑا نہ پاپے اور دلیہ کھا کر یونیورسٹی چلا جاتا ہوں“  
”کاشفہ نے بتایا کیوں نہیں، میں خود آجاتی، افزاء کو بھیج دیتی“ امی تو خالہ کی بیماری کا سن کر رونے لگی تھیں، حالانکہ انہیں صرف موسمی بخار تھا۔

”اٹھو افزاء! بیگ میں کپڑے رکھ لو، تمہیں خالہ کے پاس رہنا ہے، چار، پانچ جوڑے رکھ لو“ امی نے فوراً آرڈر پاس کیا تھا۔ میں نے بھی حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگائی تھی۔ آویز نے میرا بیگ اٹھالیا تھا اور ہم دونوں واک کرتے ہوئے سات، آٹھ منٹ میں گھر آچکے تھے۔

لاؤنج اور کچن میں پھیلے بکھیرے کو دیکھ کر میرا دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔ خالہ بخار میں پھنک رہی تھیں۔ اریہ گھبراہٹ بولکھائی ان کا سر دبانے میں مصروف تھی، مجھے دیکھ کر آنسو بہانے لگی۔

”افزاء! آپ! شکر ہے آپ آگئی ہیں۔ امی اب ٹھیک ہو جائیں گی“ میں خالہ کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ پھر ان سے باتیں کرتے ہوئے ان کا سر دباتے ہوئے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔

خالہ پر غنودگی طاری ہو گئی تو میں بھی اٹھ کر باہر آگئی۔ پہلے لاؤنج کی حالت بہتر کی، پھر کچن کا رخ کیا۔ اریہ برتنوں کے ڈھیر سے الجھ رہی تھی۔ اس کے فائل ایگزیکٹر بھی ہو رہے تھے میں نے پہلے اسے زبردستی کچن میں سے نکال کر کتاب تھائی اور پھر کمر کس کر دل جمعی سے جت گئی۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے خالہ کے لیے گریوی بنا کر اریہ کے ہاتھ اندر بھجوائی، پھر کھانا بنانے کے لیے گوشت فریزر میں سے نکالا۔ وقت کی قلت تھی سو میں نے بریانی اور رائتہ بنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

کچن سے فارغ ہو کر میں چائے کاگ پکڑے لاؤنج میں آگئی تھی۔ خالہ ابھی تک سو رہی تھیں میں ان کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگی، تب ہی فون پر میری نگاہ پڑی تو رجاء کے خیال نے بے چین کر دیا۔

”کہاں مر گئی تھیں افزاء!“ میری توقع کے عین مطابق وہ پھٹ پڑی ”صبح سے دس فون کر چکی ہوں“

”سوری رجاء! میں بغیر بتائے آگئی ہوں“ میں نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا تو وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

”خد متیں کر کر کے اتنا عادی بنا دو انہیں کہ تمہیں شادی کے بعد چین سے بیٹھے نہیں دیں گے“

”تمہیں تو گویا سسرالیوں کے رویوں کا بڑا ہی تجربہ ہے“ میں نے اس کی تلخ گفتگو کو ہنسی میں اڑا دیا۔

”زیادہ سر پر مت چڑھاؤ انہیں“ وہ مجھے اپنے نیک مشوروں سے نواز رہی تھی ”یہ ساس ٹاپ عورتیں بڑی ہی مکار ہوتی ہیں“

”میری خالہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں“  
”اونہہ چار دن کی چاندنی ہے ابھی تم بہو بن کر جو نہیں آئی ہو۔ بہو بنتے ہی دیکھنا خالہ کے رنگ“ وہ مسلسل مجھے دہلا رہی تھی۔

”تم کوئی اور بات نہیں کر سکتیں۔“ میں سخت کبیدہ خاطر ہونے لگی تھی۔  
”ہاں، تمہیں بتانا تھا کہ میری پھوپھو ہمارے گھر دھرنہ دے بیٹھی ہیں“ رجاء نے غصے سے گویا دانستہ پس کر بتایا۔

”اوصاف کی امی“  
”ہاں“  
”مگر کیوں؟“ میں حیران ہوئی۔

”بابا سے میرے رشتے کے لیے اصرار کر رہی ہیں“ رجاء نے گویا انگارے چبائے۔  
”یہ تو اچھی بات ہے“ میں نے شعلوں کو ہوا دی تھی۔

”بکومت“ وہ تملانی ”یہ اوصاف کو دیکھو، کتنے اونچے خواب دیکھتا ہے، اونہہ منہ نہ تھا“  
”رجاء! سوچ سمجھ کر بولا کرو“ میں نے دہل کر دہائی دی ”اگر انکل نے تمہاری شادی اوصاف سے طے کر دی تو پھر“ نہ جانے کیوں میں اس کی ناپسندیدگی کی انتہا دیکھنا چاہتی تھی۔

”تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گی“ وہ سفاکی سے بولی۔  
”اللہ نہ کرے“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”یہ بتاؤ، کب چکر لگاؤ گی؟“ رجاء نے موضوع بدل دیا تھا۔

”ابھی نہیں آسکتی“ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”کیوں؟“ وہ فوراً ناراض ہو گئی تھی۔

”اریہہ کے امتحان ہو رہے ہیں، جبکہ آویز کو یونیورسٹی اور ارقام کو کالج جانا ہوتا ہے۔ ابھی میں نے مشین لگا کر کپڑے دھونے ہیں۔ استری کرنے والے کپڑوں کا ڈھیر بھی پڑا ہے“ میں نے رجاء کو اپنے کاموں کی تفصیل بتائی تو وہ چکرا کر رہ گئی۔

”تم اتنا کچھ کرو گی۔ دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا، کوئی ضرورت نہیں اپنی انرجی ضائع کرنے کی“

”کسی پر احسان تھوڑی ہے، میری خالہ کا گھر ہے اور وہ اس وقت بیمار ہیں اپنوں کا فائدہ ہی کیا ہوا جب تکلیف اور پریشانی میں کام نہ آئیں تو“

”ایسی ہمدردی مجھ سے تو نہیں ہوتی“ وہ تنک کر کہہ رہی تھی ”اگر احزم ہوتا تو پھر بھی کوئی بات تھی، کم از کم وہ تمہیں سراہتا تو سہی۔ بغیر کسی ستائش، حسن کارکردگی کا تمغہ لینے کے لیے تم جیسے احمق ہی ہلکان ہوتے ہیں“

”میں احمق ہی ٹھیک ہوں“ اب برامانے کی باری میری تھی۔ فون رکھ کر میں نے خالہ کے کمرے میں جھانکا تو وہ اٹھ چکی تھیں۔ میں سہارا دے کر انہیں باہر لے آئی تھی۔

”ارقام ابھی تک نہیں آیا“ وہ صوفے پر بیٹھ کر نقابہت بھرے انداز میں بولیں۔  
 ”آگیا ہوں والدہ حضور!“ وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر تھا۔ گرمی سے تھمتا چہرہ

لیے، پسینے سے شرابور، مجھے دیکھ کر چیخ پڑا۔  
 ”میں بھی کہوں، ہمارے گھر میں اس قدر اجالا کیوں ہے“

”لوڈ شیڈنگ کے باوجود“ آویز جزیئر کو چیک کر کے آیا تھا۔  
 ”ابھی لائٹ نہیں آئی“ میں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ میرا ارادہ مشین

لگانے کا تھا۔  
 ”لائٹ کبھی آئی بھی ہے“ ارقام صوفے پر ڈھے گیا تھا۔ میں اسکوائش کا جگ

اٹھالائی۔

”جیو میری پیاری افزاء! آئی!“ اریہہ اور ارقام جگ پر جھپٹ پڑے تھے۔

”نندیدو! آرام سے، کیوں مرے جارہے ہو“ آویز نے تاسف سے کہا۔

”پکایا کیا ہے؟“ ارقام جگ کو منہ لگائے پوچھ رہا تھا۔  
 ”چکن بریانی اور سویٹ میں رس ملائی، آج کوئی بھی فرمائش مت کرنا، صبح الگ سے

تمہارے لیے بنا دوں گی“ میں نے پیش بندی کے طور پر ہاتھ اٹھا کر کہا۔  
 ”میری فرمائش تو بڑی آسان سی ہے“ ارقام نے منہ لٹکالیا۔

”ہونہ! اس نے جلیبی کی پڈنگ کھائی ہے، اس کاٹھیٹ بس یہیں تک ہے“ اریہہ کو اسے چڑانے کا موقع مل گیا تھا۔

”اور خود تم شور بے میں ڈبکیاں لگا کر بڑیوں کو ڈھونڈتی رہتی ہو۔ بڑیوں کا پلاؤ دیکھ کر رال ٹپکنے لگتی ہے“ ارقام نے بھی حساب برابر کر دیا۔

”جہاں بیٹھتے ہیں، چونچیں لڑانا شروع کر دیتے ہیں“ خالہ ان دونوں کی گولہ باری سے سخت عاجز تھیں۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ ان تینوں نے بچوں کو مات کر رکھا تھا، اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ خالہ بے چاری کو کیسے ان لوگوں نے گھن چکر بنا رکھا ہوگا ارقام بیڑھیوں کے اوپر سے چلا رہا تھا۔

”افزاء! افزاء! میری شرٹ پر لیس کردو جلدی اوپر آؤ“  
 ”میں برز بند کر کے اوپر کی طرف بھاگی تھی، جب بیڑھیاں اترتے آویز نے مجھے

بازو سے پکڑا اور نیچے گھسیٹ لایا“ پہلے مجھے ناشتا بنادو“  
 ”ہزاروں سال جیو ہماری افزاء پیاری افزاء! اتنا مزے دار ناشتہ کروانے کا شکریہ“

ان دونوں نے بہ یک زبان کہا اور پھر اٹھ کر باہر کی طرف بھاگے۔ اریہہ کی کالج دین بھی آگئی تھی، سو وہ انڈہ اور بریڈ پیس اٹھا کر بھائیوں سے پہلے ہی نکل گئی ان کے جانے کے بعد

ہر طرف خاموشی پھیل گئی تھی۔ جتنی رونق تھی، اسی قدر پھیلا سناٹا میں گھبرا کر اپنا اور خالہ کا ناشتہ لے کر ان کے کمرے میں آگئی۔

بہت تنگ کیا ہوگا ان افلاطون کے جان نشینوں نے میری بیٹی کو“ خالہ نے محبت سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”ارے نہیں“ میں نے لا پرواہی سے کہا ”آپ ناشتہ کر لیں، پھر دوادیتی ہوں آپ کو“



تھی ”کتنا مزہ آئے گا آپ! اعرصہ ہوا، ہمارے خاندانوں میں کوئی شادی نہیں ہوئی“  
”ہاں بھائی کی شادی نہ کر دیں“ میں نے سیل فون اٹھا کر آویز کا نمبر پریس کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں، پھر تو اور بھی مزہ آئے گا“ اس کی آنکھوں میں بچوں جیسا شوق اور اشتیاق تھا۔ رنگ برنگے کپڑے پہننے کی خوشی، رونق اور ہنگامے اس عمر میں اس طرح بے تاب رکھتے ہیں۔  
”آپ نے ہمان بھائی کے لیے لڑکی دیکھ لی ہے؟“ اریبہ پوچھ رہی تھی، جبکہ میں آویز کے کال ریسیو کرنے کے بعد بولی ”جلیبی لیتے آنا، ارقام کے لیے پڈنگ بنانی ہے“

”کچھ اور منگوانا ہے تو بتا دو“ وہ پوچھ رہا تھا  
”نہیں، بس یاد سے جلیبی لیتے آنا“ میں نے ایک دفعہ پھر تاکید کی تھی۔ پھر اریبہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اوکے آپ! آپ سالن نکالیں۔ روٹی میں بنا دوں گی“ وہ پلٹتے ہوئے کہنے لگی تھی۔  
”تم آرام کرو، ابھی تو کالج سے آئی ہو، میں کر لوں گی، یہاں کون سادعوت شیراز تیار کرنی ہے، صرف ساتھ، آٹھ پھلکے ہی اتارنے ہیں“

میں نے سالے میں آلو اور چکن ڈال کر دم دے دیا تھا۔ پھر ابلے بیگن کا چھلکا اتار کر اچھی طرح پیس لیا۔ لہسن، دھنیا اور پودینہ، اٹلی اور کٹی ہوئی ہری مرچیں ملا کر ایک رکابی میں بیگن کی چٹنی نکال لی۔ کچھ دیر بعد ارقام اور آویز بھی آگئے تھے۔ میں نے جلدی سے میز پر کھانا لگا دیا۔

”شکر ہے خدا کا تم صرف ہونے والی بھابھی ہی نہیں خالہ زاد بہن بھی ہو، ورنہ یہ مزے بس خواب ہی معلوم ہوتے تھے“ ارقام نے دعا سیہ انداز میں چھت کی طرف دیکھ کر کہا۔  
”چھٹکے، نومسخری، پہلے کھانا کھاؤ“ میں نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تھی۔ چھٹکا فرماں برداری سے پلیٹ پر جھک گیا تھا۔

☆☆☆

”میں نے ہمان کے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ تو پھر تمہیں بھی لے کر چلوں گی“ امی خالہ سے فون پر کہہ رہی تھیں، جبکہ میں امی کی ضروری بات سننے کے لیے خالہ کے ساتھ چسکی جا رہی تھی۔

”کون ہے؟“ خالہ نے فطری اشتیاق سے پوچھا۔

”بس، اب احزم آجائے تو پھر ہمیشہ کے لیے لے آؤں گی۔ میں تمہیں، کیسی رونق محسوس ہو رہی ہے آپا سے میں نے کہہ دیا ہے کہ میری بیٹی کو بھیجنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جائے“  
انہوں نے میری پیشانی چومی، ناشتے کے بعد میں نے خالہ کو دوا دی تھی دوا کھا کر وہ کچھ دیر تو باتیں کرتی رہی تھیں، پھر ان پر نیند حملہ آور ہونے لگی۔

لائٹ آگئی تھی سو اسی لیے میں نے پہلے مشین لگالی۔ جب تک کپڑوں کی دھلائی ہوئی، اتنی دیر میں صفائی وغیرہ سے فارغ ہو چکی تھی۔ کپڑے بھی نہ جانے کتنے ہفتوں کے اکٹھے کر رکھے تھے۔ ڈیڑھ بجے میں مشین دھو کر نیچے اتری تو خالہ سبزی کاٹنے میں مصروف تھیں۔

”یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟“ میں نے لپک کر ان کے سامنے سے سبزی کی ٹوکری اٹھالی۔  
”تم تھک گئی ہو افزاء! تھوڑی دیر آرام کر لو۔ میں سالن پکا لیتی ہوں“ انہوں نے ہمدردی اور محبت سے کہا تھا۔ مجھے گھن چکر بنا وہ دیکھ چکی تھیں۔

”سالن بنا لیتی ہوں۔ آپ فکر مند نہ ہوں، جا کر آرا کریں“ میں ناراضی سے گویا ہوئی ”مگر بیٹا!“

”خالہ! جاییے، ورنہ میں چلی جاؤں گی“ میری دھمکی نے اثر دکھایا تھا، سو وہ مجھے تھوڑی دیر آرام کرنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد اریبہ بھی آگئی تھی۔  
”اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟“

”وین خراب ہو گئی تھی“ اریبہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔ فریج میں سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے بولی۔ امی کی طبیعت ٹھیک ہے؟ آپ بورتو نہیں ہوئیں؟“

”خالہ ٹھیک ہیں، تم خود دیکھ لو انہیں، بلکہ یہ دلیہ بھی لیتی جاؤ اور بوریت کا بھلا کیا سوال“ میں نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

”ہاں، آپ کا اپنا گھر ہے“ وہ معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔  
”تو اور کیا“ میں نے سادگی سے جواب دیا۔ وہ قل قل ہنسنے لگی۔ میں نے بھی اس کے ہنسنے کی وجہ جان کر مسکراتا شروع کر دیا تھا۔

”آپ کو پتا ہے، احزم بھائی آرہے ہیں“ اریبہ نے اپنے تائیں دھماکہ کیا۔  
”کچھ سناتو ہے“ میں پیاز کاٹنے کے ساتھ مسلسل آنسو بھی بہا رہی تھی۔  
”احزم بھائی کے آتے ہی شادی کی ڈیٹ فیکس کر دی جائے گی“ وہ مجھے مطلع کر رہی

اس نے اوصاف کے ہاتھ سے ریسیور پکڑ لیا۔ میں جو دم سادھے کھڑی تھی ایک دم چونک کر گویا نیند سے جاگی۔ دوسری طرف شاید رجا بھی محسوس کر چکی تھی کہ میں نے اس کی چند باتیں سن لی ہیں۔ ”کیوں بوگی، کیا کہنا ہے“ وہ اپنی باتوں کے اثر کو زائل کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

”اوں..... ہوں“ میں ابھی بھی درط حیرت میں مبتلا تھی ”یہ رجا کیا کہہ رہی تھی“ ”بول بھی چکو افزاء! سچ تمہاری خاطر نیند کی قربانی دی ہے“ وہ بے زاری سے بولی۔ اور مجھے خیال گزرا کہ واقعی نیند سے اٹھائے جانے پر وہ اتنی بے زار، اور اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ ”ہاں، رجا! وہ امی تمہارے گھر آنا چاہ رہی تھیں“ میں نے ہڑبڑا کر کہنا شروع کیا۔ ”تم سچ بول رہی ہو؟“ ”بھلا آنٹی کو ہمارے گھر آنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت ہے“ رجا نے تاسف سے کہا۔

”وہ کسی خاص مقصد کے لیے آنا چاہ رہی ہیں“ میں بھی گویا تمہید میں الجھ رہی تھی۔ ”پہیلیاں نہیں جو بھجکتی میں صاف صاف بات کرو“ رجا بھنبلائی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کا لہجہ کچھ بدل گیا ہے۔ شاید وہ بھی کسی خاص بات کی بو پا چکی تھی۔ ”وہ دراصل امی، همان بھائی کے سلسلے میں آنا چاہ رہی تھیں“ ”سچ.....“ رجا گویا چیخ اٹھی ”اتنی بڑی خبر، اب بتا رہی ہو“ ”ایکچو نیلی! امی کو خوشی بہت پسند ہے“

”ہیں..... یہ خوشی کہاں سے آن چکی۔ میں نے سمجھا آنٹی کو میں پسند آئی ہوں“ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مذاق کر رہی ہے، خوشی اس کے لہجے اور باتوں سے عیاں تھی۔ ”کب آئیں گی آنٹی؟“ وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔ ”کچھ دنوں تک آنے کا ارادہ ہے“

”ہم لوگ انتظار کریں گے“ وہ بہت سرشار تھی۔ میں نے فون ابھی ہی رکھا تھا جب ایک دفعہ پھر تیل زور و شور سے بجنے لگی۔ چونکہ میں پاس ہی تھی۔ تب ہی دوسری تیل سے پہلے ہی میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

”رجاء کی بچی! ابھی میں نے خالہ کے لیے بخنی بنائی ہے“ میں اپنے دھیان میں رجا کو لتاڑنا چاہ رہی تھی، جبکہ ایک گھمبیر مردانہ آواز اس کی دی۔

”اپنی افزاء کی سبیلی ہے نارجا! اسی کی بہن ہے“ امی تفصیل بتانے لگی تھیں۔ ”کیسے لوگ ہیں؟ لڑکی کا باپ کیا کرتا ہے؟“ فون رکھنے کے بعد خالہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔ اور میں نے بھی رشتی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے تھے۔ ”خالہ! میں ذرا رجا کو فون کر لوں؟“

”کیوں نہیں، جاؤ کر لو بات“ وہ وضو کرنے اٹھ گئی تھیں۔ اب خالہ کی طبیعت قدرے بہتر تھی، مگر وہ مجھے واپس نہیں بھجوانا چاہتی تھیں۔ تیل جا رہی تھی، مگر دوسری طرف کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا، اور مجھے رجا کو یہ خوشخبری سنانے کی جلدی تھی۔ تقریباً دسویں تیل پر فون ریسیو کیا گیا۔ ”رجاء کہاں ہے؟“ میں اوصاف کی آواز پہنچا چکی تھی۔

”کیسی ہیں آپ افزاء! آویز کا کیا حال ہے؟ بڑے دن ہوئے ہیں آپ نے چکر نہیں لگایا۔ کہیں رجا سے ناراضی تو نہیں چل رہی، اگر ایسی بات ہے تو میں رجا کی طرف سے معذرت کر لیتا ہوں، ذرا نا سمجھ اور غصے کی تیز ہے۔ جذباتی بھی بہت ہے، مگر“

”پلیز اوصاف صاحب!“ میں تو اس تیز گام کی تیز رفتاری پر دنگ رہ گئی تھی ”ایسی کوئی بات نہیں، میں ذرا مصروف تھی، اسی لیے آ نہیں سکی“ ”او، اچھا اچھا“ دوسری طرف گویا سکھ کا سانس لیا گیا تھا۔

”رجاء کہاں ہے؟“

”وہ تو ابھی سو رہی ہے“

”ٹھیک ہے، رجا کو میرے فون کا بتا دیجیے گا“ میں مایوسی سے فون رکھنے لگی تھی، جب رجا کی سوئی سوئی آواز سنائی دی۔

”اوصاف! کس کا فون ہے؟“

”افزاء کا“

”ایک تو اس بوگی کی بے تکی سنتے رہو، کہہ دو، رجا گھر میں نہیں“ مجھے رجا کی ناگواری آواز سنائی دی تھی۔ عجیب سا احساس تھا، جس نے لمحہ بھر کو مجھے جکڑ لیا۔

”شاید کوئی ضروری بات کرنی ہے افزاء نے“ اوصاف دبی آواز میں بولا۔ وہ ریسیور پر ہاتھ رکھنا بھول گیا تھا شاید۔

”اونہ! ضروری بات، نہ جانے کس گھڑی“ وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی تھی۔ پھر

”ہیلو.....ہیلو“ وہ جو کوئی بھی تھا بہت عجلت میں ہیلو ہیلو کی گردان کر رہا تھا۔

”السلام علیکم! جی آپ کون؟ کس سے بات کرنا ہے؟“ میں نے شائستگی سے پوچھا۔

”گھر کا نمبر اتنی دیر تک بڑی کیوں تھا؟“ میرا سوال یکسر انداز کر دیا گیا تھا ”یہ تو احزم کی آواز لگتی ہے“ میں نے ریسپور کان سے ہٹایا، دیکھا اور پھر بولی ”میں رجاء سے بات کر رہی تھی“ اٹھل پھل دھڑکنوں کو ڈبٹے ہوئے میں ہنسنے لگی۔

”کون رجاء؟ تم کون ہو؟“ امی اور یہ اریبہ کہاں ہیں؟

”خالہ سورہی ہیں۔ اریبہ کالج گئی ہے، جبکہ میں“ ابھی میں تفصیل بتانا چاہ رہی تھی۔

جب وہ بڑے وثوق سے بولا ”تم افزاء ہو“

”جی“ میری آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔

”تھینک گاڈ! تمہاری آواز تو سنائی دی مجھے تو لگتا تھا کہ منگنی کے بعد تم مرغ پر چلی گئی ہو۔ جب بھی فون کیا، تم سیرسپاٹوں پر روانہ ہوتی تھیں اور یہ رجاء کون ہے؟ کوئی لڑکا تو نہیں؟“

”میری فرینڈ ہے رجاء سجاد“ میں نے کافی ناراضی سے جواب دیا۔ اور میں کب سیر

سپاٹوں پر نکلی ہوتی ہوں، صرف رجاء کے گھر جاتی ہوں۔ وہ بھی صرف امی کی اجازت سے“

”اکثر وزیلہ بھابھی سے بات ہوتی رہتی ہے وہ ہی اس رقیب دوسیاہ کے متعلق بتا رہی تھیں۔ سچ میں تو اس رجاء سے سخت جلیسی فیل کرنے لگا ہوں“ وہ بہت ہلکے پھلکے لہجے میں کہہ

رہا تھا، یوں کہ میرے دل سے ایک نادیدہ بوجھ ہٹا چلایا۔

”میں نیکسٹ منٹھ آؤں گا۔ تمہیں آویز نے بتایا ہوگا“

”جی“

”تم خوش ہو افزاء؟“

”کس سلسلے میں؟“ وہ مجھے مسلسل حیران ہی تو کر رہا تھا۔

”کچھ پرانے اور کچھ نئے سلسلے میں“ گھمبیری آواز میں بولا۔ یوں کہ میرے دل

نے پہلو میں زور، زور سے دھڑکن شروع کر دیا تھا۔

”مم..... میں بہت خوش ہوں“ میرا لہجہ شاید بہت سے بھید کھولنے کے لیے کافی تھا۔

احزم کے ذہن سے کچھ پرچھائیاں ٹپنے لگی تھیں۔

یہ دن تو بڑا بابرکت ہے۔ کبھی نہ بھولنے والا، خوش قسمتی سے تمہاری آواز سن لی ہے،

کب سے یہاں ہو؟“

”دس، بارہ دن تو ہو چکے ہیں“ میں نے بمشکل لرزیدہ آواز میں بتایا۔ ہزاروں میل

دور بیٹھے احزم کو کیا خبر تھی اس عشق میں فنا، دل پر بھری ہر رات کتنی بھاری ہے۔

”مزید کتنے دن رہو گی؟“

”شاید ایک ہفتہ“ میں نے کچھ سوچ کر بتایا۔

”اوکے، میں فون کروں گا۔ شرط یہ ہے کہ کال تم ہی ریسپونڈ کرنا، کسی شیطان کو بتانے

کی ضرورت نہیں“ اس کا اشارہ اپنے بھائیوں کی طرف تھا میں جتنی بھی پردہ داری کر لیتی ان

شیطانوں کو پتا چل ہی جاتا تھا۔

”سجنوں سے بات ہوتی ہے، تب ہی کہوں افزاء کا چہرہ ہزار دولت کا بلب کیوں بنتا

جا رہا ہے“ آویز وثوق سے کہتا۔

”بھئی وفاداروں سے غداری نہیں کیا کرتے“ یہ ارقام تھا۔ جو جھومتے ہوئے کہہ رہا

تھا۔ یہ راز داری ہمارے ساتھ کیوں برتی۔ لگتا ہے احزم نے منع کر رکھا ہوگا۔ ورنہ ہماری افزاء کو

ان چالاکیوں کا بھلا کیا پتا“ آویز پر یقین انداز میں بولا۔

”یعنی بھائیوں سے غلط بیانی، اس کا نتیجہ ٹھیک نہیں ہوگا“ ابھی سے بتا رہا ہوں“

”معذرت کر لو، ہم سے فرینڈ، ورنہ!“ آویز نے مجھے دھمکانا چاہا۔

”ورنہ کیا کر لو گے“ میں نے رعب سے کہا۔

”کچھ بھی نہیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے، سوائے خوشامد کے“ ان دنوں نے یک دم پینترا

بدل لیا تھا۔

☆☆☆

امی اور خالہ، رخصتی کو پسندیدگی کی سند بخش آئی تھیں۔ اور ادھر رخصتی کے گھر والے تو

ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے تھے۔ منگنی کے جھنجٹ میں پڑنے کے بجائے شادی کو ڈیٹ فیکس کرنا

چاہتے تھے مگر امی کو یہ جلد بازی کچھ بھانپیں رہی تھی۔

”رخصتی اور رجاء کے فرض کی ادائیگی کے بعد ہمیں حج کرنے جانا ہے۔ آپ کوئی

نزدیک کی تاریخ رکھ لیں“ روینہ آنٹی نے بہت سہاؤ سے بات کی تھی کہ امی کو شادی کے متعلق

سوچنا ہی پڑا۔

”مگر ابھی تو رجاہ کی کہیں بات دات طے نہیں ہوئی“ امی نے سنجیدگی سے کہا۔

”رجاہ کا رشتہ بچپن سے ہی سجاد صاحب نے اوصاف سے طے کر رکھا ہے۔ میری منہ بھی بہت بیمار رہتی ہیں۔ اور وہ شادی کے لیے اصرار کر رہی تھیں۔ مگر رخصتی سے پہلے رجاہ کو رخصت کرنا مناسب نہیں“ انہوں نے وضاحت کی تھی۔

☆☆☆

دو ماہ بعد کی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔ گھر میں شادی کے ہنگامے کیا جاگے میں اور امی گھن چکر بن کر رہ گئیں۔ بھابھی نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ کسی بھی کام کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ ہمان بھائی نے بھی امی کی پسند پر سر تسلیم خم کر دیا تھا اور یہ فرمانبرداری عموماً امی کے لیے وبال جان بن جاتی تھی۔ خریداری کے سلسلے میں زیادہ تر وہیں کرنا پڑا تھا کیونکہ رجاہ اور رخصتی اپنی پسند سے شاپنگ کر رہی تھیں، رخصتی کی چوائس اتنی اعلیٰ تھی۔ اس قدر منفرد تھی کہ امی کا بجٹ بہت دفعہ ڈانوں ڈول ہو گیا۔

پاپا اور ہمان بھائی اس معاملے میں نہیں بول رہے تھے اور امی بھی چھوٹے بیٹے کی شادی کی خوشی میں دل چھوٹا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اتنے بھاری زیورات کے ساتھ ساتھ ہزاروں کا عروسی لباس خریدا کہ وہ ذلیلہ بھابھی خاموش نہیں رہ سکی تھیں۔

”آج کل کی لڑکیاں تو بہت ہی بے دید ہو چکی ہیں“ چونکہ رخصتی نے شادی کی تمام شاپنگ اپنی پسند سے کی تھی، سو ہر ہر شے بہترین اور معیاری تھی۔ اسی حساب سے بھابھی کی پیشانی کے بلوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا تھا۔

ہمان بھائی کی شادی نے تو اچھا خاصا مقروض کرنے کا پلان بنا رکھا تھا۔ بہر حال پاپا اور خصوصاً ہمان بھائی کے تعاون سے بری، زیورات اور ہوٹلز کی بکنگ وغیرہ کے انتظامات احسن طریقے سے ہو گئے تھے۔

”آویز! صبح مجھے گھر لے گیا تھا کپڑے دھلوانے کے لیے۔ خالہ کی صحت تو بہتر تھی، البتہ ان کی کام والی ابھی بھی چھٹی پر تھی۔

میں گھر دسیوں کام چھوڑ کر آویز کے ساتھ آگئی تھی۔ اگرچہ آویز اور اریہ دونوں کام میں میرا ہاتھ بٹا رہے تھے مگر اس لائٹ کی آنکھ بھولی کی وجہ سے شام کے سائے گھرے ہونے لگے تھے۔ آویز آنکھ بچا کر نکل گیا تھا۔ البتہ ارقام برش دھونے میں مصروف تھا۔

میں انگنی سے کپڑے اتار کر نیچے آئی تو ڈور نیل ایک تو اتر سے بچنے لگی۔

”اب نبجانے کون آ گیا ہے“ میں کپڑوں کے ڈھیر سمیت گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔

”کون؟“ تیسری دفعہ پوچھنے پر بھی جب کوئی آواز سنائی نہ دی تو مارے اشتعال کے میں نے گیٹ کا پٹ کھول کر باہر جھانکا۔

”تم“ میرے ہاتھوں سے کپڑوں کا ڈھیر گرتے گرتے بچا۔

”میں بھی کہوں۔ تم“ احزم نے میری حیران آنکھوں میں جھانک کر کہا ”اندر نہیں آنے دو گی روح افزاء“ وہ جگر جگر لگا ہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ آج ان آنکھوں کی چمک میں کچھ الگ سی بات تھی۔ میرا دل گویا پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے قرار ہوا۔

”تم۔ اس قدر اچانک، بغیر بتائے“ میرے لبوں سے کچھ بے ربط الفاظ نکلے۔

”بس یار! سر پر اندر دینے کے چکر میں تم لوگوں کو ”چکرانا“ چاہتا تھا“

”مگر تم نے تو اگلے مہینے آنا تھا“ میری سوئی وہیں کہیں انکی ہوئی تھی۔

”اگر آپ کو میرا آنا ناگوار گزرا ہے تو واپس پلٹ چاہتا ہوں“ آن کی آن میں احزم کے لب و لہجے میں ناگواری در آئی۔

”نن۔ نہیں تو، میں بھی بس“ مجھ سے بات بن نہیں پڑ رہی تھی۔

”گھر میں اتنا سناٹا کیوں ہے؟“ وہ میرے ہاتھ سے کچھ کپڑوں کو لیتا ہوا ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔

”ابھی اندر اطلاع کرتی ہوں۔ پھر دیکھنا“ میں لاڈلے کے دروازے کی طرف بھاگی تھی۔

”ظاہر ہے۔ بہن بھائیوں کی بے ساختہ خوشی کا بھلا کیا مقابلہ“ احزم کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تھی۔ میرے دل میں اک پھانس سی چبھی۔

”امی بھیا آگئے ہیں“ اریہ کے ہاتھ سے بلوریں رکابی گری اور فرش پر لڑھکتی چلی گئی۔ بہت سے کانچ ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ مجھے لگا ایسا ہی کوئی نوکیلا کانچ میری آنکھ میں چبھ گیا ہے۔

”احزم! تم بغیر بتائے“ خالہ خوشی سے رو پڑیں ”میرا بچہ، میری جان“ وہ بھی ماں کو اپنی مضبوط بانہوں کے حصار میں لے چکا تھا۔ گھر میں گویا خوشیوں کی برات اتر آئی تھی۔

آج مجھے واپس چلے جانا تھا مگر خالہ نے جانے ہی نہیں دیا۔ میو کی فہرست بھی طویل ہو گئی تھی خالہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دنیا کی ہر نعمت بیٹے کے لیے میز پر سجادیں۔

مرغ تنجن، قبولی پلاؤ، کچے قیے کے کباب، کھڑے مسالے کا گوشت، اور انناس

کی پڑنگ۔

اریہ اور میں گیارہ بجے کچن سے باہر نکلیں تو پسینے سے شرابور تھیں۔

”یہ کون سے ریٹورنٹ کے ڈالٹے ہیں“ احزم اناس کی پڑنگ کا بادل سامنے رکھے بڑی باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔

”پسینے میں خچڑنے اور اتنا کچھ پکانے کے بعد یہی انعام ملنا تھا ہمیں“ اریہ اور میں جل بھن کر چلائی تھیں۔

”انعام تو تم دونوں کو ضرور ملے گا مگر اس ”ملغوبے“ کی وجہ سے نہیں“ احزم جان بوجھ کر مجھے اور اریہ کو چڑا رہا تھا۔

”پھر ”ملغوبہ“ کہا۔ آپ یہاں سے چلتے پھرتے نظر آئیں۔ اتنا کچھ کھانے کے آپ اہل نہیں ہو سکتے“ اریہ بھناٹھی۔

”ہم دونوں تو ہر ڈش کو چکھنے کے حق دار ہیں نا“ آویز اور ارقام نے چہرے پر مسکیت طاری کر کے کہا۔

”تم سب ایک تھیلی کے چنے بٹے ہو۔ لہذا تم دونوں کو بھی خوش فہمی لاحق نہیں ہونی چاہئے“ میں ناگواری سے کہتے ہوئے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ احزم میرے مقابل بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیں کسی احساس کے تحت جگمگا رہی تھیں۔

”روح افزاء یہ پلاؤ کی کون سی قسم ہے“ وہ سنہری ڈش میں خوش ذائقہ کھلے کھلے چاولوں کو دیکھ کر بولا۔

”تمہیں نہیں پتا احزم! یہ قبولی پلاؤ ہے“ آویز نے معصومیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔

”اوہ، نام دیکھو، قبولی پلاؤ۔ کوئی انجان شخص تو نام سن کر ہی خوش ہو جائے گا مگر جب کھانے پر ٹوٹ پڑنے کا وقت آئے تو چنے کی دال کے چاول دیکھ کر ہوش اڑ جائیں بے مزہ سی کچھڑی“ ارقام جل بھن کر کہنے لگا۔ اسے گوشت کے بغیر کوئی بھی ڈش سرے سے بے ذائقہ لگتی تھی۔

”اناس کی پڑنگ سے بہتر تو سو جی کا حلوہ ہے“

”تو تم نہ کھاؤ“ میرے ضبط کی طنائیں بالا آخر ٹوٹ گئی تھیں۔

”کیوں نہ کھاؤں؟“ ارقام نے ندیدوں کی طرح باؤل اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیا تھا، جب آویز کو شرارت سوچھی۔

”افزاء! رجاؤ کو کتاب اور مرغ تین بہت پسند ہے کیا خیال ہے بھاگ کر پکڑا نہ آؤں“

”فضول مت بولو“ احزم کے سامنے رجاؤ کے ذکر پر میں تمللانے لگی تھی۔

”رجاؤ کو تو پڑنگ بھی پسند ہے۔ قبولی پلاؤ بھی شوق سے کھالے گی۔ وہ سب کچھ کھا جاتی ہے، دعا کرنا ہماری افزاء کو سالم نہ نگل جائے“ ارقام کی زبان پر پھر سے کھجلی ہونے لگی۔

”یہ رجاؤ کون ہے؟“ احزم نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تمہاری رقیب“ آویز ہنسا

”کیا مطلب؟“

”جان جاؤ گے عنقریب، ایک دفعہ شادی تو ہو لینے دو۔ موبائل میں بیلنس کارڈ خریدنے کے علاوہ کوئی تیسرا کام نہیں کر سکو گے۔ چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے تمہاری یہ روافزاء کی بوتل رجاؤ صاحبہ سے نیلی فونک گفتگو فرماتی ہے پھر بھی دل باتوں سے بھرتا کہاں ہے۔ آئے دن رجاؤ کے گھر کے چکر“ آویز ناں اسٹاپ بولے جارہا تھا جب میں نے اس کے کندھے پر ایک دھپ رسید کی۔

”بکواس بند کر دو“

”ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی روح افزاء بھابھی!“ احزم کی موجودگی میں وہ دونوں کچھ زیادہ ہی شریر ہو رہے تھے۔ میں اس طرز خطاب پر بھناٹھی۔

”کون سی بات“ آویز نے حیران ہونے کے تمام ریکارڈ توڑ کر ارقام کی طرف دیکھا۔

”تم نے رجاؤ کے بجائے رخی کو کیوں بھابھی بنا لیا ہے۔ تمہاری دوڑیں تو پہلے کی طرح برقرار رہیں گی۔ اس شادی سے تمہیں بھلا کیا فائدہ ہوگا“ ارقام نے مصنوعی تاسف کا اظہار کیا۔

”تو اور کیا۔ میں بھی کل یہی بات سوچ رہی تھی“ اریہ بھی جھٹ سے بول اٹھی۔ تم لوگوں کو اپنے نکلے چھٹانک بھر کے دماغوں پر زور دینے کی کیا ضرورت ہے، میں جیلا کر بولی۔

احزم اس نوک جھونک سے محفوظ ہو رہا تھا۔

”ویسے راحت جاں روح افزاء بات تو ارقام کی ٹھیک ہے“ احزم نے میرے سامنے سے چکن تین کا ڈونگہ اٹھانے کی کوشش کی تو میں نے کمال اطمینان سے ڈونگہ اریہ کی

طرف کھسکا دیا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ احزم ناراضی سے گویا ہوا۔

”خبردار جو کسی نے مجھے روح افزاء کہنے کی کوشش کی یہ جام شیریں کا جگ سر پر انڈیل دوں گی“ میرے دھمکانے پر وہ بس شرافت سے پلیٹوں پر جھک گئے تھے۔

”تم بہت اچھی کوئنگ کرتی ہو روح افزاء! دل چھوٹا مت کرنا۔ ہم سب تو مذاق کر رہے تھے“ احزم نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”پھر کہا روح افزاء“ میں پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

”کم از کم مجھے تو روح افزاء کہنے کی اجازت ہے نا“ وہ اجازت طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور آنکھوں میں شرارت بھل رہی تھی۔

”تم نے ابھی تک اپنے آنے کی وجہ نہیں بتائی“ آویز نے کچھ خیال آنے پر احزم

سے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ اپنے گھر میں آنے کے لیے کسی ”وجہ“ کا ہونا ضروری ہے“

”سب کے لیے نہیں“ مگر تم تو بغیر کسی خاص مقصد کے نہیں آ سکتے۔ اتنا تو میں تمہیں

جانتا ہوں۔ تم سے بڑھ کر کوئی بھی ”مطلبی“ نہیں“ آویز نے کرسی گھسیٹی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہاں“ ایک ”وجہ“ تو واقعی ہے“ احزم نے بھی باہر نکلتے آویز کے برابر چلتے ہوئے

ایک دم پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”بھلا کون سی؟“ ان تینوں نے مجھ سمیت ہونق پن کی انتہا کر دی تھی۔

”یہ پانچ فٹ پانچ انچ کی روح افزاء کی بوتل“ وہ براہ راست میری طرف دیکھ

رہا تھا اور اس کی گہری نگاہوں کی پیش مجھے سر جھکانے پر مجبور کر چکی تھی۔ احزم عباس اس لمحے

آگہی کے حسین راز سے آگاہ ہوا تھا۔

ہمارے درمیان کبھی بھی بے تکلفی نہیں رہی تھی اور مٹگنی کے بعد تو تکلف اور جھجک کی

دیوار خود بخود حائل ہو چکی تھی ورنہ پہلے کتابوں اور پڑھائی کے دیوانے احزم سے کئی مرتبہ تکرار

بھی ہو جاتی تھی۔ وہ بہت نمازی، صوم صلوٰۃ کا پابند اور حافظ قرآن تھا۔

احزم مجھ سے تین سال بڑا تھا۔ میں خالہ اور امی کے لاکھ کہنے کے باوجود احزم کو کوئی

قابل احترام رشتے سے پکار نہیں سکتی تھی۔ میں ہی کیا، اتنے سنجیدہ مزاج، لائق فائق اور خالہ کے

بے انتہا لاڈ لے احزم کو کبھی اس کے مجھ سے بھی چھوٹے بہن بھائیوں نے ”عزت“ سے نہیں بلایا تھا۔

خالہ کے انتقال کے بعد امی اور پاپا خالہ کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ اور نانی کے

بعد تو امی، خالہ کے لیے نانی جیسی بن گئی تھیں۔ ایک تو خالہ فطرتاً بہت سیدھی سادی تھیں۔

دوسرے جوانی میں بیوگی کے صدمے نہیں انہیں اور بھی سنجیدہ مزاج اور خاموش کر دیا تھا۔

مٹگنی سے پہلے میرا اور احزم کا جھگڑا ہونا ایک معمول بنتا جا رہا تھا۔ احزم کی بہت

خواہش تھی کہ اس کی بہن اریہ اور میں اپنے بھائیوں کے لیے شرمندگی کا باعث نہ بنوں۔ مگر احزم

کے بہت چاہنے اور تعلیم کی افادیت پر لیکچر دینے کے باوجود میٹرک میں شاندار نمبروں سے فیل ہونا

میرے لیے چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جانے کا مقام تھا مگر میرڈھٹائی کی کوئی حد نہیں تھی۔

اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھتے ہوئے دوسری مرتبہ بھی میں سپلی کلیئر نہیں کر سکی تھی۔

”لوگ کیا کہیں گے۔ احزم کی فیانسی اور میٹرک فیل۔ اللہ کا واسطہ ہے امی، اس روح

افزاء سے کہیں میرے لیے روح افزاء ہی رہے۔ شربت بنفشہ نہ بنے۔ اتنے کڑوے اور کیلے

شربت کو حلق سے اتارنا مشکل نہ ہو جائے اس دفعہ اگر وہ فیل ہوئی تو پھر دیکھے گا“

احزم تنگنا تھا ہوا باہر نکلا۔

بظاہر تو کوئی ظالم سانج یا رکاوٹ موجود نہیں تھی مگر باقاعدہ مٹگنی کے بعد نجانے کیوں

احزم اس قدر لاطعلق سا ہو گیا تھا حالانکہ صرف اس کی خواہش کو مد نظر رکھ کر میں نے بی اے کلیئر کیا

تھا اور میرے کزنز اس انقلاب پر ششدر تھے۔

اب تو جھگڑنے کے لیے کوئی وجہ بھی موجود نہیں تھی۔ گریجویشن کے بعد میں تعلیم کو خیر

باد کہہ چکی تھی اور احزم بھی جاب کے سلسلے میں ملک سے باہر چلا گیا تھا۔

بلاشبہ وہ ہر لحاظ سے بہترین اور مکمل شخصیت رکھنے والا نوجوان تھا۔ اس میں آگے

بڑھنے کی لگن اور جذبہ موجود تھا، سوا سی لیے کامیابیوں نے ہر محاذ پر اس کے قدم چومے تھے۔

مٹگنی کے بعد ”روح افزاء“ کی پکار ڈرا کم کم سنائی دینے لگی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ احزم

کی مصروفیات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ روح افزاء بھی سالوں اور مہینوں کی گردش میں کھونے لگی

تھی، جب اچانک احزم کی آمد نے نہ صرف مجھے حیران کیا بلکہ اس کے انکشاف نے آویز اور

ارقام کو بھی ششدر کر دیا تھا۔

”پانچ فٹ اور پانچ انچ کی روح افزاء کی خاطر احزم اچانک لوٹ آیا ہے۔ مقام

حیرت، مقام تعجب، مقام خوشی، مقام.....“ آویز حیرانی سے بولے جا رہا تھا۔

”بس، میرے بھائی! نہ دماغ پر زور دے۔ آجا، ذرا چھٹی مار زور سے“ ارقام نے حیران پریشان آویز کے کندھے پر دھپ لگائی۔

”یہ اہزم بھلا کیا بول کر گیا ہے“ آویز ابھی بھی حیران تھا اور مجھے حیرانی کم شرمندگی کے تالاب میں ڈبکیاں لگانے پر مجبور کر رہا تھا۔

”اہزم نے بولا ہے۔ وہ اپنی ہونے والی، روح افزاء کی خاطر آیا ہے“ ارقام نے مسخرے پن سے کہا۔

”اس کا مطلب کیا ہوا؟“

”ابے، گھامڑ! بچپن میں افزاء کو تعلیم کی افادیت پر لکچر دینے کے چکر میں بھائی صاحب خود محبت کا سبق پڑھ بیٹھے ہیں“ ارقام نے اب کہ بھنا کر آویز کا کان مروڑا۔

”بھئی، بہت ہی مبارک ہو روح افزاء بھابھی؟“ آویز اور ارقام نے بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا اور سالوں اور ڈھیروں مہینوں کے گرداب میں گم روح افزاء ایک دم زندہ ہو کر ان سب کی ہنسی میں شامل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ہمان بھائی کی شادی میں اہزم نے بھی بہت بھرپور انداز میں شرکت کی تھی۔ شادی کا ہر فنکشن یاد گار تھا۔ ادھر اگر آویز اور ارقام نے کچھ ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں تو دوسری طرف اوصاف نے رخصتی کا حقیقی بھائی نہ ہونے کے باوجود بھائیوں والا حق ادا کیا تھا۔

شادی کی مصروفیات میں اوصاف اور آویز گھن چکر بنے ہوئے تھے، تاہم انہوں نے انجوائے منٹ کے لیے نت نئے طریقے ایجاد کر کے اس شادی کو یادگار بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

اپنے بھائی کی خوشی میں گن گنز اور سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ میں خوشیوں کے سارے رنگ لیے میں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ دہن کی اکلوتی بہن ہر فنکشن میں گم صم، خاموش اور آزدہ دکھائی دیتی رہی۔ رجا جو حد درجہ چنچل اور بے انتہا شوخ طبیعت کی مالک تھی کیوں اس قدر سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی؟ دل نے ہزار تاویلیں دی تھیں۔ میں یہ تک سوچ چکی تھی کہ اوصاف سے عنقریب نکاح ہونے کی وجہ سے رجا پریشان اور ابھی ابھی سی ہے۔

پھر ایک دن مووی اور تصویریں دیکھتے ہوئے آویز نے بھی میرے خدشات پر گویا مہر لگا دی تھی۔

”تمہاری سہیلی تو ہر جگہ غم کی تصویر بنی نجانے کس کے سوگ میں ہے۔ اللہ خیر کرے، اس بھلجڑی اور بے حد ہنسوڑی رجا کو کیا ہوا ہے۔ وہ تو بات بات قیمتی لگایا کرتی تھی۔ کس کے عشق میں مبتلا ہو۔ بعض چہرے یوں ہی عمر بھر ہمیشہ کے لیے قید کر لیتے ہیں“

وہ مسکراتے ہوئے اپنے ازلی لا پروا انداز میں تبصرے کر رہا تھا۔ جب میں نے اہزم کو اٹھتے اور اپنے بیڈ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کی چال میں مضبوطی نہیں تھی۔ وہ گویا جلد از جلد منظر سے ہٹنا چاہتا تھا۔

اتوار کی شام، میں خالد کے گھر گئی تو باتوں ہی باتوں میں اریہ نے بتایا ”بھیا بہت الجھے الجھے اور خاموش سے ہیں۔ کیا تم نے نوٹ کیا ہے افزاء آپلی! بھلا جہاں میرے تینوں بھائی موجود ہوں، وہاں خاموشی کا تصور کیا جاسکتا ہے مگر نجانے کیا بات ہے کہ کچھ نہ ہونے کے باوجود کچھ ایسا انوکھا اور عجیب لگ رہا ہے، جسے دل اور ذہن قبول نہیں کر پار ہے۔ نجانے دل پر کون سے موسم اترنے والے ہیں“

وہ آزدہ تھی۔ بے چین تھی۔ میں اسے تسلی دینا چاہتی تھی۔ کچھ ایسا کہنا چاہتی تھی جو اریہ کو ہنسنے پر مجبور کر دیتا مگر ٹھیک ان ہی گھڑیوں میں، میرے دل پر بھی کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی تھی کہ میں لمحہ بہ لمحہ سکوت کے دریا میں اترنے لگی اور اریہ کہہ رہی تھی۔

”یہ کیسے موسم ہیں۔ جونہ چاہنے کے باوجود ہمارے آنگن کے درختوں پر بسیرا کرنا چاہتے ہیں“

یہ خزاں کے موسم تھے۔ یہ پت جھڑ کے موسم تھے۔ میرے لبوں سے اک آہ برآمد ہوئی تھی۔ کانپتے لرزیدہ ہونٹوں پر اک نوحہ تھا۔ ایسا نوحہ جو سارے موسموں کو چاٹ لگا کر خزاں رسیدہ کر دیتا ہے۔ مگر کر دیتا ہے۔ بخر کر دیتا ہے اور اس پل مجھے یوں ہی محسوس ہو رہا تھا کہ میں بخر ہو رہی ہوں۔ پلکوں کی حدود سے بغاوت کرتا ایک آنسو پھل کر میری گود میں آگرا تھا۔ میں زیر لب بوڑھاتے ہوئے اٹھی تھی۔

”اریہ! یہ بخر کے موسم ہیں تمہیں کیا خبر اریہ! یہ بخر کے موسم میرے دل کو لاحق ہونے والے ہیں۔ یہ گھڑیاں درد کی گھڑیاں ہیں“

میری چھٹی حس ہمیشہ کی طرح کسی انہونی کا اعلان کر رہی تھی۔

☆☆☆

کچھ عرصے پہلے پایا کو معمولی سے بخار نے بستر سے لگا دیا تھا اور اتنے صحت مند، ہشاش بشاش میرے بے حد ایکٹو پالحوں میں ڈھیر ہو گئے۔ امی پایا کی جدائی کے صدمے سے باہر نکلیں تو گھر کا ماحول تبدیل ہو چکا تھا۔

فقط تین ماہ میں رخصتی نے پر پرزے نکال کر اپنی زبان کے ایسے ایسے جوہر دکھائے تھے کہ میں امی سے نگاہیں چرائے شرمندہ شرمندہ کی کونوں کھدروں میں چھپنے کی کوشش کرتی۔ رخصتی نے شوہر سمیت گھر پر اپنا راج قائم کر لیا تھا۔ مجھے اور امی کو ایک اسٹور میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ ہمارے کچن میں گھسنے پر پابندی لگ چکی تھی۔ میں اور امی کسی کوفون بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ کھانا ہمیں اسٹور روم میں ہی بھجوا دیا جاتا تھا۔ ڈاننگ ٹیبل تک آنے کی ہمیں ممانعت کر دی گئی تھی۔ اپنی مرضی سے فریج کو ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ حتیٰ کہ ملنے ملانے والوں سے پہلے رخصتی خود ملاقات کرتی تھی پھر اگر ضروری سمجھا جاتا تو امی کو ملازمہ کے ہاتھ پیغام بھیج کر بلوایا جاتا۔

خالہ کو گھر آنے سے نجانے کیا کہہ کر روک دیا گیا تھا۔ خالہ فون کرتیں تو امی سے بات نہیں کرنے دی جاتی تھی۔ البتہ آویز اور ارقام آتے جاتے رہتے تھے مگر یہ مکار، کتنی ان کے سامنے گویا بچھ بچھ جاتی۔ وہ ہمارے زخم خوردہ دل میں جھانکے بغیر خوشی خوشی لوٹ جاتے تھے۔ رخصتی کو دیکھ کر وزیلہ بھابھی نے بھی رنگ ڈھنگ دکھانے شروع کر دیئے تھے، مگر وہ رخصتی کی طرح براہ راست امی سے بدکلامی یا بدتمیزی نہیں کر سکتیں تھیں۔ بہر حال ان کے دل میں تھوڑا بہت خوف خدا اور امی کا احترام موجود تھا۔

میری سانسوں کے ساتھ رشتے جوڑنے والی رجا نجانے کہاں گم تھی کس کنویں میں ڈوب چکی تھی اور اس کی بھلی مانس ماں جس کی شخصیت کے جھانسنے میں میری بھولی ماں نے اور میں نے برسوں کی ریاضت کوشی میں ملا دیا تھا۔ امی اپنی عمر بھر کی کمائی کو لٹا دیکھ کر بے حال ہو رہی تھیں۔ وہ جنہیں خون جگر سے سینچا تھا جب وہ ہی اپنے نہیں رہے تھے تو پھر پرانی عورتوں سے بھلا کیسے شکوے۔

امی کو ہمان بھائی کے رویے نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

”اب رخصتی میں کیڑے نظر آنے لگے ہیں۔ وہ آپ ہی کی پسند تھی۔ میں بھگا کر نہیں

لایا اسے اب جھگڑیں میں اپنا گھر کیوں خراب کرو؟ ہمان بھائی نے گویا آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ ان ہی دنوں رخصتی کی امو اور بابا جان حج پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے وہ شاید ہمارے گھر کے حالات سے بے خبر تھے مگر یہ میری بھول تھی انکل آئی نہ سہی، رجا کو رخصتی دن بھر کی تمام رپورٹ من وعن پہنچا دیتی تھی اور یہ بات تو مجھے بہت بعد میں پتا چلی تھی کہ رجا کے کہنے پر مجھے اور امی کو خالہ کے گھر جانے سے روکا گیا تھا اور وجہ کیا تھی؟ رجا نے ایسا کیوں کیا؟ اور وہ رخصتی کون کون ہمارے گھر یلو معاملات میں مداخلت کرنے والی؟ بہت سے سوالیہ نشان جگمگا رہے تھے اور ان کا ایک واحد اور ٹھوس جواب تھا، احزم عباس۔

رجا عباد، احزم کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی اور اس نے نجانے کون سا جادو پھونکا تھا کہ احزم بھی سدھ بدھ گھو بیٹھا تھا۔ اسے رشتوں کا وقار بھول گیا تھا اسے محبتوں اور بندھے ہوئے ہاتھوں کی التجائیں بھول گئیں۔ احزم کی ماں اس کے قدموں میں ڈھسے گئی تھی۔

”دیکھ میرے لعل! مجھے میری بڑی بہن کے سامنے رسوا مت کرنا۔ دیکھ بیوگی میں میری ماں جیسی بہن نے میرے سر پر چادر تان کر سایہ کر رکھا تھا مجھے اس کے سامنے ذلیل مت کرنا“ وہ رورہی تھیں۔ جوا بٹاید زندگی میں پہلی مرتبہ وہ ماں کے سامنے بد لحاظ ہوا۔

”آپ کی بہن کے احسان اتارنے کے لیے اس کی بے کردار کی بیٹی کو گھر لے آؤں۔ عزت بخشوں مجھے بے غیرت سمجھ رکھا ہے کیا“ وہ غصے سے بولا۔

”تو کیا کہہ رہا ہے احزم!“ ماں کے دل میں نیزے کی انی چھبی ”میری افزاء ایسی نہیں“ ”تو کیسی ہے آپ کی افزاء!“ وہ استہزائیہ بولتا ہوا ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

”افزاء بہت معصوم اور بھولی بھالی ہے۔ تجھے کیوں اچانک اس میں برائیاں نظر آنے لگی ہیں“ وہ غصے سے چلائیں ”اتنے سالوں بعد تجھے پتا چلا ہے کہ وہ کس کردار کی ہے“

”جب آنکھ سے پٹی اترتی ہے تو منظر دکھائی دیتا ہے اس نام نہاد محبت کی پٹی کو اتار پھینکا ہے میں نے دیکھ لی میں نے افزاء کی کریمہ شکل“ احزم نے دھاڑ کر کہا۔

”تجھے کسی نے بہکا دیا ہے میرا دل یہی کہتا ہے تو کسی کے جال میں بھنس گیا ہے“ وہ رونے لگیں۔

”کاش جھوٹ ہوتا کاش یہ سب واقعی کسی دشمن نے مجھے بہکانے کی غرض سے کیا ہوتا مگر“ وہ خون آلود آنکھوں سے روتی ہوئی ماں کے قریب بھکا۔



”امی! یوں مت کریں میں آپ کو تکلیف نہیں دے سکتا مگر میں آپ کو بچ بھی نہیں دے سکتا“ ازم گویا تھک کر خود سے مخاطب ہوا تھا پھر تھکے تھکے قدم اٹھاتا باہر نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

اسٹیج پر جو میرا کردار تھا مجھے نباہنا ہی تھا، ہر صورت اور میری طنائی میں میرے جیسی ہی ایک عورت کے ہاتھ میں تھیں، جو میری خوشی کو مجھ سے چھین کر کسی اور کی خوشی بنادینا چاہتی تھی۔

”کل دس بجے نیچے آجانا۔ اگر نہ آئیں تو پھر جان لینا، کہ جتنا عزت سے جی لیا ہے بس اتنا ہی کافی ہے ابھی صرف ازم کی نظر سے گری ہو۔ بھائیوں کی نگاہ اور دل سے اتر کر کہاں جاؤ گی افزاء! ہم یہ تصاویر تمہارے بھائیوں کو دکھادیں تو وہ تمہیں کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیں گے“ اس نے میرے سامنے ان شرمناک تصاویر کا لفظ بھینکتے ہوئے کہا تھا اور میرے جسم میں گویا جان ہی نہیں رہی تھی نہ جانے کس وقت یہ تصاویر بنائی گئی تھیں، میں رجا کے گھر پوری بے تکلفی سے اٹھتی بیٹھی تھی کئی بار رخی نے اپنے ذرا اُن کردہ کپڑے مجھے پہن کر دکھانے کے لیے کہا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ جرائم پیشہ لوگ۔

”بہت بد صورت عورت ہو تم رخی! کاش تمہارا اتنا غلیظ چہرہ مجھے پہلے نظر آجاتا۔ تم میری بد قسمتی بن کر ہمارے گھر داخل ہوئی ہو، ہم نے اس بد قسمتی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے“ مجھے پتا تھا کہ میری یہ ذلت میری ماں سے نہیں پائے گی، بہت بھاری قیمت ادا کوئی پڑی ماں کی زندگی بچانے کے لیے۔ رخی فتح مندی کے احساس سے چور ہو رہی تھی۔

کل صبح کیا ہونا تھا میں جانتی تھی۔ مگر اس پل مجھے صرف امی کی فکر تھی۔ رات سے تکلیف اور درد کو سہتے سہتے ان پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔

وقت دھیرے دھیرے بیتا رہا۔ میں نے اذان فجر سنی اور پھر نماز فجر ادا کی۔ قرآن کھولا۔ کلام پاک کے حروف کو چوما، پھر لفظ لفظ دل میں اتارنا چاہا مگر مجھ سے قرآن حکیم کی تلاوت نہیں ہو سکی۔

میں جودان میں قرآن پاک کو پلٹ کر الماری میں رکھ آئی تھی۔ امی ابھی تک سو رہی تھیں نیچے رخی فتح کے احساس سے سرشار تھی۔ ادھر میرا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔ دس بجے کے قریب ملازمہ نے مجھے نیچے آنے کے لیے کہا۔ میں چہرے کے تمام تاثرات چھپا کر نیچے آئی تھی۔ ساٹا چہرہ اور بنجر آنکھیں لیے۔ میں نے اپنے پیاروں کے چہرے دیکھے۔ ان

چروں کو کچھ دھند نے لپیٹ میں لینا چاہا تھا مگر میں نے کمال حوصلے سے آنکھ میں اترنے والی نمی کو دل میں اتارا اور بار بار بار کی ان چروں کو دیکھنے لگی۔

خالہ، آویز، ارقام، بھیا، ہمان، بھائی..... بھابھی، رخی اور رجا ہاں ازم نہیں تھا۔ خدا نے میری دعا سن لی تھی۔ ازم کی غیر موجودگی میرے حوصلے کو مضبوطی بخش چکی تھی۔ میں نے دھک دھک کرتے دل کو ڈپٹا، سمجھایا اور اس کی التجاؤں کو نظر انداز کر کے بولی۔

”خالہ! یہ انگٹھی واپس لے لیں..... مجھے ازم کا ساتھ قبول نہیں“

”کک، کیا کہہ رہی ہو افزاء!“ خالہ ششدر رہ گئی تھیں ان کے وہم و گمان میں بھی

نہیں تھا کہ دو ماہ بعد چاک انہیں کیوں بلایا گیا ہے اور کس لیے بلوایا گیا ہے۔

”افزاء! کیا بکواس کر رہی ہو۔ تمہارے حواس تو ٹھیک ہیں“ ہمان بھیا جو کل تک ہر

معاطے سے بے نیاز تھے آج یوں بھڑک اٹھے گویا میرا گلہ ہی دبا ڈالیں گے۔

”میں اس نام نہاد منگنی کو توڑ رہی ہوں۔ مجھے ازم سے شادی کسی بھی صورت نہیں

کرنا دل کو اپنے ہاتھوں سے کچلنا اور روندنا کیا ہوتا ہے۔ آج سارے تجربوں سے گزر رہی تھی۔

”افزاء! تم پاگل ہو چکی ہو۔ امی شادی کی تاریخ لینے آئی ہیں۔

آویز اس قدر زور سے دھاڑا تھا کہ لمحہ بھر کو میرا دل چاہا اس مکار عورت کی مکاری کا

پردہ چاک کر دوں مگر ہر خواہش پر سر نہیں جھکایا جاتا۔ آج جان لیا تھا اور بھی نجانے کون کون سے

آگہی کے درواہ ہونے تھے۔ رخی کی خواہش پوری ہو چکی تھی۔ رجا کی تمنا بھی ادھوری نہیں رہی

تھی۔ کیا تھا اگر افزاء ایوب کا دل اجڑ گیا تھا۔ بھلا اس معمولی سے دل کی اوقات ہی کیا تھی۔

”کیا وجہ ہے اس منگنی کے توڑنے کی بولو افزاء!“ آویز گویا غصے اور اشتعال کے عالم

میں بھڑبھڑ جل رہا تھا۔

”وجہ“ کاش کوئی اسم ہوتا جسے پڑھنے کے بعد کم از کم میں اور میرا وجود کہیں زمین

پر دکھائی نہ دیتا۔

”بولو افزاء! کوئی ریزن دو..... کچھ تو کہو یہ معمولی سی بات نہیں خالو نے یہ رشتہ طے کیا

تھا تم نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ صدے کے زیر اثر پھٹی پھٹی آواز میں کہتا چلا گیا۔

”کیا بولوں؟ کیا بتاؤں“ بہتی موجوں کے حوالے خود کو کرنا آسان نہیں تھا۔ مگر میں

نے ایسا کیا۔ میری نظریں رخی کے چہرے پر تھیں جو نفرت اور سختی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

نبلی کانچ سی آنکھوں میں مجھے جس نہس کر دینے والے طوفان کی ٹھاٹھیں مارتی پاگل موچیں مجھے زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر گئیں۔

”میں..... اوصاف کو..... پسند کرتی ہوں“ سر پر آسمان ہی تو گر پڑا تھا۔ آویز، خالہ، ارقام..... سب پتھرائی نظروں سے مجھے دیکھتے رہے اور میں اپنے اوپر گرے اس تھوڑے سے آسمان کو ہاتھ سے ہٹانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

”افزاء! میری بچی تجھے کیا ہو گیا ہے“ خالہ پھبک پھبک کر رونے لگیں۔ ”یا اللہ! کیا یہی دن دیکھنا تھا مجھے یقین کیوں نہیں آتا یہ میری افزاء کے الفاظ ہیں“

”افزاء! تم پاگل ہو چکی ہو..... میں سمجھتا تھا احزم کو اس کرتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے افزاء ایسی نہیں۔ نہیں افزاء! یوں دھوکہ نہیں دیتے۔ یوں ذلیل نہیں کیا کرتے۔ اٹھیے امی، اب کیا رکھا ہے۔ کچھ نہیں باقی بچا۔“

بہت تھکی تھکی سی آواز تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ میں اگر اس لمحے آویز عباس کو دیکھ لیتی تو کبھی زندگی میں ایسے سفاک جھوٹ بولتے ہوئے میرا دل لمحہ بھر کو تو ضرور لرزتا مگر میں اسے بتاتی بھی کیا کہ تمہاری بہن نیم محبت پر عزت کو فوقیت دی ہے محبت کو قربان کر کے عزت کو بچالیا۔ ورنہ یہی میرے ماں جائے اک پل کے لیے بھی مجھے اس چھت تلے سانس نہ لینے دیتے۔

خالہ چلی گئی تھیں۔ مگر یہاں سے جانے کے بعد ایک فون کال نے مجھے تھرا کر رکھ دیا تھا آویز نے فون پر بتایا ”امی کو گھر آتے ہی، وہ بے ہوش ہو گئی ہیں۔ میں انہیں ہسپتال لے آیا ہوں“ رخصتی اور بھابھی دونوں ہسپتال روانہ ہو گئی تھیں۔ اس وقت رخصتی کو اس گھر میں آئے ہوئے صرف نوے دن تو ہوئے تھے اور وہ پورے گھر پر یوں حکمران تھی گویا صدیوں سے یہاں رہتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ وزیلہ بھابھی بھی اس سے کچھ دینے لگی تھیں۔

لاکھ چاہنے کے باوجود رخصتی نے مجھے ہسپتال نہیں جانے دیا تھا۔ خالہ تین دن بعد گھر آچکی تھیں اور ایک دفعہ پھر میعاد بخار نے انہیں لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میرا دل انہیں دیکھنے کے لیے تڑپا رہتا تھا مگر اس گھر سے باہر نکلنے کی اجازت کہاں تھی۔

رخصتی جو چاہتی تھی اس کی خواہش کے مطابق میں نے وہ سب کچھ کہہ دیا تھا ان غلیظ اعتراضات کے بعد بھائیوں کے رویے یکسر بدل چکے تھے۔

”تم نے ایسا کیوں کیا افزاء!“ امی بھی وہی سوال دہرا رہی تھیں جن کے جواب زخم

زخم دل پر کھدے ہوئے تھے۔

”رخصتی چاہتی تھی“ میں نے ساٹ لہجے میں کہتے ہوئے دیوار پر بنے بدرنگ منظر کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

”مگر کیوں؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟“ صدے کی وجہ سے شاید ان کا زور سسٹم متاثر ہو رہا تھا ورنہ ایسا سوال تو وہ ہرگز نہ پوچھتیں۔ بھلا انہیں پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

”اس نے ایسا کیوں کیا؟“ میری خودکلامی ان تک با آسانی پہنچ رہی تھی ”رجاء کے لیے کیوں رجاء ایسا چاہتی تھی۔ وہ احزم کو چاہنے لگی تھی۔ مگر بیچ میں، میں کھڑی تھی۔ مجھے ہٹانا بہت ضروری تھا۔ اور میں نے ان کی خواہش پوری کر دی ہے۔ ورنہ“

”ورنہ کیا؟“ وہ بے قراری سے بولیں۔

”ورنہ آپ کی افزاء کی بے کرداری کے چرچے سرعام ہونے لگتے۔ وہ مجھے اور میری عزت کو نیلام کر دیتی وہ ایسا کر سکتی تھی“ اپنے ہی آنسوؤں میں میرا وجود پانی بن کر بہنے لگا تھا اور میں ان کی گود میں سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

”یہ اوصاف کون ہے؟“ احزم کی آنکھوں میں سرخیوں کے رنگ بہت گہرے تھے۔

”پتا نہیں“ آویز نے نگاہیں چرائیں۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟“ وہ رخصتی کی طرح پھنکارا۔

”مجھے کچھ پتا ہو گا تو بتاؤں گا.....“

آویز خاموشی سے کتاب میں سر دے کر بیٹھ گیا تھا افزاء نے اس پر کسی اوصاف کو فوقیت دی تھی۔ اس بات نے احزم کی مردانگی پر گہری ضرب لگائی تھی۔ اسے رجحیکٹ کیا تھا۔ ٹھکرا دیا تھا۔ وہ اس وقت ابانت اور توہین کے احساس سے بھر رہا تھا۔

”اوصاف، رجاء کا کزن ہے نا“ اسے اپنی آواز کسی کنویں میں سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

”بولو، آویز! خاموش کیوں ہو؟“

”شاید، ہاں“ وہ ایک دم کتاب الٹ کر کھڑا ہو گیا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ واپس آیا تھا۔

”اِزَم! رجاؤ اور اس کی والدہ آئی ہیں۔ امی کی عیادت کے لیے۔“

”ہوں“ وہ ابھی تک اسی سکوت کے زیر اثر تھا۔

”تم ذرا نیچے آ جاؤ“

”آتا ہوں“ اِزَم ان سناٹوں کے شور سے گھبرا کر نیچے آ گیا تھا۔ امی کے کمرے سے رجاؤ کے بولنے کی آواز آرہی تھی اور اس گھنٹیاں بجائی آواز نے اِزَم کے اندر پھیلے ”سکوت“ کو یکدم توڑ دیا۔

رجاؤ جس مقصد کا ارادہ کر کے آئی تھی وہ مقصد لمحہ بہ لمحہ اسے کامیابی سے ہمکنار کر رہا تھا دھیرے دھیرے ویسا ہی منتر اِزَم کے سر پر چڑھ کر بولنے لگا تھا جس سحر نے کبھی افزاء کو گرفتار کر رکھا تھا۔

ان فاصلوں کو رجاؤ نے ایسے مٹا ڈالا تھا۔ نہ اِزَم کو خبر ہو سکی نہ اس گھر کے کسی اور فرد کو اور رجاؤ سجادان سب کے لیے لازم و ملزوم ہوتی چلی گئی۔

خالہ کی بیماری کے دوران رجاؤ سجاد کی ہمدردی، محبت، خلوص اور ایثار کے سب قائل ہوتے چلے گئے تھے۔ اریبہ، رجاؤ کا دم بھرنے لگی تھی اور ارقام اور آدیز بھی اس کی سادگی اور نرم دلی کے قائل ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے وہ ان سب کے دلوں میں اپنا مقام بنا چکی تھی۔

پھر ان ہی دنوں اس کے امی اور بابا جان فضائی حادثے کا شکار ہو گئے۔ شطرنج کی بساط پر مرضی کے مہرے رکھنے والی ان دولڑکیوں کی زندگی میں یکدم بھونچال آ گیا کچھ عرصہ تک وہ غم اور صدمے کے زیر اثر پوری دنیا سے کٹ کر رہ گئیں۔

ہر ٹھوکرا انسان کے سنہلنے کے لیے ہوتی ہے اگر کوئی سنہلنے کی خواہش رکھتا ہو مگر رخصتی اور رجاؤ نے اس صدمے سے بہت جلد پیچھا چھڑا لیا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ اوصاف اوکاڑہ چلا گیا ہے۔ رجاؤ اب تنہا تھی اور اس کی عزیز از جان بہن اپنی باپردہ اور نرم دل بہن کو اپنے گھر لے آئی تھی کتنا اذیت ناک تھا ان دونوں کے بہروپ زدہ چہرے دیکھنا اور پھر ہمیشہ کے لیے دیکھنا نہنا۔

سیاہ گاؤں اور سیاہ حجاب میں لپٹی رجاؤ، وزیلہ بھابھی سے مل رہی تھی۔ آنسو بہا رہی تھی پھر وہ میری طرف بھی آئی تھی مگر میں نے اک تنفر بھری نگاہ اس کے وجود پر ڈالی اور امی کے لیے پانی لے کر اوپر چلی گئی۔

کھلتے نقاب چڑھار کھے تھے ان دونوں بہنوں نے اپنے چہروں پر اتنے نیک ماں

باپ کی اولاد اس قدر بد فطرت تھی۔

ماں باپ کی پابندیوں میں جکڑی رخصتی تو آزاد ہو چکی تھی مگر رجاؤ نے بھی ان کے آنکھیں بند ہونے کے بعد نئے زمانے کے رنگ ڈھنگ اپنانے میں دیر نہیں کی تھی۔

رخصتی تو پردے سے پیچھا چھڑا چکی تھی البتہ رجاؤ ابھی تک بہروپ بھرے اِزَم کی نظر میں پردے کی بو بون کر اپنا الگ سے مقام بنانا چاہتی تھی۔ کتنی محنت، لگن اور کوششوں کے بعد وہ اِزَم کو اپنی طرف متوجہ کر سکی تھی یہ تو رجاؤ کا دل ہی جانتا تھا۔

بہت زیادہ روک ٹوک بھی باغی کر دیتی ہے اور یہ بغاوت تو رجاؤ کے اندر اپنے ماں باپ کے موجود ہوتے ہی پنپنے لگی تھی۔ وہ اپنے خاندان سے سالوں پرانی روایات سے، پابندیوں سے نفرت کرتی تھی۔ ذرا سادہ بچہ کھلنے پر اس نے اپنے رنگ بدل لیے تھے یہ رنگ اس کے اندر پہلے سے ہی موجود تھے۔

باپ کے خوف سے بظاہر اس نے خود کو نفیس اور عمدہ لباس میں چھپا رکھا تھا۔ البتہ خود غرضی اس کی فطرت میں شامل تھی۔ خود پسندی کی جھلک اس کی شخصیت میں واضح نظر آتی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ انتہا پسند بھی تھی اس کے اندر حسد کے جراثیم بھی تھے وہ بد فطرتی اور کمینگی کی انتہاؤں پر تھی۔

بہت سال بعد رجاؤ نے ایک مرتبہ بتایا تھا۔

”رخصتی کی شادی میں اِزَم کو دیکھ کر میں اس کے عشق میں مبتلا نہیں ہوئی تھی۔ بات تو اس سے بھی پرانی ہے۔ یاد کرو ایک دفعہ تم نے منگنی کی تصویریں مجھے دکھائی تھیں۔ میں تو تصویر میں اِزَم کو تمہارے برابر بیٹھا دیکھ کر لٹو ہو گئی تھی۔ پہلی نظر کی محبت نے اِزَم کی تصویر دیکھ کر گھائل کر دیا تھا اور جب میں نے جان لیا کہ میں اِزَم کو کبھی بھی تمہارا ہوتا نہیں دیکھ سکتی تو میں نے اِزَم کو تم سے چھین لیا۔ دیکھو، ہر خوشی پلیٹ میں جی سبائی تو نہیں ملتی نا۔ کبھی کبھار خوشی کو چھین کر حاصل کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال تم کیوں خود کو ضائع کر رہی ہو۔ کیا اِزَم پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تم بہت خالص جذلوں اور دل کی گہرائیوں سے اسے چاہتی ہو تو یہ عمر یا گونا گونا بڑے کاڑھے۔ اس کا دل کبھی بھی تمہاری طرف سے صاف نہیں ہو سکتا۔ کم از کم میرے ہوتے ہوئے تو کبھی بھی نہیں۔ اوصاف سے محبت کا اعتراف تو تم نے خود کیا تھا نا۔ اس کی ماں کے سامنے۔ پھر یہ جوگ لینے کا بھلا کیا فائدہ ہے۔ وہ اوصاف بھی میرے فراق میں دیوانہ بنا پھر رہا ہے۔ تم بھی اِزَم کی

جدائی میں سلگ رہی ہو۔ تم دونوں اگر شادی

”بکواس بند کر دو رجاء! اور کبھی میری راہ میں کھڑے ہو کر حساب کتاب نہ کرنا بڑا زہر بھر چکا ہے میرے اندر کہیں تمہیں بھی زہر آلود نہ کر دوں“ میں پاگلوں کی طرح چلانے لگی تھی اور رجاء بھوں پر چمکتی مسکان لیے گنگناتے ہوئے پلٹ گئی تھی۔

☆☆☆

احزم اور رجاء کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ سننے میں آیا تھا کہ ہمان بھائی نے اپنی بہن کی طرف سے ملنے والی ذلت کو دھونے کی غرض سے اپنی سابی کا رشتہ احزم سے طے کر دیا تھا۔

بقول ہمان بھائی کے ان کی بہن تو احزم کے قابل ہی کہاں تھی۔ احزم جیسے نمازی، پرہیزگار، صوم و صلوة کے پابند پارما آدمی کے لیے رجاء جیسی باپردہ، باحیا اور سیدھی سادی شریک حیات ہونی چاہئے میرے جیسی نہیں جو اپنے منہ سے کسی غیر مرد سے محبت کا اعتراف کر رہی تھی۔

اور وزیلہ بھابھی کہتی تھیں نیک مردوں کے لیے نیک عورتیں اور بد مردوں کے لیے بد عورتیں، احزم کو تو خدا نے دنیا میں ہی جنت کی خور سے نوازا دیا ہے۔

جس دن احزم کی شادی تھی اسی دن امی کو ایک مرتبہ پھر سانس کی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ امی کس قدر اذیت میں تھیں۔ وہ خالہ کے گھر جانا چاہتی تھیں۔ وہ خالہ کو ان مکار لوگوں کی مکاری کے متعلق بتا دینا چاہتی تھیں۔ وہ مجھے اس جال میں سے نکالنا چاہتی تھیں، جو میرے ارد گرد بن دیا گیا تھا۔ مگر وہ بے بس بھی تو انتہا کی تھیں۔

خالہ کی صحت بھی دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ ان کی زبان میں لکنت آگئی تھی۔ گردن توڑ بخار اپنے بد اثرات چھوڑ گیا تھا۔

رجاء شادی کے بعد کئی مرتبہ ہمارے گھر اپنی بہن سے ملنے آئی تھی۔ پھر وہ احزم کے ساتھ اشاک ہوم چلی گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ بے انتہا خوش تھی۔ اس خوشی کے احساس نے رجاء کو حسین تر بنادیا تھا۔ رجاء کے اشاک ہوم جاتے ہی مجھے خالہ کے گھر کی اجازت مل گئی تھی۔ امی مجھے زبردستی خالہ کے پاس بھیج دیتی تھیں۔ حالانکہ آویز اور ارقام کی نظروں کا سامنا کس قدر مشکل لکھا اور جب کبھی آویز لمحہ بھر کے لیے رک کر ٹھہر کر پوچھتا۔

”افزاء! تم نے ایسا کیوں کیا؟“

اور میرا دل چاہتا تھا گریبان پھاڑ کر سر میں خاک ڈالے جنگلوں کی طرف بھاگ جاؤں۔ جہاں کوئی میرے زخم ادھیرنے کی کوشش نہ کرے۔ کوئی مجھ سے یہ سوال نہ پوچھے کہ ”افزاء! تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟“

وقت کی دھول میں افزاء ایوب بھی مٹی ہو رہی تھی خالہ کی موت کی خبر نے امی کو تو ذکر رکھ دیا تھا اور میں وقت کی دھول میں اپنے پیاروں کو کھوتے دیکھ رہی تھی۔ چار سال بیت گئے تھے امی کی صحت پہلے سے بہتر تھی۔ ہمایوں بھیا اور وزیلہ بھابھی کراچی سے آگئے تھے۔ ان کی گود میں ننھا نومی قلقلیاں مار رہا تھا۔ ان چار سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ مگر رجاء اور خوشی کی گود ہنوز خالی تھی۔

آویز جاب کے بعد بہت ذمہ دار اور مصروف ہو گیا تھا۔ اریبہ گریجویشن کے بعد فارغ تھی۔ ارقام بھی یونیورسٹی کے آخری سال میں تھا۔ ان چار سالوں میں احزم واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے امی کی ناراضی کے باوجود ایک سکول میں جاب کر لی تھی۔ امی بھی مجھے مصروف دیکھ کر کچھ مطمئن ہو گئی تھیں۔ تاہم انہیں میری بے رنگ زندگی کا صدمہ دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔

یہ اس وقت کی بات تھی، جب احزم اور رجاء کو آئے دو تین مہینے ہو گئے تھے۔ وہ دونوں آویز کی شادی کے سلسلے میں آئے تھے۔ رجاء کو میں نے تقریباً چار سال بعد دیکھا تھا وہ بہت الجھی الجھی اور اداس دکھائی دے رہی تھی۔ نجائے کیا بات تھی رجاء کے چہرے پر شکستگی کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ حالانکہ خوشحالی اور آزاد فضاؤں کی کھلی کھلی آب و ہوا نے اس کے سن کو نکھار بخشا تھا۔

میں رجاء سے اس قدر تپاک سے ملی تھی کہ وہ لمحہ بھر کے لیے حق و دق رہ گئی۔ میں نے غور کیا تو رجاء کے چہرے پر عجیب سے خجالت اور کچھ بہم سائیاں کا احساس نظر آیا۔ پھر یہ میرا معمول ہی تو بن گیا تھا رجاء کی آمد کے ساتھ میری خوش اخلاقی عروج پر ہوتیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ اعتماد بحال ہو گیا تھا۔

آویز شادی سے پہلے کارڈ دینے آیا تھا نجائے کیوں ایک جھجک سی ہم دونوں کے درمیان حائل ہو چکی تھی۔

”بہت سالوں سے سوچ رہا ہوں غور کر رہا ہوں یوں لگتا ہے کسی حاسد کی بد نظری نے۔“

ہماری خوشیوں کو نگل لیا ہے کیا تمہیں نہیں محسوس ہوتا افزاء! کوئی تو ہے جس نے ایک ڈرامہ ترتیب دیا تھا، ڈائریکٹ کیا تھا، تحریر کیا تھا اور اس ڈرامے کی واحد کردار تم تھیں اور تم نے وہ ہی سب کچھ بولنا تھا جو تم سے کہا گیا تھا نجانے کیوں، میں اس ڈرامے میں سچائی کو ابھی تک ڈھونڈ رہا ہوں۔ کیا تم مجھے سچ بتا دو گی افزاء؟ میں تمہی سے مسکرا دی۔

”کون سا سچ؟“ میں نے انجان پن کی انتہا کر دی تھی۔

”تم کیوں خود کو تباہ کر رہی ہو“ آویز دکھ کے احساس سے بوجھل آواز میں بولا۔

”تمہیں میرے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں“

”جو خود اپنے لیے عذاب خریدتے ہیں انہیں کسی خسارے کا احساس کیا دلانا“ آویز رنجیدہ تھا افسردہ تھا اور شاید اسی الجھی تھی کو سلجھانا چاہ رہا تھا۔

”میں نے خسارے گنتے چھوڑ دیئے ہیں“

”شاید اسی لیے پرسکون ہو گئی ہو اچھا کیا ہے زندگی گزارنے کے لیے کسی بہلاوے کا ہونا ضروری ہے۔“

آویز کچھ دیر مزید بیٹھنے کے بعد چلا گیا تھا۔ اور میں اس کی باتوں کے مفہوم میں گم تھی۔

☆☆☆

آویز کی شادی سے دو روز پہلے میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ایکسیڈنٹ اتنا شدید تھا کہ میری ٹانگ تین جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ سر پر الگ گہرے زخم آئے تھے۔ دایاں بازوی بھی فریکچر تھا۔ ہسپتال میں دو مہینے کی ٹریٹمنٹ اور باقاعدہ علاج سے میری صحت بحال ہو رہی تھی۔ اس دوران بھیا کے دل میں نجانے کیسے سوئی محبت کے طوفان اٹھنے لگے تھے وہ پہلے کی طرح مہربان ہوتے چلے گئے تھے البتہ ہمان بھائی کا رویہ اول روز کی طرح تھا مگر میرے ساتھ ہونے والے اس حادثے نے ہمان بھائی کو اپنی کچھ زیادتیوں کا احساس دلایا ہی دیا تھا۔ وہ روزانہ ہی مجھے دیکھنے ہسپتال آنے لگے تھے۔ ہسپتال کا بل وغیرہ بھی اور اسلام آباد سے میرے چیک اپ کی غرض سے بلوائے ڈاکٹر کی فیس بھی دونوں بھائیوں نے دی تھی۔

امی بھی اس کا یا پلٹ پر حیران تھیں تاہم بیٹوں کے رویوں نے انہیں پھر سے توانا کر دیا تھا۔ میں نے دریچہ بند کر کے تلخی یادوں کی کتاب کو بھی بند کرنا چاہا تھا مگر یادیں کہاں پیچھا چھوڑتی ہیں بلکہ یہ تو درد مسلسل کی طرح تمام عمر ساتھ دیتی ہیں۔ اس یادوں کی کتاب میں کچھ

آنسو ابھی میرے لیے موجود تھے اور یہ بہار کے اوائل دنوں کی بات تھی۔

رختی کو پورے چار سال بعد خوشخبری ملی تھی شاید اسی لیے اس کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے ان دنوں رجا بھی واپس جانے والی تھی۔ شام کو وہ رختی سے ملنے آئی تھی۔ میں کچن میں چائے بنا رہی تھی اور وہ دونوں کچن سے ملحقہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ میں نے جوتے کی نوک سے تھوڑا سا دروازہ کھول دیا تھا مجھے ان کی آوازیں با آسانی سنائی دے رہی تھیں۔

”تم نے کسی ڈاکٹر سے کنسلٹ کیوں نہیں کیا اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟“ رختی بہن کو ناراضی سے مشورے دے رہی تھی۔

”ایک سو میس ڈاکٹر سے چیک اپ کروا چکی ہوں۔ سب کہتے ہیں، میں بالکل فٹ ہوں۔ یہ اللہ کی طرف سے دیر ہے“ رجا کی پڑمردہ سی آواز سنائی دی۔

”کیا مطلب؟ تم فٹ ہو تو پھر پرالیم کیا ہے؟“ رختی نے الجھ کر پوچھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ رجا کی گود بھی جلد از جلد بھر جائے۔

”پتا نہیں“ رجا کی آواز میں بیزاری تھی۔ ڈاکٹر کے ذکر پر مجھے امی اور ڈاکٹر زرین کے مابین ہونے والی گفتگو کا خیال آیا۔ میں سر میں اٹھتی ٹیسوں کو دباتی، یادوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے نکلنے لگی تھی جب رختی کی دہلی دہلی آواز سنائی دی۔

”تم کو احزم سے کہنا چاہئے تھا۔ وہ اپنا چیک اپ کرواتا۔ چیک اپ میں کون سا حرج ہے“

”مرد بھلا کہاں مانتے ہیں اور احزم کو اس معاملے میں رضامند کرنا مشکل ہے“ میں نے ڈرا سا دروازے کی جھری میں سے جھانک کر دیکھا۔ رجا محبت کے حصول کے لیے پاگل ہوتی اور دوسروں کے جذبات کو کچلنے والی، ضدی اور خود سر رجا نہیں، ایک عورت دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے اک گہری سانس خارج کر کے امی کے کمرے کا رخ کیا تھا امی بے خبر سو رہی تھیں اور ان کے چہرے پر نیند کی حالت میں بھی غم کے سائے لہرا رہے تھے۔

”آخر ڈاکٹر زرین نے امی سے کیا کہا ہے“ میں سوچتے ہوئے پلٹ آئی تھی۔

☆☆☆

اتوار کی شام آویز اور ارقام آئے تھے۔ آویز کی بیوی کائنات بھی تھی۔ اریہ کا رشتہ طے ہو گیا تھا اور وہ امی کو اسی سلسلے میں لینے کے لیے آئے تھے۔ اریہ کے سسرال رسم کی غرض

سے جانا تھا۔

صرف تین ماہ بعد احرام اور رجاہ اریہ کی شادی کے لیے آئے تھے اکلوتی بہن کی خوشی تھی۔ سو آویز اور ارقام تو بہت مصروف تھے اور امی بھی خالہ کے گھر چلی گئی تھیں۔ البتہ میں نے اسکول کا بہانہ کر دیا تھا۔

اریہ کی شادی میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسکول کی مصروفیات کے علاوہ نہاں اور نونہ کو ہوم ورک کروانا، ان کے لیے کوکنگ وغیرہ کرنے کے دوران وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا تھا۔ امی کے بے حد اصرار کے باوجود میں شادی کے لیے تیار نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی بھی خوشی کا صفحہ بھاڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود وزیلہ بھابھی اپنے بھائی کا رشتہ لے آئی تھیں جو کہ دو بچوں کا باپ تھا کبھی وہ کسی کزن کے سرالیوں میں میری شادی کروانے کے لیے ہمایوں بھائی کے سر ہو جاتیں۔ کبھی اپنی کسی بہن کے جیٹھ کے سر مجھے منڈھنے کو تیار ہو جاتیں۔

رکشی بھی جلد از جلد مجھے نبٹانا چاہتی تھی مگر اس کی نظر میں میرے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ وہ بڑی مکاری کے ساتھ امی سے اپنے تعلقات بحال کر چکی تھی اریہ کی شادی کے ہنگامے سرد پڑے تو امی واپس چلی آئی تھیں وہ اب بھی بہت خاموش اور پراسرار دکھائی دیتی تھیں۔ مجھے خبر نہیں ہو سکی تھی کہ امی بالابھی بالا کون سے معاملات طے کر رہی ہیں پتا تو اس وقت چلا تھا جب امی نے بہت دبی آواز میں نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے“

”کس کے ساتھ کون ہے؟“ میں یکدم مشتعل ہو کر چلا اٹھی۔

”پہلی بیوی فوت ہو چکی ہے۔ تین بچے ہیں۔ درمیانی عمر کا مرد ہے“ امی کا لہجہ لکنت

زدہ ساتھ تھا۔

رکشی اس معاملے سے الگ تھی تاہم اس کی شدید خواہش تھی کہ جلد از جلد میری شادی ہو جائے ہم آج بھی ایک دوسرے سے بات کرنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ زندگی میں اگر میں نے کسی سے نفرت کی تھی تو وہ رکشی تھی۔ مجھے اس سے بے حد و حساب نفرت تھی۔ میرا بس چلتا تو تمام عمر کبھی اس کی صورت نہ دیکھتی۔

”افزاء! میرے بندھے ہاتھوں کو دیکھ کر اس رشتے کے لیے ہامی بھرو۔ میری زندگی کا بھروسہ نہیں اور میں تمہیں شادو آباد دیکھنا چاہتی ہوں اور پھر تم بھی تو“ وہ روتے روتے

ایک لخت خاموش ہو گئی تھیں۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟ بتائیے امی! کون سی بات نے آپ کو یہ انتہائی فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ آخر بات کیا ہے؟ ڈاکٹر زین نے آپ سے کیا کہا ہے؟“ میں امی کے گھٹنے پر سر رکھے بے اختیار پوچھ رہی تھی امی کی خاموشی یہ پراسراریت، اور ایک دم ہی میری شادی کا فیصلہ میری چھٹی حسن کچھ اور اشارہ کر رہی تھی۔ میں خود کو ایک اور بڑے صدمے کے لیے تیار کرنے لگی۔

”کک..... کچھ بھی تو نہیں“ وہ ہلکانے لگی تھیں۔

”پلیز امی! مجھ سے کچھ مت چھپائیے“ میرے آنسو ایک تواتر سے گر رہے تھے، حالانکہ میں نے نہ رونے کا عہد خود سے کر رکھا تھا۔

”اس ایکسیڈنٹ نے تم سے ماں بننے کی صلاحیت چھین لی ہے“ امی پھبک پھبک کر رو دی تھیں، جب کہ میرے پیروں تلے سے بھی زمین دھیرے دھیرے کھٹکنے لگی۔

”کک، کیا کہہ رہی ہیں امی!“ میرے لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

”ہاں، ڈاکٹر زین نے مجھے یہی بتانے کے لیے روکا تھا“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولیں ”میں نے بہت سوچا ہے۔ ہر پہلو پر غور کیا ہے تب ہی یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی ہوں۔ دیکھو بیٹی! حقیقت کتنی تلخ کیوں نہ ہو ایک دن سامنا تو کرنا ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ میری بیٹی کس قدر بہادر ہے۔ جب اپنے دل کو نکال کر رکشی کی بہن کی ہتھیلی پر سجا دیا تھا تو پھر اور بھی بے شمار غم تمہیں کبھی بھی تو نہیں سکتے۔ ثقلین تین بچوں کا باپ ہے اسے بچوں کے لیے ماں چاہئے۔ مزید اولاد نہیں اور میں چاہتی ہوں“

”پلیز امی“ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا۔

”تم خوب سوچ سیکھ کر فیصلہ کرو“ وہ میرے بال سہلا رہی تھیں۔

”فیصلہ کیسا فیصلہ“ میں رونے لگی تھی۔ نجانے اور کتنے امتحان باقی تھے۔ اور میری آنکھوں سے چار سال بعد پھر سے برسات کی ایسی جھڑی لگی تھی جس نے سارے غم سارے صدمات ساری اذیتیں تمام تر ذلتیں بھلا ڈالیں۔

☆☆☆

اس اندھیری رات کے بعد میرے لیے سحر تھی۔ میری زندگی میں پھر سے ایک عجیب موڑ آیا تھا رکشی اور رجاہ کی بچھائی بساط کے سارے مہرے بغیر چاہ کے میرے ہاتھ چلے آئے تھے۔

کس طرح؟  
کیونکر؟

میں ان سوالیہ نشانوں کے گرداب میں چکر لگانے کے بجائے بہت سوچ و بچار کے بعد بازی اٹھنے والی تھی مات کرنے والوں کو شہ مات کا ڈانٹ بھی چکھنا تھا۔ یہی دنیا کا قانون ہے۔  
میں وہ جواری ہوں جو سب کچھ لٹا کر بھی مالا مال ہے اور رجا سب کچھ پا کر بھی خالی ہاتھ ان خالی ہاتھوں نے ہمیشہ خالی رہنا تھا۔

زندگی میں سب کو ایک موقع ضرور دیا جاتا ہے رجا کو بھی یہی موقع ملا تھا، اس نے اپنی شاطرانہ ذہنیت کی وجہ سے تمام مہرے اپنے ہاتھ میں کر لیے تھے مگر اس میں بھی سراسر میرا تصور تھا۔ مجھے اس کے ہاتھوں مات ہوتی رہی، بہت شوق سے بڑی چاہ سے۔  
وہ پورا کالج چھوڑ کر میری طرف کیوں بڑھی تھی؟ یہ بات آج سے پہلے میں نے کبھی سوچی نہیں تھی۔ مگر جب ”آگہی“ کے عذاب اترتے ہیں تو سوچیں تک لبو لبان ہو جاتی ہیں۔

ہماری دوستی کے ان چار سالوں میں رجا نے ہر طرح سے مجھے ہی لوٹا تھا۔ میں بہت حسن پرست واقع ہوئی ہوں۔ میری اس کمزوری کو رجا اول روز سے جان گئی تھی۔ میں بہت بدھو اور احمق تھی۔ یہ میری دوسری کمزوری تھی۔ جس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں رجا کے ظاہر پر فریفتہ ہو گئی تھی یہ میری تیسری کمزوری تھی وہ پہلی نظر میں مجھے کس مقدس، پاکیزہ روح کی طرح لگی تھی۔ بہت نیک، وضع دار گھرانے کی باپردہ لڑکی۔ دل خود بخود ایسی لڑکی سے دوستی کے لیے چل اٹھا تھا اور رجا بھی گویا تیار بیٹھی تھی۔

گزرے چند سالوں پر غور و فکر کروں تو بہت سی غیر واضح چیزیں بھی واضح ہونے لگتی ہیں رجا کے باپ کا تعلق اس بازار سے تھا۔ شریف ایماندار اور اصولوں پر جان دینے والے اس بازاری باپ نے خود پر اچھائی کا لبادہ چڑھا رکھا تھا۔ وہ بیٹیوں کوڑے میں سجا کر پیش کرنے والوں میں سے تھا۔ نہ ہی بیٹیوں کے گاہک گھر بلاتا تھا وہ سمجھ دار تھا اچھے گھرانوں کے بہترین لڑکے پھانسنے کے بعد بیٹیوں کو روایتی انداز میں رخصت کر کے تمام زیورات، پیسہ اور حق مہر کی رقم وصول کر لینے کے بعد خلع کا کیس کر دیتا تھا۔

رجا کی دو اور بڑی بہنیں بھی تھیں جو کم عمری میں خودکشی کر چکی تھیں وہ دونوں ہی شادی کے کچھ عرصہ بعد باپ کی مہربانی سے خلع یافتہ ہو چکی تھیں۔

بیٹیوں کی خودکشی کے بعد سجاد نے شاید دل سے توبہ کر لی تھی اور اس کے بعد اس نے چھوٹی دونوں بیٹیوں پر پھرے بٹھا دیے۔ وہ اپنی ان بیٹیوں کا سودا نہیں کرنا چاہتا تھا انہیں شریف خاندان میں بیاہ کر شاید بڑی بیٹیوں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تلافی کرنا چاہتا تھا اور اس نے بڑی بیٹیوں کے توسط سے اتنا کچھ کمایا تھا کہ باقی زندگی آرام اور آسائش سے گزر سکتی۔ تاہم منافق اور کمینے باپ کی بیٹیاں جن کے لبو میں خود غرضی رچی بسی تھی، وہ کیسے ڈے بغیر رہ سکتی تھیں۔  
سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ رجا اور رختی بھی اپنے باپ کی اصلیت سے ناواقف تھیں۔ ان کی ماں ایک شریف زادی تھی، جو سجاد کی وجاہت اور حسن پر فریفتہ ہو کر دنیا سے کنارہ کر چکی تھی۔ اس عورت کی آنکھوں میں موجودنی صرف پچھتاوا بن کر چمکتی تھی اور اسی پچھتاوے کے زیر اثر اس نے تمام عمر ایک خاموشی کی بکل میں گزاری تھی یہ تمام حقیقت مجھے کیسے معلوم ہوئی۔ میں رختی کے باپ کے ماضی سے کسی طرح آگاہ ہوئی؟

☆☆☆

صبح ڈاکیا ایک رجسٹری دے کر گیا تھا یہ تمام مواد اسی رجسٹری سے برآمد ہوا تھا اور اسے بھیجے والے کا نام اوصاف تھا۔ رجا کا خالہ زاد بھائی۔ اس کا منگیترا اور اسے ابھی تک بے حد وحساب چاہنے والا۔

یہ شدت کی چاہت اب نفرت اور انتقام میں بدل چکی تھی۔  
شاید محبت اور نفرت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

رختی اور رجا کی مشترکہ کوششوں سے امی ان کے چنگل میں پھنس گئی تھیں۔ ان کی خواہش کے عین مطابق میں اور امی رختی کو گھر لانے کے لیے دل و جان سے تیار ہو گئے رجا کے باپ نے بیٹی کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے تحفظ کے طور پر ہمان بھائی کے ہاتھ پیر باندھ دیے تھے کہ وہ چاہ کر بھی کبھی کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔

یہ میری بد قسمتی تھی کہ رجا کا دل بری طرح احزم میں الجھ گیا، اور اسے پانے اور حاصل کرنے کے چکر میں وہ دوستی جیسے عظیم، انوٹ رشتے کو بھی پیروں تے روند گئی تھی۔

اب رختی اور رجا کی بچھائی بساط کے سارے مہرے خود بخود میرے حق میں ہو گئے تھے۔ اوصاف نے خط کے اختتام میں صرف اتنا لکھا تھا۔

”وہ بری ہے بہت بری ہے اس نے تمہارا دل اجاڑ ہے اس نے تمہاری ہنسی کو چھینا

ہے اس نے تمہیں قید تنہائی کے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے میں سب جانتا ہوں وہ احزم کو پانے کے لیے پاگل ہو رہی تھی اور اس نے رخصتی کو دھکیلیاں دے کر آمادہ کیا تھا کہ وہ احزم کو تم سے متفر کر دے ورنہ وہ ہمان کو رخصتی کے متعلق سب کچھ بتا دے گی یہ بھی کہ رخصتی ایک بوڑھے شخص کی منکوحہ بھی رہی ہے یہ نکاح میرے بے غیرت خالو کو ایک بلیک میل کے خوف سے کرنا پڑا تھا مگر جلد ہی وہ بڑھا اس جہان سے کوچ کر گیا اور ماموں کی جان شکنجے سے نکل آئی۔

رخصتی کو رجاہ کی دیوانگی نے مجبور کیا تھا اور اپنا گھر بچانے کے لیے وہ خود غرضی کی انتہاؤں تک پہنچ گئی تھی۔ ورنہ تمہاری فیملی کا حصہ بنا رخصتی کا ایک ایسا خواب تھا جسے تعبیر تمہاری امی نے بخشی تھی۔ رخصتی تمہیں بہت پسند کرتی تھی۔ اکثر مجھ سے تمہاری معصومیت، سادگی اور نرم دلی کی باتیں کرنے لگتی رجاہ شروع سے خود غرض، جلد باز اور ضدی رہی ہے مگر رخصتی ایسی نہیں تھی اسے رجاہ نے برا بننے پر مجبور کر دیا تھا ہونکے تو اسے معاف کر دینا۔

یہ خط لے کر سب سے پہلے میں رخصتی کے بیڈروم میں پہنچی تھی تمام مہروں کو بڑی ذہانت اور فہم و فراست سے چلنا تھا میری ذرا بھر غلطی کسی نقصان سے دو چار کر سکتی تھی بہر حال میں رخصتی کو کسی عظیم نقصان یا صدمے کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میری رنگوں میں شریف اور باحیاب کا خون دوڑ رہا تھا جس نے مجھے خود غرضی، منافقت اور ظلم کرنا نہیں سیکھایا تھا۔ نہ میں ظلم کر سکتی تھی نہ ظالم کہلا سکتی تھی، ورنہ یہی خط اگر ہمان بھائی کے دفتر پہنچا دیتی تو رخصتی اس چھت تلے ایک سانس بھی نہیں لے سکتی تھی۔

وہ خط پر نظریں جمائے ساکت کھڑی تھی اس کی رنگت نے نجاب نے کتنے ہی رنگ بد لے تھے اور پھر دوسرے ہی پل وہ سکنے لگی تھی۔

”مم..... مجھے معاف کر دو افزاء! تم نہیں جانتی، اس ذلیل رجاہ نے مجھے کس قدر مجبور کر دیا تھا میں بے بس ہو چکی تھی۔ افزاء! ہمان کو کچھ مت بتانا۔ میں تمام عمر تمہاری ممنون رہوں گی۔ ابھی تو تمہارے ساتھ کی گئی زیادتی کا پچھتاوا چہن نہیں لینے دیتا۔ وہ لہرا کر زمین پر گرے لگی تھی جب میں نے سرعت سے اسے تھام لیا۔

”کتنا ترس آ رہا ہے مجھے تم پر“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا ”بہر حال، میں تمہاری طرح بے غیرت یا بے ضمیر نہیں ہوں لیکن میں تمہیں معاف نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑا ہے شک اس کی پکڑ بڑی شدید ہے“

”افزاء! تم“ وہ روتے ہوئے میرے سامنے ہاتھ باندھنے بیٹھ گئی تھی۔ میں نے دل میں اٹھتے رد کی پروا کیے بغیر گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل آئی۔ یہ اسی شام کی بات ہے جب آویز کی بیوی کائنات ایک بچے کو جنم دے کر کسی پیچیدگی کے باعث وفات پا گئی تھی اور رخصتی بیڑھیوں سے گر کر اپنا بچہ کھو بیٹھی تھی ساتھ ہی ڈاکٹر نے اس کو دوبارہ ماں نہ بننے کی خبر بھی سنا دی تھی۔ میں اور امی خالہ کے گھر رہنے کی غرض سے آگئی تھیں اریہ بھی اپنے سسرال سے آگئی تھی گھر میں خاموشی اور سناٹے تھے یا پھر ننھے نولود کی سسکیوں اور آہوں کی آوازیں۔ میں نے لپک کر ننھے شمعون کو سینے میں بھینچ لیا تھا اور میری پیاسی متاسیراب ہوتی چلی گئی۔

شمعون کو میں ساتھ لے آئی تھی اور ننھا شمعون میری ذمہ داری بن گیا تھا آویز کائنات سے دائمی جدائی کے صدمے کے زیر اثر شمعون سے لاپرواہ ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں دنوں رجاہ اور احزم ہمیشہ کے لیے واپس آ گئے تھے اور میں خود کو رجاہ سے خاص ملاقات کے لیے تیار کر رہی تھی، جب ایک اور انکشاف میری روح تک کو ہلا گیا۔

☆☆☆

میں شمعون کو سلا کر اور امی کو بتا کر خالہ کے گھر آگئی تھی معمول کے مطابق گھر میں سناٹوں کا راج تھا کبھی یہ گھر خوشیوں کا گوارہ اور ہنگاموں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ آج ہر طرف دیرانی بکھری ہوئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ جہاں گھر میں ہوگی مگر وہ کسی ڈاکٹر سے ملنے گئی تھی ابھی تک وہ ڈاکٹر اور علاج کے چکروں میں بھاگ رہی تھی بیروں فقیروں کے آستانوں پر بھی دستک دے کر دیکھ لیا تھا۔ میرے قدم رجاہ اور احزم کے مشترکہ بیڈروم کی طرف اٹھے تھے اس وقت احزم دفتر جا چکا ہوتا ہے اس بات کا مجھے یقین تھا مگر میری توقع کے خلاف احزم گھر میں تھا اور اس وقت اپنے کمرے میں تنہا تھا اس کی آواز بہت دبی دبی تھی اور وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

”میں نے زندگی سے کچھ حاصل کرنا اس وقت چھوڑ دیا تھا جب افزاء میری نہیں رہی تھی میرے منہ پر کسی اور کے ساتھ کا اعتراف کر چکی تھی ایسا کیونکر ہوا تھا میں بچپن سے اسے جانتا ہوں افزاء اس قسم کی لڑکی نہیں۔ مگر اس وقت کے حالات ایسے تھے کہ کچھ سوچنے سمجھنا اور غور و فکر کرنے کا خیال نہیں آیا۔ مگر کل شام رجاہ نے عجیب سی باتیں کی تھیں ان ڈھکی چھپی باتوں کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ افزاء پر بہتان لگا کر اس نے مجھے حاصل کیا تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ نامراد اور



خالی گود بھی وہ افزاء کی بد دعاؤں کی وجہ سے ہے۔ دل ہی دل میں یہ اعتراف مجھے غم اور خوشی دونوں احساسات میں مبتلا کر گیا۔

غم یہ کہ افزاء اور میرے درمیان بدگمانی کی چادر کسی اور نے نہیں رجا۔ تان دی تھی، صرف اور صرف میرے عشق میں دیوانی ہو کر خوشی اس بات کی تھی کہ میرے جیسا شخص کس قدر خوش قسمت ہے جو بیک وقت دو عورتوں کا محبوب ہے افزاء جو ابھی تک کسی بھی شخص کا ساتھ قبول نہیں کر پائی تھی۔ اس کے دل پر کھدا اپنا نام بغیر پڑھے بھی میں جانتا ہوں کہ میرے علاوہ کسی اور کا تصور اس کے لیے محال ہے اور میں بھی بہت بچپن میں اس کے نام کو اپنے نام کے ساتھ جڑا سن کر اس پر اپنا حق سمجھ بیٹھا تھا یہ نہیں جانتا تھا کہ کاتب تقدیر نے ہمارے لیے کچھ اور ہی لکھا ہے۔ وہ میری محبوبہ تھی، جو بیوی کی موجودگی کے باوجود ہمیشہ محبوبہ ہی رہی۔ پہلی محبت اور دل پر لکھا پہلا پہلا نام کبھی تمام عمر نہیں مٹ پاتا۔ افزاء میرے لیے ہمیشہ روح افزاء ہی رہی۔ میری روح کو تقویت دینے والی مجھے ہمیشہ ایک یاد میں جکڑے رکھنے والی افزاء میں نے ہمیشہ اسے یادوں میں زندہ رکھا تھا اور یہی بات رجا کہہ رہی تھی۔

رجاء کے خیال میں افزاء کی بد دعا کی وجہ سے پوری طرح صحت منت ہونے کے باوجود وہ ماں نہیں بن سکی۔ وہ احمق جانتی نہیں کہ ہر طرح سے مکمل احزم عباس اسے ماں بنانے کی صلاحیت سے محروم ہے مرد بھی بانجھ ہوتے ہیں۔

وہ کمال اعلیٰ ظرفی سے مجھے دوسری شادی اور افزاء سے شادی کی اجازت دے رہی تھی اس نے تمام اعتراف کر کے خود کو افزاء کا مجرم قبول کر لیا تھا وہ سزا کے لیے بھی تیار تھی اور میں اس سے کچھ بھی کہہ نہیں پایا۔ اپنی کمزوری کا ذکر کسی سے بھی کرنا بہت اذیت ناک ہے مبین! میں جانتا ہوں باقی کا سفر میں نے تنہا کرنا ہے اسی لیے رجا کو طلاق دے چکا ہوں۔ وہ یہاں سے روتی گئی ہے خود کو ختم کرنے کی دھمکیاں دے رہی تھی ملا کی جذباتی ہے اور شاید نئی زندگی کے آغاز کے بعد اس کی میرے حصول سے بھی بڑھ کر جنوبی خواہش پوری ہو جائے۔ بہر حال اسے ماں بننے اور اپنی تکمیل کا شوق دھیرے دھیرے پاگل بنا رہا تھا کوئی بچہ وہ ایڈاپٹ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ سوڈا کڑے مشورے کے بعد میں نے اسے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا۔

احزم خاموش ہو گیا تھا شاید اس نے فون بند کر دیا تھا مگر مجھ سے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا بہت مشکل تھا میں کس طرح لڑکھڑاتے قدموں سے چل کر گھر آئی تھی۔ احزم کے انکشاف

نے مجھے دھلا کر رکھ دیا تھا۔

”احزم نے رجا کو طلاق دے دی“ میرا دماغ سنسنا رہا تھا اور جس فیصلے کے متعلق امی نے مجھے سوچنے کے لیے وقت دیا تھا۔ وہ فیصلہ خود بخود میرے ارادوں کو مضبوطی بخش گیا۔ اب اس فیصلے سے سب کو آگاہ کرنا تھا۔

میں گھر آئی تو رجا پہلے سے موجود تھی یہ وہ رجا تو نہیں تھی جسے میں جانتی تھی جس کے سحر میں گرفتار ہو کر میں احزم کو کھوپچی تھی جو میرا دل چھین کر لے گئی تھی یہ تو کوئی ٹوٹی بکھری صدمے سے بے حال عورت تھی مجھے دیکھتے ساتھ وہ لپک کر میرے قریب آئی۔

”مجھے معاف کر دو افزاء! ورنہ میری سانسیں رک جائیں گی۔ تمہیں احزم کی محبت کی قسم مجھے معاف کر دو“

”میں نے تمہیں معاف کیا۔ میرا رب بھی تمہیں معاف کرے“ دو لفظوں میں بات سمیٹ کر میں تیز قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں آگئی تھی شمعوں اٹھ چکا تھا اب آنکھیں مسلتے ہوئے میری طرف لپک رہا تھا میں نے شمعوں کو سینے میں بھینچ کر بے تحاشا چومنا شروع کر دیا میں رورہی تھی شمعوں کے وجود کی ٹھنڈک میرے دل میں اتر رہی تھی۔

اور میں نے اپنے فیصلے سے امی کو آگاہ کر دیا تھا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو افزاء!“ امی کی آنکھیں خوشی سے جگمگانے لگیں۔

”آپ احزم سے بات کر لیں۔۔۔۔۔ میں احزم سے نکاح کے لیے تیار ہوں“

”مگر افزاء! اڈاکٹر نے تم کو“ وہ لب بھینچے خاموش ہو گئی تھیں“ تم کیوں خود غرض ہو رہی ہو“

”ایسی کوئی بات نہیں امی! آپ کی تسلی کے لیے یہ“ سچ“ آج پہلی آخری مرتبہ بتا رہی ہوں آپ اس راز کی امین ہیں۔ دیکھیے، احزم کی عزت مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور میں نہیں چاہوں گی کہ اس کی ذات کی کمزوری دوسروں پر عیاں ہو جائے“ میں نے لمحہ بھر سوچ کر کہنا شروع کیا تھا۔

”کیسی کمزوری؟“ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔

”پر اہم رجا کے ساتھ نہیں تھی۔ احزم کے ساتھ مسئلہ تھا اسی لیے بچہ نہیں ہو سکا اور

کسی ایسی عورت کے ساتھ کا خواہش مند ہے جسے ”سایہ“ اور ”سائبان“ چاہئے تو امی مجھے بھی تو ان دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ ہم دونوں میں ایک قدر مشترک ہے اور جو چیز ہمیں ہمیشہ

باندھے رکھے گی وہ محبت کا انوث رشتہ ہے۔ ہم دونوں گرفتار محبت ہیں۔ سو آپ خود احزم سے بات کر لیں، امی کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو گر پڑے تھے اور وہ بے اختیار رو نے لگی تھیں۔ امی نے شاید اسی رات احزم سے بات کر لی تھی، تبھی تو اسی رات احزم کا فون آ گیا وہ بہت غصے میں تھا بچانے کتنے ہی سالوں کا اشتعال نکال دینا چاہتا تھا جب وہ خاموش ہوا تو میں نے نرمی سے کہنا شروع کیا۔

”کیوں جھلارہے ہو۔ امی نے ایسی کون سی انوکھی بات کر دی ہے“

”بکواس مت کرو افزاء! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا“ وہ غرا کر بولا۔

”کیوں انگارے چبارہے ہو۔ امی سے بات کرو۔ میں نے کیا کہا ہے“ میں صاف دامن بچا رہی تھی۔

”پلیز افزاء! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو یہ بات میں رجاء سے نہیں کر رہی تم سے کس طرح کہوں“ وہ کیسی اذیت سے گزر رہا تھا میں اچھی طرح جانتی تھی اسی لیے بہت نرمی اور تحمل سے بولی۔

”میں تمہارے ہر راز کی امین ہوں“

”افزاء تم“ وہ ششدر رہ گیا تھا ”سب جاننے کے باوجود بھی تم“

”ہاں..... کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے اور میں اس اعتراف میں دیر نہیں کرنا چاہتی اور رہی بچے کی بات تو شمعوں ہے نا“

”مگر وہ تو آویز کا بیٹا ہے“ وہ ابھی تک درطہ حیرت میں مبتلا تھا۔

”ہاں، مگر اب وہ ہمارا یعنی میرا اور تمہارا بیٹا ہوگا آویز سے میں بات کر چکی ہوں۔ وہ تو ویسے بھی شمعوں کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو چکا ہے“ میں نے مزید احزم کے اگر مگر سننے سے پہلے فون رکھ دیا تھا۔

آج ہماری شادی کو چھ سال ہو گئے ہیں شمعوں نے مجھے اور احزم کو کبھی کسی کی کا احساس نہیں ہونے دیا وہ ہماری محبتوں اور چاہتوں کا محور ہے اور میں اور احزم اسٹاک ہوم میں اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں شمعوں کے ہمراہ بہت بھرپور اور مکمل زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم دو ادھورے لوگوں کی زندگی رب کائنات نے مکمل کر دی ہے۔

آج سے بہت سال پہلے میں نے کہا تھا نا کہ بساط کے سارے مہرے میرے ہاتھ

آگے ہیں۔ میں نے کچھ غلط نہیں کہا تھا ان مہروں کو میں نے اپنی مرضی سے ہر اس جگہ رکھ دیا تھا جہاں ان کی موجودگی ناگزیر تھی۔

میں نے کسی کا دل نہیں دکھایا تھا کسی کی بددعا نہیں سمیٹی اور شاید اسی لیے آج ایک بھر پور شخص کی بھرپور محبتوں کے سنگ خوشحال زندگی گزار رہی ہوں۔

اگر وہ جان جائے کہ احزم نے اسے طلاق صرف اس کی تکمیل کے لیے دی تھی کہ شاید کوئی دوسرا مرد اسے مکمل کر دے اگر رجاء اس حقیقت کو جان جاتی تو سزا کا عمل مختصر ہو جاتا۔

اور میں نے بھی کچھ غلط فیصلے تو نہیں کیے۔ تمام عمر احزم میری محبتوں، قربانیوں اور احسان کے بدلے سر نہیں اٹھاپائے گا اور میں جو اس کے نزدیک بہت عظیم اور بڑے ظرف والی وسیع دل کی مالک تھی اسے کبھی بتا نہیں سکی کہ سائے اور سائبان کی تلاش مجھے اس تک لے آئی ہے

اگرچہ احزم مجھ سے بدگمان رہا تھا۔ رجاء کی باتوں میں آ کر وہ بھی میرا دل دکھانے کا سبب بنا تھا مگر میں احزم کو اپنی اور اس کی محبت کے صدقے معاف کر چکی تھی۔ مگر پھر بھی ڈاکٹر زین کے بتائے سچ کو بے نقاب کرنا بہت اذیت ناک تھا۔ بعض حقیقتیں مصلحت چھپالینے میں کوئی حرج نہیں

اور میں احزم کو اس حقیقت کے متعلق کبھی بتا نہیں سکی تھی کہ اپنی ذات کی کمزوریاں اپنے چاہنے والوں کے سامنے عیاں کرنا نہایت مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔



## شکست شب زندگی

رمضان کی آمد آمد تھی شادی کے بعد سسرال میں یہ میرا پہلا رمضان تھا شادی کے شروع دنوں میں ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے ہر صورت عدیل کے ساتھ ہی جانا ہے۔ سوا سی لحاظ سے میں نے چپکے چپکے تیاری بھی کر لی تھی۔ جوائنٹ فیملی سسٹم تو مجھے قطعاً پسند نہیں تھا۔

دو ماہ پہلے عدیل کی بہنوں نے مجھے ایک تقریب میں دیکھا تھا اور اپنے چھوٹے بھائی کے لیے پسند کر لیا۔ یوں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا حساب ہوا۔ شادی کے شروع دن تو دعوتوں میں گزر گئے پورا ایک ہفتہ میں نے امی کے گھر ڈیرہ لگائے رکھا تھا۔

عدیل سب بہن بھائیوں میں آخری نمبر پر تھا سو چھوٹا ہونے کی وجہ سے سب ہی عدیل کو خاص اہمیت دیتے تھے مگر مجھے یہ اہمیت کھٹکنے لگی تھی۔

”یہ کیا ہر وقت ہی کوئی نہ کوئی سر پر نکواری کی مانند لٹکا رہتا ہے“ میں جل بھن کر سوچتی رہ جاتی تھی کبھی بھابی جان ”عدی عدی“ پکارتی آرہی ہیں کبھی آپاؤں کے دل میں پیار کی ہڑک بے دار ہونے لگتی تھی سو سسرال میں ہر وقت میلا سا لگا رہتا تھا ہماری ساس صاحبہ مہمان نوازی میں ماسٹر تھیں گھر میں مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا مجھے اک بے نام سی الجھن ہر وقت گھیرے میں لیے رکھتی تھی پھر سب سے بڑھ کر عدیل کی ماں اور بہنوں کا ہر وقت عدیل کی محبت اور فکر میں گھلتا تو قطعاً پسند نہیں تھا۔

اگر عدیلی کو چھینک بھی آجاتی تو ہمارا بیڈروم پھٹی بازار بن جاتا تھا سب نے فردا فردا چھینک کی وجہ دریافت کرنے تو ضرور آنا تھا۔

”گرم کافی پر ٹھنڈا تو نہیں پی لیا یا پھر اے سی کی کوئی لنگ کی وجہ سے چھینکیں آرہی ہیں۔“

تمہیں تو زلہ بھی ہو رہا ہے“ اماں کا مارے فکر کے برا حال ہو جاتا تھا اور میں جلنے کلنے میں دل خوب خوب جلانے لگتی۔

مجھے امید تھی کہ میری پہلی عید کا مزا انہی رشتے داروں کی فضول محبت میں کر کر اہو جائے گا اور میں جو عدیل کی ہمراہی میں الگ جگہ میں رہنا چاہتی تھی یہ خواہش اتنی جلد پوری ہو جائے گی۔

عدیل کے پوسٹنگ آرڈر میرے لیے خوشیوں کا سند یہ بن کر آئے تھے جس کے نتیجے میں آج میں سسرال کے جھنجٹ سے آزاد اتنے بڑے سرکاری گھر میں راج کر رہی تھی عدیل ابھی مجھے ساتھ لانا نہیں چاہتے تھے مگر میں ایک طویل جنگ اور زبردست معرکے کے بعد یہاں پہنچ گئی تھی جس کی وجہ سے عدیل کا موڈ سخت آف تھا اماں نے کان بھی خوب بھرے تھے میرے خلاف، دو گھنٹے والدہ محترمہ کا فون سننے کے بعد انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا تھا مگر یہاں پروا تھی کسے۔ میں اتنا گولڈن چانس بھلا کیوں مں کرتی۔ عدیل کو ماں بہنوں سے دور قدرت نے خود ہی کر دیا تھا۔

یہاں فراغت کا یہ حال تھا کہ میں اکثر ہی بور ہو جاتی۔ عدیل نے گویا تم کھا رکھی تھی کہ مجھے کہیں آؤ جنگ پر نہیں لے کر جانا۔ الٹا بہانے سے میری بے عزتی کر کے رکھ دیتے۔

”عانیہ! تم کس قدر چھوٹا اور بدسلطنت عورت ہو“

آج صبح صبح پر اٹھا جلانے اور آلیٹ میں نمک تیز ہو جانے کے جرم میں میری بہت عزت افزائی ہوئی تھی۔

عدیل کا سارا غصہ میں نے کام والی پر نکالا تھا اور خود ٹیس پر چلی آئی۔ مجھے یہاں آئے پورا مہینہ ہو چلا تھا اور میری واحد تفریح برابر والے گھر میں کبھی کبھی نظر آنے والی وہ عورت تھی جو شاید کبھی کبھی ہی اندرونی حصے سے باہر نکلتی تھی۔ پہلی نظر میں دیکھنے کے بعد آپ اسے ایب نارل کہہ سکتے تھے۔ اس کا چہرہ چھلسا ہوا تھا۔ رنگت بے حد سانولی تھی۔ بکھرے الجھے روکھے بے جان بال دائیں بائیں جھول رہے ہوتے اور وہ لان میں کھڑے ہو کر زور زور سے چلانے لگتی۔

”میں نشان عبرت ہوں“

پہلے پہل مجھے اس وحشت زدہ سی عورت سے خوف محسوس ہوا تھا مگر پھر نبھانے کیوں میرا فطری تجسس عود کر آیا اور میں اس عورت کے چہرے پر لکھی داستان پڑھنے کے لیے بے چین ہو گئی۔

رہی تھی رمان کو یقین تھا کہ تو ضرور بج ہی جائیں گے اوپر سے ماما کی ناراضی کا خدشہ۔  
 ”سوما! رات گہری ہو رہی ہے گاڑی تم نے خود ڈرائیو کرنی ہے اتنے رش میں مشکل ہو جائے گا“ اس نے ذبی دبی آواز میں سوما کے قریب ہو کر کہا تھا اسی پل کسی کی پرشوق نگاہوں سے اس کی نظر کیا نکرائی رمان نے جھٹ سے آنکھوں کا زاویہ بدل لیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا سوما کے دائیں جانب ذرا فاصلے پر کھڑا تھا مگر اس کی نظریں بھٹک بھٹک کر رمان کی طرف اٹھ رہی تھیں نجانے اس کی نگاہوں کی پیش کا اثر تھا کہ رمان کی غیر ارادی نظریں پھر سے اس کا احاطہ کیا اس کے لبوں پر نگاہ ملتے ہی بڑی شفاف اور اجلی اجلی سی مسکراہٹ چمکی تھی رمان نے ایک مرتبہ پھر سرعت سے رخ بدل لیا۔

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ  
 لوگ کیا سادہ ہیں کہ سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

اس کی آواز بلاشبہ بہت ہی خوبصورت تھی اور وہ خود کیا تھا شاید کوئی یونانی شہزادہ، یا پھر اپالوی دیوتا۔ اسی سلونی شام کا کوئی حصہ معلوم ہوتا تھا کسی دلکش فطری نکس کی مانند اس کی نگاہیں کیسے جگر جگر کر رہی تھیں۔

اک نظر میں ہی رمان اس کا سرتا پا جائزہ لے چکی تھی اور اب خود کو لاپرواہا کرتے ہوئے کتابوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی تھی جب وہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے بڑی دھیمی سلگتی آواز میں نگاہوں کو لفظوں کا پیراہن پہناتا نکلتا چلا گیا۔

”تم پر کسی نے اسم پھونک دیا ہے“ سومانے اسے پتھر بنا دیکھ کر شہو کا دیا تو وہ سنبھل کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تمہیں پر فیوم کی بوتل خود پرانڈ پلنے کی کیا ضرورت تھی“ رمان نے بے حد ناگواری سے کہا۔

”کم از کم بازار آتے ہوئے خوشبوؤں سے پرہیز کیا کرو۔ خواہ مخواہ لوگ متوجہ ہوتے ہیں“

”ارے تمہیں کیا ہوا“ سومانے حیرانی سے پوچھا ”میں تو روزانہ ہی خوشبو میں نہاتی ہوں“

”کچھ نہیں، اب جلدی سے بل بے کرو۔ ماما سخت خفا ہوں گی“ وہ چند لمحے پہلے اجنبی

کی پرشوق نظروں کا سارا غصہ اتارتی..... ہوئی گلاس ڈور کھول کر باہر نکلنے لگی تھی جب سوما کی آواز سن کر مٹکتے ہوئے پٹی۔

میرے پوچھنے پر عدیل نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر اعلیٰ سرکاری آفیسر ہے اور وہ بہت شاندار آدمی ہے۔  
 ایک دن دل کڑا کر کے میں رجب سلطان کے گھر پہنچ ہی گئی تھی پہلے پہل رجب کی بیوی نے مجھے دیکھ کر چلانا شروع کر دیا اور پھر خود بہ خود خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگی میں روزانہ باقاعدگی سے اس کے گھر جانے لگی تھی شاید اسی لیے وہ پاگل سی عورت میرے ساتھ مانوس ہوتی چلی گئی پھر ایک دن جنوں کے عالم میں اس نے بہت سے انکشافات کئے۔  
 ”تم میرے بارے میں جاننا چاہتی ہو عانیہ!“ وہ کتاب زندگی کا ایک ایک صفحہ کھولنے لگی۔

☆☆☆

جاتی گرمیوں کی بڑی خوشگوار گلابی گلابی سی شام تھی۔ سنہری نرم نرم دھوپ تو کب کی سمٹ کر اپنا سلوانا پن چھوڑ گئی تھی شام نے دھیرے دھیرے کچھ پھیلا نا شروع کر دیئے تھے سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم تھا چمکتی دھمکتی روشنیوں نے ہر سو اجالا پھیلا رکھا تھا مارکیٹس کے سائن بورڈ جگمگا رہے تھے وہ پچھلے دو گھنٹوں سے سوما کے ساتھ خوار ہو رہی تھی سوما کو ”مسٹر بکس“ میں رکھتا دیکھ کر اس کے ضبط کا پیانہ لبریز ہو گیا۔

”سوما! پلیز بس کرو۔ اگر کچھ رہ گیا ہے تو کل اسامہ کے ساتھ آکر لے لینا میری ٹانگیں شل ہو چکی ہیں۔ میں مزید تمہارے ساتھ خوار نہیں ہو سکتی“ وہ واقعی بہت تھک چکی تھی ورنہ کتابوں کے ڈھیر کو دیکھ کر تو بالکل دیوانی ہو جاتی تھی اس وقت وہ ہمیشہ کی طرح سوما کو من مانی کرتے دیکھ کر صرف خاموش ہو گئی تھی بلکہ کاؤنٹر کے قریب رکھے آرام وہ صوفے پر بیٹھ کر سوما کے ساتھ مارے مارے پھرنے پر خود کو جی بھر کے کوس بھی رہی تھی۔

”کیا ضرورت تھی مجھے سوما کے ساتھ آنے کی۔ ایک تو مجھ میں کسی کے سامنے انکار کرنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھے صاف منع کر دینا چاہئے تھا مگر واہ ری مروت۔ جو کہ صرف اور صرف مجھ میں ماما نے کوٹ کوٹ کر بھردی ہے“ اس نے ایک مرتبہ پھر خود کو کوسا۔

سوما کو اپنی فرینڈ کی شادی میں پہننے کے لیے نئے ڈریسر کی ضرورت تھی ویسے تو سوما تنہا ہی یونیورسٹی کے علاوہ پورا شہر گھوم آتی تھی نہ جانے اسے ساتھ لانے کی آخر کیا وجہ تھی شاید اس لیے کہ ماما اسے رات تک تنہا باہر رہنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ اور سومانے جتنے اطمینان سے ڈریسر، جیولری اور جوتے وغیرہ لیے تھے اور اب کتابوں کو بہت باریک بینی سے دیکھ کر چھانٹ

”کس نے بل پے کیا ہے ہمارا“ سو ماٹاپ کپڑے لٹھ رہی تھی۔  
”رجب نے“

”کون رجب؟“ اب کے زمانے ہاتھ پر بل ڈال کر پوچھا تھا۔

”رجب پہلے اسی ٹاپ پر ملازمت کرتا تھا اب اسے کسی اور جگہ نوکری مل گئی ہے  
بہت ہی شریف اور نیک نوجوان ہے آپ حاجی صاحب سے پوچھ لیجیے“ ٹاپ کپڑے دکان  
کے مالک کا نام لیا تو رمان سلگتے ہوئے بولی۔

”اب وہ کہاں گیا ہے“

”وہ سامنے دیکھیں۔ نیلی شرٹ والا“ ٹاپ کپڑے اس کے کڑے تیر دیکھ کر  
گھبراتے ہوئے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ رمان غصے سے بھناتی ہوئی تیز تیز قدم اٹھاتی رجب  
تک پہنچی تھی جو کہ گھر سے بیچنے والے چھوٹے سے بیچ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا اسے  
آندھی طوفان کی طرح آتا دیکھ کر قدرے سنبھل گیا۔

”اے مسٹر۔ یہ کیا بے ہودگی ہے“ رمان نے سلگ کر پوچھا۔ سو ماٹاپ بھی اس سے پہلے  
چلی آئی تھی۔

”کون سی بے ہودگی“ رجب نے حیران ہونے کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ حالانکہ  
وہ جانتا تھا سامنے کھڑی تپتے رخساروں والی لڑکی کس بے ہودگی کی طرف اشارہ کر رہی ہے  
سیاہ چادر میں لپٹا اس کا وجود کس قدر پاکیزہ، دلکش اور مقدس لگ رہا تھا ایسی عورتوں کا احترام خود  
بہ خود دل میں موجزن ہو جاتا ہے نظر خود بخود جھک جاتی ہے رجب سلطان کی نظر بھی جھک گئی تھی  
مگر وہ پہلو میں دھڑکتے دل کا کیا کرتا جو اس پر پیکر کو پھر سے دیکھنے کے لیے چل رہا تھا۔

”تم نے ہماری کتابوں کی پے منٹ کیوں لگی ہے؟ کیا خود کو بہت رئیس سمجھتے ہو“  
رمان نے تنک کر کہا۔

”رئیس اور میں“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”میں تو معمولی سا مزدور آدمی ہوں“

”تو پھر اس قدر دیا لو بیٹے کی ضرورت نہیں۔ یہ لیجیے اپنے روپے“ رمان نے پرس میں  
سے چند سو کے نوٹ نکال کر رجب کی طرف بڑھائے۔

”آٹم سوری میڈم! دے کر واپس لینا میرا شیوہ نہیں“ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھنے

لگی تھی اور وہ رمان سے باتوں میں اس قدر محو تھا کہ ساتھ کھڑی طرح واری ماڈرن لڑکی پر اس کی  
توجہ گئی ہی نہیں تھی جو پورا عالم بھلا کے یک ٹک صرف اسے ہی دیکھ رہی تھی جوں ہی رجب نے  
اس کی طرف دیکھا سو ماٹاپ بڑا کر رمان کی طرف بڑھی۔

”مومن! بس بھی کرو۔ کوئی بات نہیں، اگر انہوں نے پے منٹ کر دی ہے کبھی ہم بھی  
حساب برابر کر دیں گے“

”کیا مطلب“ وہ عادت کے مطابق پھنکاری، مزاج کے خلاف تو وہ کچھ برداشت کر  
ہی نہیں سکتی تھی۔ سو مانے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے نہ صرف پیسے پکڑ لیے بلکہ رمان کو گھسیٹتی  
ہوئی اپنی مرسد بڑی کی طرف لے آئی۔

”کیوں اس اپالو کا دل توڑنا چاہتی ہو“ سو ماٹاپ رمان کی پیشانی شکن  
آلودہ ہو گئی۔

”تم نے میرے ہاتھ سے پیسے چھین کر اچھا نہیں کیا۔ میں اسے پیسے لوٹا دیتی تو بہتر  
تھا کیا تمہیں نہیں لگتا وہ ایک بہت ہی غریب سا اپالو تھا“ آخری الفاظ اس نے منہ ہی منہ بددائے  
تھے سو ماٹاپ ریکارڈ کی طرف متوجہ تھی وہ اس نے ایڈوچر کو خوب خوب انجوائے کر رہی تھی۔ رمان  
نے سلگتے ہوئے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

”دے کر لینا میرا شیوہ نہیں“ وہ ارد گرد ہی کہیں دل کے آس پال بولا تھا رمان نے  
خوفزدہ ہو کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

رمان کی والدہ نے بہت ہی کٹھن اور مشقت بھری زندگی گزاری تھی جب رمان پیدا  
ہوئی تھی تب اس کے پاپا کی اچانک ڈیوڑھی ہو گئی پاپا ان کے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے تھے دو  
کنال پر تعمیر شدہ وسیع و عریض کوٹھی۔ بینک بیلنس اور ذاتی گاڑی۔ ان چار بہنوں اور ایک بھائی  
کے لیے ماما کا وجود کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ ماما نے پاپا کے بعد گویا انہیں اپنے پر وں میں چھپا لیا۔  
تھا اس نازک وقت میں ماما کو خاندان والوں اور اپنوں کی اپنائیت اور محبت کی ضرورت تھی مگر پاپا  
کے آنکھیں موندتے ہی تمام رشتہ دار گرگٹ کی طرح رنگ بدل گئے۔ اس کی دونوں پھوپھیاں  
بہت ہی اونچے گھرانوں میں بیاباں گئی تھیں ایک چچا بھی تھے جو عرصہ دراز سے ابراؤ جا بے تھے  
پاپا کی وفات کا سنتے ہی واپس لوٹ آئے اور جائیداد میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کر دیا۔ ماما نے

اپنی دورانہ لیش اور معاملہ نمشی کی وجہ سے بات بگڑنے نہیں دی تھی سو چچا کو بینک میں موجود بھاری بھر کم رقم کے ساتھ دو دکانیں دے کر ماما نے خاموشی کروا دیا تھا اور پھر خود ایک کالج میں جاب کر لی ساتھ ساتھ اکیڈمی میں ٹیوشن بھی پڑھاتی تھیں۔

اس کی بڑی تینوں بہنیں جواب ماشاء اللہ سے شادی شدہ تھیں ماما کا دایاں بازو بن گئیں اگرچہ آپا، بجو اور آپا نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی تھی بلکہ انٹر اور بی اے کے فوراً بعد ماما نے ان کی شادیاں کر دیں وہ اپنے گھروں میں ایک بھر پور خوشحالی زندگی گزار رہی تھیں۔

اسامہ حال ہی میں ہارٹ سرجری میں اسپلائزیشن کر کے لوٹا تھا صحیح معنوں میں اسامہ اور رمان نے ماما کے خواب کو تعبیر کی شکل دی تھی۔ رمان ان دنوں ایم بی اے کے بعد فارغ تھی اور ماما کی خواہش پر اس نے کوئٹہ، بیکنگ کے علاوہ سلائی کا کورس بھی کر لیا تھا۔

اس کی ماما ایک بہت ہی مضبوط اعصاب کی خاتون تھیں۔ مگر جس روز اس کی اکلوتی خالہ اور خالو کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوا تھا تب ماما بالکل ٹوٹ گئی تھیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ رمان نے ماما کو روتے دیکھا تھا۔ وہ ننھی سی سوما کو سینے سے لگا کر اکثر رو پڑتی تھیں۔

سوما میں ان کی جان بند تھی اور خالہ کی وفات کے بعد تو سوما انہیں اور بھی عزیز ہو گئی تھی پہلے وہ چھوٹی ہونے کی وجہ سے ماما کی لاڈلی تھی پھر سوما اس کی محبتوں کو شیر کرنے کے لیے آگئی سوما نے وسیع دلی کا ثبوت دیتے ہوئے سوما کے لیے جگہ خالی کر دی۔ وہ سب کی ہی لاڈلی تھی۔ ثنا آپا، مریم بجو اور نینا آپا سب اسے بے تحاشا چاہتے تھے ماما کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ سوما کی آنکھ میں آنسو نہ آئے۔ اسے کسی بھی چیز کی حسرت نہ ہو۔ اسی لیے تو وہ سوما کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ چیز خریدتی تھیں۔ بہترین یونیفارم، اسکول بیگ، مینجے ترین کپڑے، کھلونے اسی حساب سے سوما بہت چوڑی ہوتی جا رہی تھی۔ سستا کپڑا، سستی چیزیں اس کی نگاہ میں چھٹی نہیں تھیں۔

سوما کی خواہشات کا پیمانہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا جبکہ رمان اس کی ہم عمر ہونے کے باوجود بہت قناعت پسند تھی۔ اسے ویسے بھی بننے سنورنے کا خاص شوق نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اس کی بہنوں کو بھی اکثر اس سے شکایت رہتی تھی کہ وہ ان کے سسرالی رشتہ داروں کے فنکشنز میں بھی اسی طرح چادر لپیٹے عام سے حلیے میں چل پڑتی ہے۔

”ماما بہنا! تم بہت حسین ہو مگر ڈھنگ کے کپڑے پہننے میں کیا حرج ہے“ بجو کو اس کے اول جلوں حلیے سے حد درجہ الجھن ہوتی تھی۔ خود اس کی بہنیں بلا کی شوقین مزاج تھیں۔ کچھ

اونچے گھرانوں میں بیاہی جانے کی وجہ سے کافی بدل چکی تھیں مگر رمان اپنے مزاج کا کیا کرتی اسے فنکشنز میں ماڈلز کا روپ دھار کر جانا اور اپنی نمائش کرنا سخت ناپسند تھا۔

وہ بہت حسین تھی، سکول، کالج اور یونیورسٹی میں قدم قدم پر اسے احساس دلایا گیا تھا مگر حسن کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ اپنی نمائش کرتی۔ اسے اپنی حفاظت کرنا خوب آتی تھی۔ اس کی عادتوں کی وجہ سے اسامہ بہت خوش تھا۔ اسے اپنی سب سے چھوٹی بہن سے شدید محبت تھی۔ جس کی سوچوں پر بدلتے وقت کی دھول نہیں پڑی تھی۔ اور وہ چاہتا تھا کہ سوما بھی بالکل رمان کی طرح ہو جائے۔

آج صبح ناشتے کی میز پر اسامہ اور سوما کی چھڑپ ہو گئی تھی وہ دونوں اکثر چونچیں لڑاتے رہتے تھے۔

”تم آج پھر کہیں جا رہی ہو“

”کرن کی منگنی ہے“ سوما ہولے سے منمنائی۔

”کبھی کسی کی شادی ہو رہی ہوتی ہے کبھی کسی کی منگنی۔ روز روز کسی کے گھر جانا مناسب نہیں یونیورسٹی سے فارغ ہو گئی ہو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر وقت سہیلیوں کے ولیمہ انینڈ کرتی پھرو۔ جس سینٹر سے سومانے کورس کئے ہیں تم بھی وہاں کوئٹہ کی کلاسز لیا کرو اور گھر میں کھانا پکانا سیکھو..... میں اور ماما تم دونوں کو جلد از جلد اس گھر سے نکالنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں“

”کیا مطلب؟“ ان دونوں نے بیک زبان چلا کر کہا۔

”زیادہ حیران ہونے کی ایکٹنگ مت کرو۔ دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہیں“ اسامہ

نے انہیں چڑایا۔

”ایکٹنگ۔ ایکٹنگ سے یاد آیا آپ نے مجھے ٹی وی پر خبریں پڑھنے کی پرمیشن تو دی تھی

ناما! سوما ٹھک کر ماما سے لپٹ گئی۔

”تم تو جاب کے بارے میں سوچ رہی تھیں“ رمان نے حیرانی سے پوچھا۔ حالانکہ وہ

جانتی تھی کہ سوما بہت غیر مستقل مزاج ہے۔

”نہیں، جاب واب کا خیال میں نے دل سے نکال دیا ہے۔ وہ فار یہ ہے تا میری

کا اس فیلو، اس کے کزن کی ایڈورٹائزنگ کمپنی ہے۔ اس نے مجھے ایک کرسٹل میں کام کرنے کی

آفر کی ہے۔ ماما! آپ پرمیشن دیں گی تو میں فار یہ کو خوشخبری سناؤ گی“ وہ ہمیشہ کی طرح ٹھکتے

ہوئے ضد کر رہی تھی۔

”ابھی اسامہ کیا کہہ کر گیا ہے“ اما ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

”مجھے ابھی شادی وادی نہیں کرنی“ وہ بھی خفگی سے کہتے ہوئے ماما کے پیچھے چلی گئی۔

ڈاننگ روم میں رمان تنہا رہ گئی تھی۔ اور اکیلے ناشتا کرنے سے بہتر تھا کہ وہ بھی اٹھ ہی جاتی۔

ابھی وہ اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ مادا دوبارہ چلی آئیں سوما بھی ان کے پیچھے ہی تھی۔ یقیناً ماما،

اسامہ کو گیٹ تک چھوڑنے گئی تھیں۔ یہ تو ماما کا معمول تھا جب وہ دونوں یونیورسٹی جایا کرتی تھیں

تب بھی ماما انہیں گیٹ تک چھوڑنے جاتیں۔ ڈاننگ میز سے اس وقت تک نہ اٹھتیں جب تک

سب کو اپنی زیر نگرانی کھانا نہ کھلا چکی ہوتیں۔ رمان اکثر کھانے پینے کے معاملے میں ماما سے نظر

بچا کر بھاگ جایا کرتی تھی اور ماما اسے زبردستی بہلا پھسلا کر واپس لے آتیں۔ وہ بہت زیادہ

خوش خوراک نہیں تھی۔ ماما جو کچھ بھی بناتی تھیں وہ خاموشی کے ساتھ بھوک کے مطابق کھا لیتی۔

البتہ اسامہ اور سوما کی فرمائشوں کی ایک طویل لسٹ ہوا کرتی تھی صبح صبح اسامہ اور سوما دبا یاں

دیتے ہوئے گھر سے نکلتے۔

”ماما! لُچ میں اگر تندوری مرغی اور فیش پلاؤ نہ ہوا تو میں کھانا نہیں کھاؤں گا“ اسامہ کے

بانیک اشارت کرنے تک ارشادات، جاری رہتے۔

”مجھے ایرانی کو فٹے اور بکھارے بیگن کھانے ہیں۔ آلو کے کباب اور گھیے کا رائیہ بھی

بنا۔ پینے گا“ سوما بھی ٹھاک کر ماما سے لپٹتے ہوئے کہتی اور اگر کبھی اس کی بڑی تینوں شادی شدہ

بہنیں سمجھ بچوں کے آؤ حکمتیں تو پھر ماما کا سارا دن کچن میں مصروف گزرتا۔ یہ اور بات ہے اس

کی تینوں بہنیں بھی ماما کے ساتھ کچن میں کام کرتیں۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کی جاتیں۔ ماما بیٹیوں

کو خوش و غم دیکھ کر اندر تک سرشار ہو جاتی تھیں۔ اب انہیں رمان اور سوما کی بھی بہت فکر تھی اور

وہ سوما سے پہلے رمان کی شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ روز قیامت اپنی بہن کے سامنے سرخرو

ہونا چاہتی تھیں اس لیے ان کی خواہش تھی کہ سوما کی جلد از جلد شادی ہو جائے اور وہ بھی ہر طرف

ست پر سکون ہو کر حج کر آئیں۔ عمرہ تو وہ اور اسامہ چھپلے برس کر آئے تھے۔ رمان بھی اس کے

ساتھ اللہ کے گھر کی زیارت کر آئی تھی اب ان تینوں کی مشترکہ خواہش تھی حج کرنے کی۔ اور

اسامہ تو یہ دیکھتا تھا کہ۔

آج صبح مون سینئر چلی گئی تھی سوما بھی کسی سہیلی کی عیادت کی غرض سے صبح صبح اسامہ

کے ساتھ ہی نکل گئی۔ ماما گھر میں تنہا تھیں جب نینا چلی آئی۔ نینا کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو گیا تھا

اس کے میاں قاسم بزنس میں تھے سسرال والے بھی بہت اچھے رکھ رکھاؤ والے لوگ تھے انہیں

اپنی تینوں بیٹیوں کی طرف سے کسی بھی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں تھا اس کے تینوں داماد ہی تعلیم

یافتہ اور اپنی اپنی فیلڈ میں کامیاب تھے البتہ کبھی کبھی سوما ان سب کو چھیڑنے کی غرض سے کہتی۔

”ماما! جب آپ کے تینوں داماد گھر میں داخل ہوتے ہیں تو ایک دم اندھیرا اچھا جاتا

ہے“ سوما ان کے میاؤں کی سانولی رنگت پر چوٹ کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں

دیتی تھی۔ اسے اس بات کا بھی بہت قلق تھا کہ ماما نے شرافت اور تعلیم، حسب نسب کے علاوہ

کچھ نہیں دیکھا۔ وہ بہت زیادہ حسن پرست تھی اور اس نے..... کہہ دیا تھا کہ اس کے دولہا کو کم از

کم بہت زیادہ خوبصورت ہونا چاہئے۔

اور ماما جانتی تھی کہ سوما مذاق بات نہیں کرتی۔

اسی لیے ابھی تک سوما کے لیے آئے رشتوں میں سے کوئی ایک بھی انہیں اس کے

معیار کا نہیں لگا تھا۔ اکثر کو تو سوما خود ہی رتبہ جیک کر چکی تھی اب تو ماما اچھا خاصا فکر مند رہنے لگی

تھیں کیونکہ انہیں سوما کے بعد مون کے بارے میں بھی سوچنا تھا۔

”ماما! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے“

نینا نے کچن سے فارغ ہو کر قدرے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔ رومانہ بیگم (ماما) نے چونک

کر بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولیں۔

”کون سی بات؟“

”ماما! رات کو قاسم نے مون کے رشتے کے سلسلے میں بات کی تھی“

”میں سمجھی نہیں بیٹی! کھل کر بتاؤ“ انہوں نے حلاوت سے کہا۔

”وہ عاشر کے لیے مون کا رشتہ“ نینا لب بھینچ کر خاموش ہو گئی تھی۔ ماما کو بات سمجھنے

میں صرف چند پل لگے۔ ان کی پیشانی پر فکر کا جال سا بن گیا تھا۔

”عاشر کرتا کیا ہے؟“

”ایڈورٹنگ کمپنی ہے اس کی“ نینا نے دھیمی آواز میں کہا۔

”تم پر قاسم کی طرف سے دباؤ ہے“ وہ گویا بات کی تہہ تک پہنچ چکی تھیں۔

”عاشق نے خود بات کی ہے قاسم سے۔ اور آپ جانتی تو ہیں چھوٹا ہونے کی وجہ سے سب ہی عاشق کو اہمیت دیتے ہیں“

”مگر عاشق کا مزاج قاسم سے ٹوٹلی مختلف ہے“ ان کی نظروں میں عاشق کا سراپا لہرایا۔  
گلے میں چین، ہونٹوں پر ہمہ وقت ٹھہری مسکان۔ اگرچہ وہ قاسم کی نسبت کافی وجہہ تھا مگر نجانے کیوں رومانہ بیگم کو دل روز سے ہی پسند نہیں آیا اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا بیٹا بھی بہت ہی سلجھی طبیعت کا نوجوان تھا سو عاشق جیسے لڑکے کے لیے رومانہ بیگم کے پاس پلس پوائنٹ نہیں تھے۔

”تم مون کے مزاج سے واقف ہو۔ عاشق اس کے لیے قطعاً موزوں نہیں“ انہوں نے دو ٹوک بات کر کے گفتگو کو سمیٹنا چاہا۔

”مگر ماما! میں قاسم کو کیا جواب دوں گی۔ بظاہر تو عاشق میں کوئی برائی نہیں۔ فارن کو ایفائیڈ ہے۔ خوبصورت ہے اور پھر بہت چاہ سے مون کو مانگ رہے ہیں۔ تھوڑا کھلنڈرا ہے تو اس عمر میں سب لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد خود بہ خود ٹھیک ہو جائے گا“ نینا نے ان کے دونوں ہاتھ نرمی سے تھام لیے اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس پر کس قدر قاسم کی طرف سے دباؤ ہے۔

”ٹھیک ہے میں مون کی مرضی معلوم کر لوں۔ پھر آگے بات چلائیں گے“ انہوں نے بیٹی کے تفکرات کچھ کم کرنے کی کوشش کی۔

”تھینک یو ماما جان!“ وہ فرط مسرت سے ان سے لپٹ گئی۔

”یہ بتاؤ قاسم لہجہ ادھر کرے گا“ اچانک ہی ان کی نگاہ نے کھاک کی گرد حصار باندھا تو انہیں تیزی سے گزرتے وقت کا احساس ہوا۔

”جی ماما! ابھی وہ آفس سے اٹھ کر ادھر ہی آئیں گے۔ میں ان کیساتھ چلی جاؤں گی“  
”تو پھر جلدی سے ٹیبل پر برتن لگا دو۔ اسامہ اور مون بھی آنے والے ہیں اور ذرا سو ما کے موبائل پر فون کر کے پوچھو، کب تک گھر آئے گی“ انہوں نے سرعت سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ نینا سر ہلا کر فون سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

”ماما! آپ کے ہاتھ کا ذائقہ مجھے اپنی می کی یاد دلادیتا ہے“ قاسم نے..... مرغی سے

انصاف کرتے ہوئے سادگی سے کہا تھا۔

”یہ ذائقہ میں نے اپنی بیٹیوں کے ہاتھوں بھی ٹرانسفر کر دیا تھا تا کہ میرے دامادوں کو کھانے پینے کی پرابلم نہ ہو“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا ساتھ ہی سوما کی پلیٹ میں آلو کے کباب رکھے۔ رمان نے ایک طائرانہ نظر وسیع و عریض میز پر ڈالی تھی۔ حلیم، مٹن، پالک کی بکڑیاں، چائیز پلاؤ، کوئٹہ قیہ، میٹھے میں اناس کی پڈنگ اور کھجور کا حلوہ، فروٹ سلاد اور گرم گرم خوشبودار ہر کی دال اور سادہ چاول انہوں نے داماد کی پسند کو مد نظر رکھنے کے بعد اپنی لاڈلی کی بن کبے خواہش جان کر ارہر کی دال اور چاول بھی بنائے تھے۔ رمان کی آنکھیں عقیدت اور محبت سے نم ہونے لگیں۔ انہیں کس قدر اپنے بچوں اور ان سے وابستہ لوگوں کی پسند ناپسند کا خیال رہتا تھا۔  
ماما کے دامادو ایسے بھی بہت زیادہ خوش خوراک تھے۔ جب بھی کسی آپا کا چکر لگتا تو ہلکی پھلکی دعوت کا اہتمام وہ ماما کے ساتھ مل کر جھٹ پٹ کر لیتی۔ البتہ اس کے بہنوئیوں کو اس سے ایک ہی شکوہ تھا کہ ان کی چھوٹی سالی انہیں ٹائم نہیں دیتی۔ خصوصاً شاپا کے میاں عادل بھیہا جو کہ اس سے اور سوما سے نہایت شفقت سے پیش آتے تھے ان کے اکثر شکوؤں پر سوما جل بھن کر کہتی۔  
”جب آپ آیا کریں گے تو میں آپ کو بالکل دی آئی پروٹوکول نہیں دوں گی تا کہ آپ کو کچھ میری بھی قدر ہو“

اس وقت بھی سوما کی نوک جھوک سے سب محفوظ ہو رہے تھے۔

”تم اپنے آلو کے کباب کھاؤ، خبردار جو میری بہن کی فیورٹ ڈش پر نظر رکھی“ اسامہ نے جھٹ سے سوما کے سامنے سے ارہر کی دال کا باؤل اٹھالیا تھا اسامہ کی اس حرکت پر سب ہنس دیے۔ سب جانتے تھے کہ مون کو دال چاول کس قدر پسند ہیں۔

”تو بہ کتنے چھوٹے دل کے مالک ہو تم“ سوما نے بھنا کر کہا۔

”تمہارا جو بھینس جتنا دل ہے“ اسامہ بر جستہ بولا۔

”میرا تو بھینس جتنا ہے اور تمہارا چیونٹی سے بھی چھوٹا“ سوما نے منہ بنایا۔

”پھر سے چونچیں لڑانے لگے ہو“ ماما کچن سے گرم گرم پھلکے لے کر آئیں تو انہیں ایک

دوسرے پر میزائل پھینکتے دیکھ کر خفگی سے بولیں۔

”ماما اس شتر مرغ کو سمجھالیں“

”شتر مرغ کے کہا ہے“ اسامہ نے آنکھیں پھیلائیں۔



”تمہیں“ سومانے اسے چڑایا۔

”دیکھ لیں قاسم بھائی! یہ عزت ہے میری اس گھر میں“ اسامہ نے مصنوعی رنجیدگی

خود پر طاری کر لی۔

”شکر کرو اتنی عزت ہم کر لیتے ہیں“ سومانے شاہانہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

”زرہ نوازی ہے آپ کی“ اسامہ جل کر بولا۔

”چائے کون بنائے گا“ زرگوند (ملازمہ) پسینے سے شرابور ڈرائنگ روم میں جھانک

کر ہانکنے لگی تھی۔

”تم اور کون“ سومانے نیپکن سے ہاتھ پونچھے۔

”ام سے نہیں چائے وائے بنتی۔ ام تو اب لمبی تان کے سوئے گا“ زرگوند نے ایک

بڑی سی جمائی لے کر کہا۔

”چائے مون بنائے گی۔ ہم نے تمہارے ہاتھ کا جوشاندہ پی کر مرنا ہے“ اسامہ چیئر

کھینٹ کر اٹھ گیا تھا باقی سب بھی فردا فردا سٹنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔

”اگر مون چائے بنائے گی تو میں پی لوں گا ورنہ مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے“ قاسم

بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا تو مون سرعت سے بولی۔

”آپ بیٹھے، میں دو منٹ میں چائے لاتی ہوں“

زرگوند دانت نکوتی اسٹور روم میں غروب ہو گئی تھی۔ مون جب تک چائے بنا کر لائی اتنی

دیر تک اسامہ ہسپتال جا چکا تھا ویسے بھی اسے چائے اتنی پسند نہیں تھی۔ صرف میٹھی سمجھ کر پی لیتا تھا۔

”میں بھی آپ کیساتھ چلوں کہ آج کی رات رک جاؤں“ نینا آپنی نے اجازت طلب

نگاہ سے شوہر کی طرف دیکھا۔

”اگر رکنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ صبح اسامہ کے ساتھ آجانا“ انہوں نے بھی کمال

مہربانی سے اجازت دیدی تھی۔ مون کے ساتھ ساتھ سومانے کو بھی اچھو لگ گیا۔

”خیریت! جی جی۔ آج کیوں اتنے مہربان ہو رہے ہیں“ سومانے کی رگ شرارت

پھڑک اٹھی۔

”ہم تو ہمیشہ سے ہی مہربان ہیں۔ پوچھ لیجئے اپنی آپنی جان سے کیوں نینا“ انہوں

نے سوچوں میں گم نینا کو بھی گفتگو میں شامل کرنا چاہا۔

”جی۔ کیا کہا آپ نے“ نینا نے گڑبڑا کر ان سب کی طرف دیکھا۔

”آپ کے سر تاج، بیگم کے منہ سے تعریف سننا چاہتے ہیں“ سومانے ہنسی دہائی۔

”کیسی تعریف“ نینا نے حیرانی سے پوچھا تو سومانے اپنا سر پیٹ لیا۔ قاسم بھائی

مسکراتے ہوئے ماما کے سامنے جھکے اور پھر مون اور سومانے کے سر پر چیت لگا کر بیوی کے ہمراہ باہر

نکل گئے۔ سومانے اور مون بھی اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئی تھیں جبکہ رومانہ بیگم سوچوں میں گم

وہیں بیٹھی رہ گئیں۔ نینا نے ماں کو گم سم دیکھا تو دھیمے قدم اٹھاتی ان کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ وہ

میاں کو گیٹ تک چھوڑنے لگی تھی۔

”ماما! آپ پریشان ہیں“

”نہیں تو“ وہ چونک کر بیٹی کی طرف دیکھنے لگیں۔

”میں کیوں پریشان ہونے لگی“

”عاشق کے پر پوزل کی وجہ سے“ نینا نے وثوق سے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں بیٹی! ظاہر ہے لوگ پر پوزل تو دیتے ہی ہیں جس گھر میں پیری

ہو پتھر وہیں آتا ہے۔ اب یہ تو ہمارا فیصلہ ہوگا جو اسامہ اور تمہاری بہنیں مناسب سمجھیں گی اور پھر

عادل بڑا داماد ہے اس کے علم میں بھی لانا ضروری ہے“ انہوں نے بیٹی کو رسان سے سمجھایا۔

”بہر حال آخری فیصلہ تو آپ کا ہوگا نا“

”ہوں“ انہوں نے دھیرے سے ہنکارا بھر۔

”البتہ رومانہ کی مرضی کو اولیت حاصل ہوگی“

”آپ کا کیا خیال ہے مون انکار کر دے گی“ نینا نے تفکر کے عالم میں بے چینی سے پوچھا۔

”قبل از وقت کہنا کچھ بھی مناسب نہیں اور وہ بھی اس صورتحال میں کہ عاشر بطور داماد

مجھے پسند نہیں“

”یعنی..... بات بڑھنے سے پہلے ہی ختم سمجھوں۔ آپ کو عاشر پسند نہیں تو پھر مزید

کارروائی کا بھلا کیا فائدہ“ نینا نے رنجیدگی سے کہا۔

”میں اپنی بیٹیوں کے مزاج سے واقف ہوں۔ اگر میں نے تم تینوں کے ساتھ زیادتی

نہیں کی تو پھر رومانہ تو مجھے تم سب سے عزیز ہے۔ تمہارے پاپا کی جان تھی اس میں۔ انہوں نے

اس کا نام بہت شوق سے رومانہ رکھا تھا اور مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں کبھی بھی مون کی آنکھوں میں

آنسو نہیں آنے دوں گی“ وہ بخجیدگی سے بولیں۔

”ماما! آپ سہاؤ سے سلیقے طریقے سے انکار کرنا چاہتی ہیں“  
”یہی سمجھ لو“

”ماما! قاسم اسے انا کا مسئلہ نہ سمجھ لیں“ وہ خوفزدہ ہوئی۔

”میں خود قاسم سے بات کروں گی۔ مگر ابھی نہیں کچھ دن بعد اور مجھے امید ہے کہ قاسم بات بڑھنے نہیں دے گا“ رومانہ بیگم پر اعتماد تھیں ان کے لہجے میں ایک مان بول رہا تھا۔

”اللہ آپ کے اس مان اور بھروسے کو قائم رکھنے ماما!“ نینا نے دل سے دعا کی۔

”یہ انکار تمہاری ازدواجی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوگا“ انہوں بیٹی کو تسلی دی۔ بہر حال وہ عاشق کو قطعاً رمان کے شوہر کی روپ میں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس کی بہت ساری عاداتیں انہیں ناپسند تھیں۔ سو انہوں نے اسامہ سے بات کئے بغیر ہی بیٹی کے سلیقے سے سمجھا دیا تھا۔ وہ اپنی سب سے فرمانبردار، بخجیدہ مزاج بیٹی کو کسی آزمائش کی بھٹی میں جھونکنا چاہتی تھیں۔ وہ ایک فیصلہ کر کے مطمئن سی ساڑھی کا پلوں سنبھالتی اٹھ گئیں۔

☆☆☆

”سوما! ذرا میرے ساتھ لبرٹی تک چلو گی“ مون نے کمرے میں جھانک کر بیڈ پر لیٹی

سوما سے التجائیہ درخواست پیش کی۔

”اف، اس وقت۔ بہت سستی ہو رہی ہے مون! شام کو چلیں گے“ سوما نے موبائل

فون کان سے ہٹا کر کہا۔

”مجھے بہت ضروری کام ہے“

”کون سا ضروری کام“ سوما کے کان کھڑے ہو گئے۔

”ساتھ چلو گی تو بتاؤں گی“

”پہلے بتاؤ“ وہ بھی سوما تھی باتوں میں کہاں آتا تھا اس نے۔

”مالی بابا کی بیٹی کی شادی ہے۔ مجھے اس کے لیے کچھ ضروری چیزیں خریدنا ہیں“

”کیا مطلب، تم مالی کی بیٹی کے لیے لبرٹی سے شاپنگ کرو گی۔ دماغ تو ٹھیک ہے

تمہارا“ سوما نے عادتاً چلا کر کہا۔

”کیوں مالی کی بیٹی کیا انسان نہیں ہے۔ یا لبرٹی کی شاپنگ سے، جیولری کپڑوں سے

اسے الرجی ہو جائے گی“ مون نے لا پرواہی سے پرس جھلایا۔

”میسے کہاں سے لیے ہیں“ سوما نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔

”اتنی امیر بہنوں کا بھلا کیا فائدہ، اگر ضرورت کے وقت انہوں کام نہیں آنا تو۔ کچھ

روپے ماما اور اسامہ نے دیئے ہیں“ وہ مسکرائی۔

”تمہاری اس سوشل ورکنگ سے میں سخت عاجز آچکی ہوں“ سوما جل کر بولی اور پھر

شوز ریک کھول کر میچنگ جوتے نکالنے لگی۔

”چلو مرو۔ گاڑی کی چابی اسامہ سے لے کر آؤ“

”گاڑی تو گھر میں نہیں“

”تو پھر کیا ہیملی کا پٹر سے جانا ہے“ سوما نے طنز یہ کہا۔

”رکش کس مرض کی دوا ہے“

”میں ہرگز بھی رکشے پر نہیں جاؤں گی۔ خود ہی چلی جاؤ“ سوما نے آنکھیں گویا ماتھے

پر رکھ لی تھیں۔ جوتے اتار کر ہوا میں اچھال دیئے اور خود بیڈ پر ڈھسے گئی۔

”سوما! پلینز چلو نا میرے ساتھ۔ صرف گھنٹے بھر کا کام ہے“ وہ منتوں پر اتر آئی تھی مگر

سوما ڈھیٹ پر قطعاً اثر نہیں ہوا۔

”خریدنا کیا ہے“

”کچھ ڈریسز وغیرہ اور“ مون کچھ کہتے کہتے رک گئی تو سوما نے مشکوک نظروں سے گھورا۔

”اور کیا“

”اچھولی! اسامہ نے الیکٹرونکس کے سامان کا آرڈر بھی دے رکھا ہے۔ بس کھڑے

کھڑے بل پے کرنا ہے۔ سچ مالی بابا بے چارے دعائیں دیں گے۔ ہماری پوری کالونی کے

لوگوں نے ان کی بہت مدد کی ہے“

”ہاں، تم ہی جا کر انہیں مدد کے لیے اکساتی رہی ہو گی“ سوما نے منہ بنایا۔ وہ جانتی

تھی رمان کی عادتوں کو خوب اچھی طرح۔ جب کوڑا اٹھانے والی سکھاں کی بیٹی کی شادی ہوئی تھی

اس نے اپنی کلائی کا بریسلٹ بیچ دیا تھا۔ یہ بریسلٹ اسے اسامہ نے میٹرک میں ٹاپ کرنے

پر دیا تھا اس وقت بھی سوما چینی رہ گئی تھی۔

”پاگل ہو چکی ہو۔ اسامہ کا گفٹ بیچ ڈالو گی“

”یہ تو حقیر سی چیز ہے۔ اللہ فرماتا ہے میری راہ میں اپنی سب سے عزیز از جان چیز کو قربان کرو اور مجھے اپنے بھائی کا دایہ تختہ بہت عزیز ہے سو میں نے اسے بیچ دیا ہے“ اس نے بے حد حلاوت سے کہا تھا۔ اسامہ ہی نہیں ماما بھی مون کے خیالات جا کر حیران رہ گئیں۔ انہوں نے بیٹی کو پیشانی پر بوسہ دے کر دعا دی۔

”یہ بلند بخت والی کی پیشانی ہے تیری مقدر کا ستارہ پوری آب و تاب سے چمکے تم میرے دل کا چین اور آنکھ کی ٹھنڈک ہو بیٹی! تو جس گھر میں بھی جائے گی ہر سوا جالا پھیل جائے گا۔ بڑا ہی بانصیب وہ مرد ہوگا جس کی حکومت تیرے دل پر ہوگی۔ میری ساری دعائیں تیرے ساتھ۔ تجھ پر ذرا سی آنچ بھی نہ آئے“ وہ ابدیدہ تھیں خوش بھی تھیں اور مسرور بھی۔ ان کے پانچوں بچوں میں رمان کا مزاج مختلف تھا اور آج تو انہیں گویا یقین ہو گیا تھا کہ وہ سب سے مختلف ہی نہیں منفرد بھی ہے اور اسے اپنی ان خوبیوں کا پتا ہی نہیں تھا جو سیپ میں بند موتی کی طرح تھیں۔

”کہاں کھو گئی ہو سوما“ مون بھنبلائی۔

”آئم سوری جان..... مجھ سے اتنی نیکی کی امید مت رکھو یوں کرو زرگوں کو ساتھ لے جاؤ۔ اسے ویسے بھی بازار گھومنے کا شوق ہے“ سوما کا جواب سنے بغیر وہ دھپ دھپ کرتی سیرھیاں اتر آئی تھی۔ ماما کو بتا کر اس نے زرگوں کو ہمراہ لیا اور بازار چلی آئی۔

”گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا کام تھا اور خواہ مخواہ سوما کی منتوں میں دماغ پلپلا گیا ہے“ وہ زیر لب بڑبڑائی اور زرگوں کے ہاتھ سے دو بھاری بھر کم شاپر پکڑ لیے۔

”مجھ سے کچھ کہانی بی!“ زرگوں تک اس کی بڑبڑاہٹ پہنچ گئی تھی۔

”نہیں“

”بی بی! اب گھر چلنا ہے رکشا ڈھونڈ لوں“

”رکشا روڈ سے پکڑیں گے پہلے تم آرام سے سڑک کر اس کرو“ وہ زرگوں کو ہدایت دے کر مڑی ہی تھی جب ایک تیز رفتار موٹر سائیکل سے زرگوں کے ہاتھ میں پکڑا شاپر نکلایا دوسرے ہی لمحے زرگوں شاپر زسیت زمین بوس ہو چکی تھی۔

”مائی گاڈ!“ رمان گھبرا کر زرگوں کی طرف لپکی۔ وہ باقاعدہ اونچی آواز میں کراہ رہی تھی۔ رمان نے خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر زرگوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی دونوں کہنیاں چھل گئی تھیں جبکہ ماتھے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ اتنا خون کچھ کر رمان مزید

خوفزدہ ہو گئی۔

”زرگوں حوصلہ کرو“ وہ اپنی چادر کا پلو اس کے ماتھے پر رکھ کر بھرائی آواز میں کہہ رہی تھی۔ زرگوں کی تکلیف کے احساس سے اس کے آنسو ایک تواتر سے بہنے لگے چودہ پندرہ سالہ زرگوں پھپک پھپک کر رونے لگی رمان نے تیزی سے اٹھ کر رکشا کی تلاش میں نظریں دوڑانا شروع کی تھیں جب ایک انجینی مردانہ آواز کوس کر ٹھنک گئی۔

”خیریت، کیا ہوا؟“ وہ بہت ہی اچانکیت سے پوچھ رہا تھا۔ اس کی نظریں زرگوں پر تھیں مسٹر کس میں ہونے والی ملاقات اتنی پرانی نہیں تھی نہ ہی رجب کا حافظہ کمزور تھا۔

”اف، اس کے ماتھے سے تو خون نکل رہا ہے۔ آپ کو فوراً ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے“

”مشورے کا شکریہ! میں بھی اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی ہوں مگر رکشہ“ وہ مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی لب پھینچ کر خاموش ہو گئی لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ تمام صورتحال سمجھ چکا تھا اس لیے سرعت سے پلٹ گیا۔ رمان نے اسے واپس جاتا دیکھ کر ایک گہری سانس

کھینچی اور زرگوں کو دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر اٹھانے لگی۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک مرتبہ پھر آتا دکھائی دیا تھا۔ صرف تین سیکنڈ بعد ایک ٹیکسی بھی آگئی۔

رمان کشمکش کا شکار تھی۔ مگر سوچنے کا وقت کہاں تھا۔ زرگوں کا خون زیادہ بہنے کی صورت میں نقصان کا خدشہ تھا۔ وہ ایک ہفتے پہلے ملنے والے اس انجینی کی ایک مرتبہ پر نادانستہ مدد قبول کر چکی تھی۔

”آپ ہمیں“ دارالشفاء“ تک لے جائیے“ ٹیکسی میں بیٹھ کر اس نے رجب کو مخاطب کیا۔

”دارالشفاء تو یہاں سے گھنٹہ بھر کی ڈرائیو پر ہے۔ جبکہ زخم اتنا گہرا ہے فوراً ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہوگی۔ رجب نے سنجیدگی سے جواب دیا وہ ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھا تھا جبکہ وہ

زرگوں کا سر گود میں رکھے پیچھے بیٹھی تھی اس نے ایک ہاتھ سے پرس کھول کر سیل نکالنا چاہا مگر سیل فون شاید جلدی میں وہ گھر ہی رکھ آئی تھی۔

”آپ کے پاس موبائل تو ہوگا“ رمان نے لب پھینچتے ہوئے ایک مرتبہ پھر رجب کو مخاطب کیا۔ رجب نے بغیر کچھ کہے موبائل جب میں سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا تھا رمان نے جلدی

سے اسامہ کو کال کی مگر دوسری طرف بڑی کی ٹون نے اسے مزید بھنبلا ہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ٹیکسی ایک کلینک کے دروازے کیسا منے کی تو وہ زرگوں کا ہاتھ تھام کر باہر نکل آئی۔

آدھے گھنٹے کی ٹریٹمنٹ کے بعد بینڈج تو ہو چکی تھی البتہ ڈرپ ختم ہونے تک انہیں ابھی کلینک

وہ وقفے وقفے سے اسامہ کو کال کر رہی تھی مگر شاید وہ سرجری میں مصروف تھا رجب نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ زرگونہ کی ڈرپ کیا اتری اس نے تشکر بھرا سانس خارج کیا کچھ دیر بعد رجب دوبارہ آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جس میں شاید سینڈوچ تھے اس نے کوک کے دوٹن ان کی طرف بڑھائے۔

وہ جو مروتا انکار کرنا چاہتی تھی پیٹ میں دوڑتے چوہوں کی ریس سے عاجز آ کر خاموش ہو گئی۔ زرگونہ نے تو اس سے بھی زیادہ بے صبری کا مظاہرہ کیا تھا تینوں سینڈوچ اطمینان سے کھا لیے۔

”آپ کا بہت شکریہ! بہت ہیلپ کی ہے آپ نے ہماری۔ ورنہ میرے تو ہاتھ پیر پھول گئے تھے اس کا اتنا حق تو بنتا تھا کہ رمان شکریہ کے دو بول ہی دے مارتی ورنہ یوں کسی اجنبی سے مدد لینا اسے قطعاً پسند نہیں تھا مگر زرگونہ کی حالت کے پیش نظر اسے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔ اس نے ڈاکٹر کی فیس دینا چاہی تو رجب نے سختی سے منع کر دیا۔ اس کے اصرار پر وہ پھیکے سے انداز میں بولا، ”آپ تو سراسر میرے خلوص کا بھر کس نکال رہی ہیں“

ادھر زرگونہ اس کے کان میں ہنسی جا رہی تھی۔

”واللہ! یہ کتنا کھوبصورت آدمی ہے،“ اسی ٹیکسی سے رمان کے منع کرنے کے باوجود انہیں گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔

”آپ اندر آئیے پلیز! میں ماما سے آپ کو ملواتی ہوں“ اسے گیٹ سے ٹر خا دینا رمان کو مینرز کے خلاف لگا تھا سو مروتا کہنے لگی۔

”آپ کی ماما سے ملنا اب ضروری ہو گیا ہے مجھے خبر نہیں تھی آپ تک آنے والے راستوں میں اتنی ”اونچائی“ موجود ہے“ وہ ان کی وسیع عریض تین منزلہ کونٹھی پر نگاہ ڈال کر پلٹنے لگا تھا۔ اس کی آواز میں نہ جانے کون سا جادو تھا کیسا اسم تھا جس نے رمان رضوی کو اندر تک جکڑ لیا۔

”مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ آپ تک آنے والے راستوں میں اتنی ”اونچائی“ موجود ہے“

اس آواز کی گھمبیر تیا میں چھپے کرب نے پہروں رمان کو بے چین رکھا۔ وہ اپنے دل کی بدلتی کیفیت پر حیران تھی۔ جس بیٹھے درد نے اس اجنبی کو راہ چلتے اسیر کیا تھا اسی درد کی مٹھاس نے رمان کو بھی اپنے حصار میں لے لیا تھا یہ اک نہ ختم ہونے والا سرور بخش احساس تھا جس کی معطر

خوشبو نے رگ جان کو مہکا کر گلستاں کر دیا تھا۔ صحرادل پر ابر رحمت کی بوند بوند گر رہی تھی۔

☆☆☆

”ماما! آپ اچانک بغیر بتائے“ نینا کے ساتھ ساتھ قاسم نقوی بھی حیران تھا کیونکہ رومانہ بیگم کسی بھی تہوار کے علاوہ اپنی بیٹیوں کے گھروں میں نہیں جاتی تھیں۔ اب صبح صبح انہیں دیکھ کر وہ دونوں ہی حیران تھے۔ البتہ نینا کچھ کچھ سمجھ چکی تھی کہ ماما کی آمد کا اصل مقصد کیا ہے۔ شاید اسی لیے عجیب سی گھبراہٹ نے نینا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ آج چونکہ ویک اینڈ کی وجہ سے چھٹی تھی سو انہیں یقین تھا کہ قاسم سے ملاقات ہو جائے گی۔

”قاسم بیٹے! مجھے آپ سے ضروری بات کرنا ہے“ انہوں نے صوفے پر بیٹھتے ہی بغیر تمہید کے گفتگو کا آغاز کیا۔ نینا سرعت سے بچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا دل پہلو میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ماما کا انکار کم از کم عاشر کو ضرور مشتعل کر دے گا۔ کیونکہ عاشر کے مجبور کرنے پر ہی قاسم نے نینا سے بات کی تھی۔ چونکہ قاسم بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اسی حساب سے اس نے چھوٹے بہن بھائیوں کو خصوصی شفقت اور محبت سے نوازا تھا۔ ان کے والدین کی ڈیجھ ہو چکی تھی۔ بہنیں دونوں اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں۔ عاشر الگ گھر میں رہتا تھا قاسم کے بہت دفعہ مجبور کرنے پر بھی وہ ان کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن اسی دوری کے باوجود دونوں بھائیوں کی محبت میں کمی نہیں آئی تھی اور نینا کو قاسم نے اول روز سے ہی جتا دیا تھا کہ عاشر کی ان کی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔

ہ چائے کے بہانے دوبارہ لاؤنج میں آئی تو ماما اور قاسم دونوں کو خوشگوار ماحول میں باتیں کرتے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ ماما داماد کو اچھے طریقے سے قائل کر چکی ہیں۔

”اب چلتی ہوں بیٹا! تم دونوں شام کو ضرور چکر لگانا“ ماما چائے پیتے ہی اٹھ گئی تھیں قاسم انہیں خود چھوڑنے کی غرض سے چابی اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی تو نینا نے بے چینی سے پوچھا۔

”ماما نے آپ سے کیا بات کی ہے؟“

”انجان بننے کی ضرورت نہیں۔ تم جانتی ہو کہ ماما مجھ سے کیا بات کرنے آئی تھیں“ قاسم کا انداز ناقابل فہم تھا۔ یعنی نینا اس کے تاثرات سے جان نہیں پائی تھی کہ قاسم کا مزاج برہم ہے۔

”میں خود ماما کی آمد پر حیران تھی“ نینا نے مری مری آواز میں کہا۔

”تم مجھ سے پوچھنا چاہتی ہو“

”یہی کہ ماما نے آپ سے کیا بات کی ہے۔ یقیناً مون اور عاشر کے پرپوزل کی بات

ہی ہوگی“ وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

”ہوں“ قاسم نے ہنگارا بھرا۔

”کیا جواب دیا ہے انہوں نے“ نینا جان تو چکی تھی پھر بھی قاسم سے گفتگو بڑھانے کی

غرض سے کہنے لگی۔

”انکار کر دیا ہے۔ دوسرے معنوں میں ریجیکٹ کہنا مناسب ہوگا۔ ٹھیک ہے وہ

بزرگ ہیں اور پھر بیٹی کی ماں ہونے کی وجہ سے تمام حقوق محفوظ رکھتی ہیں۔ البتہ ایک بات سمجھ

میں نہیں آئی کہ انہوں نے عاشر کو کس میں پرٹھکرایا ہے کیا رمان کا عاشر سے بہتر بھی کوئی پرپوزل

موجود ہے۔ اگر ایسی بات ہے تب بھی میرے لیے کوئی انا کا مسئلہ نہیں۔ مگر عاشر شاید اس انکار کو

کوئی اور معنی نہ پہنالے میں عاشر کے متوقع رد عمل کی وجہ سے پریشان ہوں کیونکہ اسی کی ایما پر

میں نے اس کا پرپوزل پیش کیا تھا“

وہ سچ مچ پریشان تھا۔ نینا کا دھڑکتا دل معمول کی رفتار سے چلنے لگا۔ وہ بہت زیادہ

اعصابی تناؤ کا شکار تھی مگر اب ریلیکس ہو چکی تھی۔

”عاشر بھی سمجھ دار ہے ماشاء اللہ سے، مجھے یقین ہے وہ بھی سمجھ جائے گا“ نینا نے

اطمینان سے کہا۔ قاسم دھیرے دھیرے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

”وہ بہت ضدی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی مسئلہ نہ کھڑا کر دے“

”آپ فکر مت کریں اللہ بہتر فیصلہ کرے گا“ وہ برتن اٹھا کر بچن کی طرف بڑھ گئی تھی

اسی شام جب قاسم نے عاشر سے تفصیلات کی تو وہ یکدم بھڑک اٹھا۔

”آپ نے یہ انکار ان کے منہ پر دے مارنا تھا“

”فضول مت بولو عاشر! یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے“ قاسم نے نرمی سے ڈپٹ کر کہا۔

”آپ کے لیے معمولی ہوگی مگر میرے لیے نہیں۔ آپ کی شادی پر ہی میں نے فیصلہ

کر لیا تھا کہ مجھے رمان سے ہی شادی کرنا ہے۔ اب میں اپنا فیصلہ بدلنے سے تو رہا“ عاشر ہٹ

دھرمی سے بولا۔

”تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ ویسے بھی رمان جس مزاج کی لڑکی ہے وہ

تمہارے ساتھ دو قدم بھی نہیں چل سکتی کجا کہ عمر بھر۔ یوں زندگی کے فیصلے محض جذباتیت کی نذر

نہیں کرنے چاہئیں۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچو، تم جس سوسائٹی کا حصہ ہو وہاں ایسی لڑکیاں مس

فٹ ہوتی ہیں۔ تمہارے معیار کی لڑکیاں از گرد بہت ہیں“ قاسم بہت دیر تک اس کا غصہ ٹھنڈا

کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر عاشر کا تنفر بڑھتا جا رہا تھا۔

”تو پھر آپ بھی اپنی سوسائٹی کی کسی لڑکی سے شادی کر لیتے۔ آپ کی نظر انتخاب نینا

بھا بھی پر کیوں ٹھہری“ عاشر کا لہجہ ہلکی سی چھین لیے ہوئے تھا۔

”نینا کا مزاج مجھ سے میل کھاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ میں اور نینا اچھی زندگی گزار

لیں گے اس نے بہت حد تک اپنے آپ کو میری پسند کے سانچے میں ڈھال لیا ہے جبکہ رمان ایسا

نہیں کرے گی کیونکہ تمہارے اور میرے لائف اسٹائل میں نمایاں فرق ہے“

”بہر حال، آپ نے اپنے سسرال والوں کی اچھی وکالت کر کے بہترین داماد ہونے

کا حق ادا کر دیا ہے مگر آپ میرے اچھے بھائی ثابت نہیں ہوئے کیونکہ آپ میری طرف سے بہتر

دلائل نہیں دے سکے“ وہ حد سے زیادہ بدگمان تھا۔

”تو پھر اسی بات سے اندازہ لگا لو جب میں تمہارا بھائی ہو کر اچھا سپورٹر ثابت نہیں

ہو سکا تو کوئی نہ کوئی ”وجہ“ تو ضرور ہوگی نا“

”تو آپ بلا جھجک میری برائیاں گنوا دیجئے“ عاشر نے بھڑک کر کہا۔

”وہ کسی ادا باش آدمی سے اپنی بیٹی کے نصیب پھوڑ کر عمر بھر کے لیے رونا نہیں چاہتی

تھیں سو انہوں نے قرینے سے انکار کر دیا ہے تم بھی اس انکار کو تسلیم کرلو“ قاسم نے نگاہ چرا کر

ناراضی سے کہا تھا پھر اٹھ کر چلا گیا۔ البتہ عاشر کو تمام رات سلگتے ہوئے نیند نہیں آئی تھی پوری

رات سیاہ چادر میں لپٹا رمان کا وجود اسے ڈسٹرب کرتا رہا۔

☆☆☆

”تم شروع سے ہی بے ایمان ہو سوما! میں نہیں کھیل رہی“ رمان نے تمام کارڈز اٹھا

کر کھڑے کھڑے کر دیئے تھے سوما مسلسل دانت نکال رہی تھی۔ ہمیشہ ایسے ہی تو ہوتا تھا۔ سوما

بے ایمانیوں سے یا تو جیت جاتی یا پھر رمان کو دمر بنادیکھ کر گیم خراب کر کے بھاگ جاتی۔ دونوں

صورتوں میں رمان دودو گھٹنے کڑھتی رہتی تھی۔

”کارڈز کو دفع کرو، کیرم کھیلتے ہیں“ اس نے اٹھتی ہوئی رمان کا دوپٹہ کھینچ کر دوبارہ صوفے پر بٹھایا۔

”میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں“ وہ غصے سے بولی۔

”تمہیں مون کی بجائے سورج کہنا چاہئے ہر وقت تپتی، سلگتی رہتی ہو“ سوما ہنستے ہوئے بادام کھانے لگی۔

”کہاں جا رہی ہو“

”جہنم میں“ وہ دانت پکچا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ سوما بھی اس سے پہلے چلی آئی تھی۔

”کوئی نئی ڈش ٹرائی کر رہی ہو“

”او کے جا رہی ہوں میں“ سوما فریج میں سے امرود نکال کر باہر نکل گئی جبکہ رمان نے سلگتے ہوئے پیسیر گر بنانے کا سوچا۔ جب اسے بہت زیادہ غصہ آنے لگا تو وہ کچن میں گھس کر کچھ نہ کچھ پکانے کھڑی ہو جاتی تھی۔ دھیان بنتے ہی تمام تر غصہ بھی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا تھا مگر ابھی یہ غصہ اترنے والا نہیں تھا۔ سوما کی زیادتیوں نے اس کی آنکھیں نم کر دی تھیں اگرچہ سوما کو تو کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اسے کس قدر تکلیف دیتی ہیں۔

جب وہ دونوں بہت چھوٹی تھیں تب بھی سوما اسی طرح کرتی۔ اسے عموماً رمان کی پسند کی ہوئی چیز دل و جان سے پسند آ جاتی تھی حالانکہ ماما جب بھی کچھ نہ کچھ خرید کر لاتیں پہلے سوما کے سامنے ہی رکھتی تھیں وہ اپنی پسند کی چیزیں اٹھا لیتی اور بچا کچھا حصہ اسے بھی مل جاتا مگر پھر ایسا ہونے لگا کہ سوما کو اس کے حصے میں آئی چیز بھی پسند آ جاتی اور وہ ضد کر کے رمان سے چھین لیتی کبھی پارک میں جائے تو اسے رمان والے جھولے پر ہی بیٹھنا ہوتا اور رمان بغیر کچھ کبے فراخ دلی سے سوما کے لیے چیزیں چھوڑتی چلی گئی۔ یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اب بھی رمان خاموشی سے سوما کی ہاں میں ہاں ملا دیتی شاید اس لیے بھی کہ ماما نہیں چاہتی تھیں کہ سوما کو کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز کے لیے بھی ترے یا اسے پانے کے لیے اس کی آنکھ میں حسرت کے آنسو چمکیں۔

اب اگر اسے دال چاول پسند تھے تو سومانے بھی رغبت سے یہ ڈش کھانا شروع کر دی تھی۔ ملنے والے اکثر لوگ ماما سے کہتے تھے کہ سوما اور رمان تو ایک دوسرے کے بغیر سانس بھی نہیں لیتیں۔ اس میں واقعی سچائی کے پوائنٹ زیادہ تھے انہوں نے ایک ہی اسکول، کالج اور یونیورسٹی سے پڑھا تھا مگر اب ان دونوں کی چوآس میں فرق آنے لگا تھا۔ سوما کی ترجیحات بدلنے

لگی تھیں وہ کچھ اور اونچائی کی طلب کرنے لگی تھی۔ وہ اپنے گرد کھینچے دائرے کو مزید وسیع کرنا چاہتی تھی مگر رمان وہیں کھڑی تھی اس نے اس دائرے سے نکلنے کی کبھی کوشش نہیں کی وہ کوشش کرنا ہی نہیں چاہتی تھی یہ تمناؤں، خوابوں اور بڑھتی ہوئی خواہشوں کا دائرہ تھا۔ وہ ایسی روشنی کی طلب ہرگز نہیں کرتی تھی جو جھن بن کر سدا آنکھوں کو اذیت سے دوچار کرتی۔

”جو کچھ بنا رہی ہو ذرا جلدی بنانا بچ بہت سخت بھوک لگی ہے“ سوما کچن میں جھانک کر آرڈر دیتی ایک مرتبہ پھرٹی وی کے سامنے جم کر بیٹھ چکی تھی۔

”اونہہ، کچھ نہیں ملے گا تمہیں“ اس نے کینٹ میں سے ڈبل روٹی کے چھوٹے سائز کے آٹھ عدد بن نکال کر ترختے ہوئے کہا۔ اسامہ کے آنے کا وقت ہو چلا تھا سواس نے تیزی سے فریج میں سے قیہ نکال کر اچھی طرح سل پر پیس لیا۔ ہلکا پھلکا سالنچ ریڈی تھا۔ چپس فرائی کر کے اس نے کوئلڈ ڈرنکس و آئس کریم کیو بڑ نکال کر ٹرے میں سجائے اور پھر لاؤنج میں چلی آئی۔ اسی اثناء میں اسامہ کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔ زرگونہ نیند میں ڈوبتی باہر کی طرف گیٹ کھولنے کی غرض سے بھاگی۔

آنے پر رمان فوراً اٹھی اور کچن کی طرف بڑھ گئی ایک پیسیر گر پلیٹ میں سلیقے سے رکھ کر اس نے باؤل میں خوبانی کا میٹھا ڈالا اور پھر کچھ سوچ کر باہر چل پائی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اسے لاؤنج کے داخلی دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر اسامہ نے پوچھا۔

”میں بسمہ کی طرف جا رہی ہوں“

”اونہہ“ سوما کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

بسمہ، فاروق اظفر کی بیٹی تھی۔ فاروق اظفر محکمہ صحت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے ان کی کوشی رمان کے گھر کے دائیں طرف تھی۔ بچ میں ایک دیوار حائل تھی جس پر ہر طرح کے پھولوں سے ڈھکی بلیں بہا رکھا رہی تھیں۔

بسمہ فاروق اظفر کی پہلی بیوی سے واحد اولاد تھی۔ دوسری شادی انہوں نے اپنی کولیگ حمیرا سے کی تھی۔ حمیرا کے دو بیٹے تھے گھر پر حمیرا کی ہی اجارہ داری تھی اور بسمہ سنو دائٹ کی طرح کا معصوم و مظلوم کردار تھا۔ حالانکہ بظاہر آئنی، بسمہ کی خیر خواہ معلوم ہوتی تھیں مگر رمان جانتی تھی کہ آئنی کے دل میں بسمہ کے لیے کتنی گنجائش ہے گرجویشن کے بعد بسمہ کو مزید پڑھنے

کی اجازت نہیں ملی تھی سوا ب سارا وقت اس کا گھر کی دیکھ بھال اور بچن میں مصروف گزرتا۔ اس کے باوجود اسے ڈھنگ کا پہننا اور کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا اور وہ پھر بھی اپنے حال میں مست تھی۔ خوش اور مطمئن تھی۔ سوما اکثر اس کے اطمینان پر چڑھ جاتی۔

”بسمہ! تم خود کو افسانوی کردار مت سمجھو۔ ہر وقت کی جی حضوری سے اپنا نقصان کر بیٹھوگی“

”مجھے اچھے دنوں کا انتظار ہے اور یہ انتظار مجھے ہمہ وقت سرور اور شاد رکھتا ہے“ بسمہ ہنس کر سوما کے مشوروں کو چٹکیوں میں اڑا دیتی۔

وہ بسمہ کی طرف آئی تو وہ پچھلے صحن میں مشین لگائے کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔ اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔

”شکر ہے، بڑے لوگوں کو بھی ہماری یاد نے آخر جھنجھوڑ ہی دیا۔ اب بھی نہیں آتا تھا ملکہ عالیہ“

”اکیچو کلی! میں مالی بابا کی بیٹی کی شادی کی وجہ سے مصروف تھی“ اس نے فوراً ہی صفائی پیش کی۔

”کیا لائی ہو؟“ بسمہ کی بھوک برگر کی خوشبو سے چمک اٹھی۔

”میں کپڑے کھنگالتی ہوں تم آرام سے کھاؤ۔ اس نے نرمی سے کہا۔

”تھینک یو مون! سچ بڑی سخت بھوک لگی تھی مگر کپڑے دھونا بھی ضروری تھا۔ لائٹ کی آنکھ بچولی نے الگ اچھا خاصا خطی بنا دیا ہے۔ ادھر کپڑے استری کرنے لگو تو لائٹ غائب۔

کپڑے دھونے لگو تو محترمہ نازک اندام حسینہ کی طرح غرے دکھانے لگتی ہے شکر ہے میں نے ٹینکی بھری تھی ورنہ پورا دن میرا اسی طرح لائٹ کو کوسنے گزر جانا تھا“ وہ برگر سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں بتا رہی تھی۔

”کام اپنی جگہ مگر وقت پر مناسب خوراک صحت کے لیے بہت ضروری ہے“ رمان نے بالٹی بھر کپڑے الٹنی پر پھیلانے کے بعد مشین کو خوب اچھی طرح رگڑ رگڑ کر دھویا۔

”رہنے دو نامون! میں خود کر لیتی ہوں“

”خاموشی سے کھاؤ۔ میں ابھی تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں“ رمان نے اسے اچھا خاصا ڈپٹ کر کہا۔

”یہ تو معمول کے کام ہیں“ وہ دھیرے سے منمنائی۔ رمان سنی ان سنی کر کے مشین کو خشک کپڑے سے پونچھ کر اب اسٹول اٹھا کر دیوار کی طرف بڑھا رہی تھی۔ پھر اسٹول پر چڑھ کر اس نے ہانک لگائی۔

”سوما! دو کپ اچھی سی چائے بنا کر دے جاؤ“

”مون! رہنے دو نا۔ ابھی بنا لیتی ہوں میں“ بسمہ نے کوک کے خالی ٹن کو بیرونی دیوار کے پار پھینک کر کہا۔

”کیا؟“ مون نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”چائے اور کیا“ بسمہ جذبہ ہوئی۔

”مجھے تمہارے ہاتھ کی چائے نہیں پینی“

”میں کیا اتنی بری چائے بناتی ہوں“ بسمہ فوراً ہی برامان گئی۔

”تمہارے تھکے تھکے ہاتھوں کی چائے پی کر رمان کو بھی تھکاوٹ ہونے لگی تھی۔ سو اسی لیے میں بنالایا ہوں“ اسامہ فلاسک اور تین کپ اٹھائے چلا آیا۔

”اللہ! اسامہ بھائی آپ نے کیوں تردد کیا“ بسمہ بے چاری جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔

”لو اور سن لو، مجھ سے پانچ سال چھوٹی بہنوں نے کبھی مجھے ”بھائی“ نہیں کہا“ اسامہ نے دھکی لہجے میں کہا۔

”تمہارے گھر میں بھائیوں کا کال پڑ گیا ہے وہ دو آوارہ فتنے کہاں ہیں“

”یوں تو نہ بولیں“ بسمہ کے دل میں ”بھائیوں“ کی ہڑک بے دار ہوئی۔

”تو پھر کیا بولوں؟“ بڑے دلارے سے کہا گیا۔ اس وقت وہ قطعاً نہایت ذہین اور ذمہ دار سرجن نہیں لگ رہا تھا۔

”کیا پیار بھری باتیں کروں؟“ تمہیں ”ہیر“ سناؤں؟“

”نہیں تو“ وہ اسی طرح اسامہ کے سامنے گڑ بڑا جاتی تھی۔

”پنوں کی اسٹوری سناؤں؟“

”پنوں کون؟“ بسمہ نے حیرانی سے آنکھیں پھیلا لیں۔ سبز گہری جھیل سی آنکھیں اور مون کو اس پل یوں لگا کہ اس کا اکلوتا بھائی ان ہرے ہرے نیوں میں گوڈے گوڈے ڈوب چکا ہے۔

”لاحول ولا قوۃ“ اسامہ کو دلی صدمہ پہنچا۔

”یعنی کہ حد ہوگئی تمہیں بچوں کا نہیں پتا“ اسامہ نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا۔  
گویا اس سے کوئی سخت قسم کی غلطی سرزد ہو چکی تھی۔

”اچھا۔ اچھا میاں بچوں، وہ کالج والے۔ یاد ہے رمان! نان چنے بیچا کرتے تھے وہ۔ کیا ہوا انہیں“ ہسمہ نے گھبرا کر اچانک یاد آنے پر وضاحت کی۔

”ہارٹ اٹیک ہوا ہے“ اسامہ جل کر بولا۔

”افسوس کرنے چلو گی ان کے گھر“

”کیا رمان بھی جائے گی“ ہسمہ نے حیرانی سے پوچھا۔

”نہیں صرف تمہیں لے کر جانا ہے۔ مرحوم کی آخری خواہش تھی کہ محترمہ ہسمہ فاروق کو ان کا آخری دیدار کروایا جائے“

”مگر مجھے ہی کیوں؟“ وہ ایکدم خوفزدہ ہو گئی۔ ادھر رمان ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

”اس لیے کہ تم نے اس عظیم عاشق کی روح کو تکلیف پہنچائی ہے“

”نن۔ نہیں تو“ ہسمہ ہکلا نے لگی۔

”اسامہ کے بچے، بس بھی کر دو“ رمان ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔

”اوکے بچوں کی لاڈلی دلاری پھوپھو“ اسامہ انگلیوں سے بال سنوارتے اٹھ کھڑا ہوا تھا جبکہ ہسمہ خفت سے سرخ پڑ گئی تھی۔

”یار! کبھی کبھی سوچتی ہوں میری بھی بھلا کیا زندگی ہے“ سومانے یاسیت سے کہا۔

”کیوں تمہاری زندگی کو کیا ہوا ہے۔ ہر نعمت میسر ہے“ رمان کو حد درجہ تاسف نے گھیر لیا۔ سوما اکثر اس قسم کی ناشکری کا اظہار کرتی رہتی تھی۔

”میرے پاس کتنے انمول رشتے موجود نہیں ہیں“ اس نے فی الفور اپنے لہجے اور الفاظ کو بدلا۔

”ہوں“ رمان نے ہنکارا بھرا۔

”اس کی کو تو کوئی بھی پورا نہیں کر سکتا“

”کبھی کبھی مجھے ایک مکمل گھر کی بہت حسرت ہوتی ہے“

”حسرتیں پالنے کی بھلا کیا ضرورت ہے ابھی ماما سے بات کرتی ہوں گا بے باجے

بجیں گے۔ بیاجی آئیں گے، دو لہنیا لے جائیں گے اور ایک سال بعد بچوں کی آمد۔ گھر اور فیملی مکمل“ رمان نے مزے سے کہتے ہوئے ہاتھ جھاڑے۔ وہ اپنے پسندیدہ مشغلہ یعنی ”گوڈی“ میں مصروف تھی۔ پودوں کی کاٹ چھانٹ تو وہ کر رہی چکی تھی۔ اب گملوں کو تازہ پانی سے نہلانا تھا۔ سو پائپ لگا کر وہ سوما کے قریب آئی تھی۔

”شادی کے متعلق میرا ایک خاص آئیڈیل ہے“

”جس قسم کا دولہا تمہیں چاہئے وہ ملنا کم از کم اس جہاں میں تو مشکل ہے۔ اتنی ساری خوبیاں بھلا ایک آدمی میں اکٹھے کیسے ہو سکتی ہیں یعنی بندہ ہینڈ سٹم بھی ہو، کیئرنگ ہو لوگ ہو اور بہت زیادہ دولت مند بھی“

”کو الیفیکشن بھی مجھ سے زیادہ ہونی چاہئے“ سومانے ہنس کر کہا۔

”تم اپنے معیار سے ایک انچ نیچے کیوں نہیں آ جاتیں“

”ایسا ممکن نہیں“

”کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا“ رمان نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”کبھی کبھی مجھے اپنے ارد گرد کا ماحول بہت پرایا پرایا لگتا ہے“ وہ اپنے محسوسات خود بھی سمجھ نہیں پاتی تھی۔

”بات صرف اتنی ہے کہ تمہارے اندر مطمئن ہو جانے والے جراثیم نہیں ہیں۔ صاف لفظوں میں ناشکرا پن کہنا مناسب ہوگا۔ ورنہ تم اچھی طرح سے جانتی ہو۔ ماما اور آپوں سمیت جتنی تمہیں محبت اور اہمیت ملتی ہے تو میں سب سے چھوٹی ہونے کے باوجود نہیں پاسکی“ رمان کا مقصد جتنا نہیں تھا تاہم سوما کو شاید برا لگا۔

”جو میرے محسوسات ہیں وہ تم سمجھ نہیں سکو گی۔ کیونکہ تمہیں میرے جیسے حالات سے گزرنا نہیں پڑا“

”یہ یاسیت کا دورہ تمہیں مہینے میں ایک دو مرتبہ ضرور پڑتا ہے“ رمان نے ناگواری سے کہا۔

”تم اس لیے مطمئن ہو کہ تمہیں معلوم ہے کہ ہر شے تمہاری ہے یہ گھر تمہارے باپ کا ہے اگر میرے ابو بھی کچھ پراپرٹی میرے نام چھوڑ جاتے تو شاید میرے احساسات اس وقت مختلف ہوتے“



”سوما تم“ رمان کی صدی کی شدت سے آواز ٹوٹ سی گئی۔  
 ”تم اس قسم کی باتیں سوچتی ہو اگر ماما تک تمہارے خیال کی بھٹک بھی پڑ گئی تو سوچوں  
 انہیں کس قدر تکلیف ہوگی“

”تم دوست ہو۔ اسی لیے اپنے اندر کا ابال نکال دیتی ہوں تمہارے سامنے آئندہ  
 کچھ بھی شیر کرنے سے پرہیز کروں گی“ سومانے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”سوچتی ہوں تربیت تو ماما نے ہی تمہاری کی ہے پھر اتنا تضاد کیوں؟“ رمان نے تلخی  
 سے کہا کبھی کبھی سوما کی باتیں اسے بہت تکلیف دیتی تھیں۔ شاید لاشعوری طور پر وہ اس ماحول  
 میں خود کو کس فٹ سمجھنے لگی تھی۔ یا پھر دوسرے معنوں میں وہ ان لوگوں میں سے تھی جو کسی بھی حال  
 میں خوش نہیں رہتے مطمئن نہیں ہو پاتے۔

”میں نے جاب کا ارادہ کر لیا ہے“ سومانے جان بوجھ کر موضوع ہی بدل لیا۔

”شکر ہے ماڈلنگ کا خناس تو نکلا ہے دماغ سے“

”نہیں، ماڈلنگ تو میری فیوچر پلاننگ کا حصہ ہے“ وہ گلاب کی پتیوں کو نوچنے لگی تھی۔

”تم جانتی ہو تمہارے اس فیصلے سے ماما کو شدید دھچکا پہنچے گا“ رمان نے پائپ لپیٹ

کر پورج کے ایک کونے میں موجود کھونٹے پر لٹکا دیا۔

”اب تو شوبز میں اچھی اچھی فیملی کی لڑکیاں کام کر رہی ہیں وقت بدل چکا ہے وہ  
 زمانے گئے جب ٹی وی پر کام کرنے والی لڑکیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا یاد ہے  
 ہمارے کالج کی دو لڑکیاں دوران تعلیم ماڈلنگ کرنے لگی تھیں“ سوما کے پاس ایک سے بڑھ کر  
 ایک دلیل موجود تھی۔

”اسامہ تمہیں بالکل بھی اجازت نہیں دے گا“

”مجھے اسامہ کی پرمیشن درکار نہیں“ سومانے ناگواری سے کہا۔

”وہ اس گھر کا واحد مرد ہے اور تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ ماما اسامہ کے مشورے  
 کے بغیر کوئی بھی فیصلہ نہیں کرتیں۔ اور اسامہ تمہیں ہرگز بھی ماڈلنگ کی اجازت نہیں دے گا بلکہ وہ  
 تو رات کو بھی ماما سے کسی پر پوزل کی بات کر رہا تھا“ رمان نے رمان سے سمجھانا چاہا۔

”اسامہ کو اتنا کاشمکش ہونے کی ضرورت نہیں میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی“ اس

نے صاف بات کرنے کی ٹھان لی تھی تاکہ ماما تک بات آسانی سے پہنچ جائے۔

”ظاہر ہے وہ ہم دونوں کو فارغ کر کے اپنا کیس ماما کی عدالت میں پیش کرے گا“

”کون سا کیس.....؟“ سوما ٹھٹکی۔

”تمہیں نہیں لگتا کہ اسامہ کسی کو پسند کرتا ہے“

رمان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کسے؟“

”خود اندازہ لگاؤ۔ بھلا کون ہو سکتی ہے“

”کوئی ڈاکٹر وغیرہ ہی ہوگی“ سومانے قیاس سے گھوڑے دوڑائے۔

”نہیں“ رمان نے نفی میں سر ہلایا۔

”تو پھر ثنا آپا کی نند ہوگی“

”وہ بھی نہیں“

”ہماری تمہاری سہیلیوں میں کوئی ایسی نہیں جسے اسامہ پسند کرے گا“ سومانے پرسوج

نظروں سے نیلے آسمان پر نظریں جمادیں۔

”ہمارے پڑوس میں ایک لڑکی رہتی ہے۔ جو مجھے بہت عزیز ہے اور اس کا نام“

”بسمہ ہے“ سومانے جھٹ سے کہا تو رمان ہنس پڑی۔

”اسامہ تو بہت چھپا رستم نکلا ہے۔ ہماری ناک تلے کھیل کھیلا جا رہا ہے“ سومانے

فطری ”نند پن“ کے احساس سے مغلوب ہو کر کہا۔

”یہ میرا اندازہ ہے ضروری نہیں کہ اسامہ میرے اندازے پر تصدیق کی مہر لگائے“

”اس بسمہ کو دیکھو کتنی بھولی بھالی سی لگتی ہے۔ میسنی، گھنی نہ ہو تو، اتنے لائق فائق اور

قابل لڑکے پر نظر لگا رکھی ہے۔ ایک ہم ہیں سارے دنیا سے انجان ہستیاں“ سوما کو خود پر تاء آ رہا تھا۔

”ارے۔ اس میں بسمہ بے چاری کا کیا قصور وہ تو شاید جانتی بھی نہیں“

”سب ڈرامے ہیں، تم ان مظلوم لڑکیوں کی چالبازیوں سے واقف نہیں۔ میں بھی

بسمہ کے ارمان پورے نہیں ہونے دوں گی۔ اتنے بڑے گھر پر راج کرنے کا سوچ رکھا ہے اس

نے“ سومانے تنفر سے کہا۔ اسی پل پیچھے سے مریم بجو کی آواز آئی۔ نہ جانے کب دے قدموں وہ

گھر میں داخل ہوئی تھیں۔

”اتنے بڑے گھر پر تم بھی راج کر سکتی ہو۔ ابھی ہاں تو کرو، ہم شہنایاں اور ڈھولک

بجانے لگیں گے۔

”اف اللہ! بچو جان، اسامہ میرا بھائی ہے۔ اصلی والا، خبردار جو کسی نے الناسیدھا سوچا تو“ سومانے نزاکت سے ہاتھ لہرا کر کہا تو بچو اور رمان ہنس پڑیں۔

”کچھ ایسا ہی خیال اسامہ کا بھی ہے ورنہ ہماری خواہش تو“ بچو نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”آپ کس کے ساتھ آئی ہیں؟“ رمان نے گفتگو کا رخ بدلا۔

”عامر چھوڑ کر گئے ہیں“

”رات ادھر ہی ہیں آپ، بچے کیوں نہیں آئے“ سومانہ آمدے میں سے کرسی اٹھالائی۔

”مجھے عامر نے بھیجا ہے اور میں ایک بہت ہی ضروری کام کے سلسلے میں آئی ہوں“

مریم بچو نے نظریں رمان کے چہرے پر جما کر شوخی سے کہا۔

”کیسا کام“ وہ دونوں ہی ٹھکیں۔

”بہت جلد پتا چل جائے گا۔ ابھی تو میں ماما سے بات کروں گی“

”ماما تو مسز قریشی کی عیادت کرنے گئی ہیں“ سومانے بتایا۔ رمان، بچو کے لیے چائے

بنانے کی غرض سے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”کب تک آئیں گی“

”بس آنے ہی والی ہیں“

”کون لے کر آئے گا انہیں“ بچو نے شام کے سائے پھلتے دیکھ کر پوچھا۔

”اسامہ واپسی پر لے آئے گا“

”تمہارا کیا ارادہ ہے سوما“ بچو نے سوچا لگے ہاتھوں سوما کے فوج پر گفتگو کر لی جائے۔

”ابھی کچھ بھی نہیں سوچا“ اس نے گول مول سا جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ انہوں نے آنکھیں دکھائیں۔

”بچو! ہم کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے“

سومانے زچ ہو کر کہا۔

”مثلاً“ انہوں نے شریر مسکان لبوں پر سجا کر پوچھا۔

”رمان کی شادی“

”اس موضوع کی“ اوپننگ“ تو ہونے والی ہے تم اپنی خیر مناد“ وہ ہنستے ہوئے رمان کی آواز پر اٹھ گئی تھیں۔ جو کہ چائے تیار ہونے کا سندیدہ دے رہی تھی۔ سوما بھی سر جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

”آپا جان نے اوپر والی منزل کرائے پر دے رکھی ہے۔ ساتواں سال ہے اسے ادھر

رہتے ہوئے سچ پوچھیں تو جب آپا جان نے بات کی اور لڑکے کے بارے میں بتایا تو میں نے فوراً

ہی منع کر دیا۔ بی اے تعلیم، کسی فیکلٹی میں ورکر کی جاب، گھر بھی کرائے کا۔ سو مجھے علم تھا کہ آپ

کو بھی ایسا پر پوزل قطعاً پسند نہیں آتا مگر آپا جان کے بے حد اصرار پر عامر مان گئے بڑی بہن ہیں

بالکل ماؤں کی طرح پالا پوسا ہے انہوں نے عامر کو، سو مجھے تو ان کی بات ماننا ہی پڑی رجب کو

دیکھ کر نہ صرف میں بلکہ عامر بھی بے انتہا متاثر ہوئے تھے۔ ماما یوں سمجھیں گویا گڈڑی میں لعل سجا

ہے اتنا بھلا، اس قدر شاندار، سمجھ دار نیک، شریف اتنے سلیقے طریقے سے گفتگو کرنے والا۔ دھن

دولت کی کیا بات ہے۔ یہ سب نصیبوں کا ہیر پھیر ہے۔ رمان کی قسمت میں جتنا رزق لکھا ہے وہ

مل کر ہی رہنا ہے۔ میری خواہش ہے آپ صرف ایک مرتبہ رجب سے مل لیں۔ مجھے یقین ہے

آپ اسے رجحیکٹ کر ہی نہیں سکتیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا پلڑا ہر طرف سے ہلکا ہے“

انہوں نے بہت خاموشی اور تحمل سے بیٹی کی گفتگو اختتام تک سنی تھی۔

”باقی سب تو ٹھیک ہے بیٹے، مگر تعلیم اس کی رمان سے بھی کم ہے۔ کیا تمہیں نہیں لگتا

کہ وہ ہمیشہ احساس کمتری کا شکار رہے گا“

”اوں۔ ہوں قطعاً نہیں“ مریم نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ ایک دفعہ اس سے ملیں گی تو پھر فیصلہ کیجے گا۔ بہت بااعتماد ہے وہ۔ اپنے قوت

بازو پر انحصار کرنے والے مرد زمانے کی غتوں سے گھبراتے نہیں۔ ماما! آپا جان نے ظاہر تو نہیں

ہونے دیا مگر ایک بات میں نے نوٹ کی کہ مجھے یوں لگتا ہے آپا جان سے رجب نے خود کہا ہے

ورنہ رجب کا پر پوزل“ مریم کچھ سوچ رہی تھی رجب کی آنکھوں میں پکھلتے رنگ۔ کچھ اور کہاتیں

بیان کر رہی تھیں اس کی آنکھیں۔

”ماما! جوں ہی ہم گھر واپس آنے لگے تب ہی رجب دوبارہ آ گیا۔ وہ شاید اوپر

کپڑے بدلنے چلا گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک عجیب سی بات کہی، میں خود حیران ہوں اس نے ایسا

کیوں کہا“

وہ کچھ الجھتے ہوئے خاموش ہو گئی تھی۔

”کیسی بات؟“ رومانہ بیگم نے بھی حیرانی سے پوچھا۔

”اس نے مجھے کہا۔ میں اپنا مقدمہ آخری سانس تک لڑوں گا۔ یہ جذبول اور محبتوں

کی جنگ ہے۔ دیکھیں جیت کس کی ہوتی ہے“

”تم نے اس کی باتوں سے کیا اندازہ لگایا ہے“

”بہی کردہ رمان کو جانتا ہے“ مریم نے کچھ جھجکتے ہوئے کہہ دیا تھا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو مریم!“ انہوں نے ناراضی سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

”اس میں خفا ہونے والی کیا بات ہے ماما! آپ رمان سے پوچھ لیں“

”میری بیٹی ایسی نہیں“ انہوں نے سر جھٹک کر کہا۔

”اس اتوار کو رجب اور آپا جان کو بلوالوں“

”اتنی جلدی بھی کیا ہے میں شام سے مشورہ کر لوں گی پھر بات کریں گے“

”ماما! صرف ایک مرتبہ لیں۔ میری خاطر، آپا جان روز فون کر کے پوچھتی ہیں“

مریم نے التجائیہ کہا تو انہوں نے ہامی بھری۔

اگلی شام آپا جان شہوانہ، رجب کے ہمراہ آگئی تھیں۔ شہوانہ، عامر کی بڑی بہن تھیں

بیوگی کے بعد اپنے تینوں بیٹوں کے ہمراہ انہوں نے تنہا ہی زندگی کی سختیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ

درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ تھیں۔ بہت ہی رکھ رکھاؤ والی معاملہ فہم خاتون تھیں۔ پہلے بھی

اس گھر میں وہ اپنے بھائی کے لیے دست سوال دراز کرنے آئی تھیں۔ عامر کے پر پوزل کو

ایکسپٹ کر لیا گیا تھا۔ عامر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ ڈیفنس میں ان کے والد کا شاندار بنگلہ تھا جو کہ انہوں

نے اپنی زندگی میں ہی عامر کی ملکیت میں دے دیا تھا۔ عامر ایک غیر ملکی کمپنی میں بہترین پوسٹ پر

فائز تھا۔ ان کے والد نے ترکی میں عامر کے لیے دو پلاٹ اور کچھ زمینیں بھی چھوڑی تھیں۔

اس وقت بھی وہ پورے اعتماد سے اپنے بھائی کا پر پوزل لے کر آئی تھیں۔ آج بھی

ان کا ازلی اعتماد قائم و دائم تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ رجب، عامر کی طرح معاشی طور پر اسٹرونگ

نہیں ہے مگر انہیں یقین تھا کہ مسز رومانہ رضوی رجب سلطان کو رتبیکٹ کر ہی نہیں سکتیں۔

”رجب سلطان جیسے بیٹے تو ماؤں کا فخر ہوتے ہیں۔ غرور ہوتے ہیں ایسے، شیر جوان

بیٹوں کو دیکھ کر جسم میں گردش کرتا لہو تھم جائے۔ وہ جو سینوں کی گرمی کا سبب ہوتے ہیں۔

رجب مجھے اپنے تینوں بیٹوں کی طرح عزیز ہے“ دوسرے دن وہ تنہا ہی آئی تھیں آج

رجب ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ رومانہ رضوی کو سوچنے کے لیے وقت دینا چاہتی تھیں۔ رومانہ

رضوی نے پوری رات جاگتے گزاری تھی۔ انہوں نے جب جب رجب سلطان کے بارے میں

سوچا تھا انہیں خوشگوار حیرت گھیرتی رہی۔ وہ مسلسل رجب کے لیے مثبت انداز میں سوچ رہی

تھیں۔ صبح تک وہ ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئیں۔

”مجھے یقین ہے کہ رمان اور رجب بہت اچھی زندگی گزاریں گے“ شہوانہ نے یقین

بھرے لہجے میں کہا۔

”رجب بہت ذہین ہے۔ زندگی کی جہد میں وہ پیچھے نہیں رہے گا“

”میں اپنی بڑی بیٹی سے مشورہ کر کے آپ کو آخری فیصلے سے آگاہ کر دوں گی“

”بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے گا آپ کی ایک ہاں میں میرے بیٹے کے لیے زمانے

بھری خوشیاں سمٹ کر ایک دائرے کی شکل اختیار کر گئی ہیں اس دائرے سے وہ ٹکنا نہیں چاہے

گا۔ کبھی بھی نہیں زندگی بھر نہیں۔ میں رجب کے مزاج کے ایک ایک رنگ سے واقف ہوں“ آپا

جان نے نرمی سے التجا کی تھی۔ وہ رجب کی دیوانگی کے متعلق انہیں بتانا چاہتی تھیں۔ مگر وہ صرف

نم آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

رات کو انہوں نے چھوٹی سی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ اس دعوت میں صرف شام اور

عادل کو انوائٹ کیا گیا۔ عادل کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔ سرکاری رہائش گاہ میں ان کا قیام

تھا۔ شام ماما کے لہجے میں سنجیدگی دیکھ کر جان چکی تھی کہ معاملہ کافی گھمبیر ہے طے یہ پایا کہ اگلے

دن شام کو شام اور عادل دونوں رجب کے گھر اس سے ملنے جائیں گے۔

دوسری شام واپسی پر شام نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”ماما! رجب میں کچھ ایسا نہیں ہے کہ اسے رتبیکٹ کر دیا جائے۔ ہاں معاشی طور پر وہ

اسٹرونگ نہیں۔ بہر حال آخری فیصلہ آپ کا ہوگا۔ البتہ ایک بات کہوں کہ رجب کے مزاج.....

میں ایک ٹھہراؤ ہے۔ رمان اور رجب کی اچھی انڈر سٹینڈنگ رہے گی“ سب سے زیادہ مخالفت نینا

نے کی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اس کے دیور کو ٹھکرا دیا گیا تھا محض اس لیے کہ اس کے خیال میں

رجب ان کی لاڈلی بہن کو زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرنے کا اہل نہیں ہے۔

”رمان ان آسانوں کے بغیر کیسے رہے گا جن کی وہ بچپن سے عادی ہے“

”وہ ہر طرح کے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے کا ہنر جانتی ہے“ مریم بوجہ ہر صورت نینا کو قائل کرنا چاہتی تھیں۔

”آپ اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ ڈالنا چاہتی ہے“ نینا نے ناراضی سے کہا۔

”اس کے لیے نہ تو رشتوں کی کمی ہے اور نہ ہی وہ عمر رسیدہ ہو رہی ہے کہ کسی ناپسندیدہ بوجھ کی طرح اسے سر سے اتار دیا جائے“

”دولت کے ترازو میں شراف، نجابت اور محبت کو مت رکھو۔ پلڑا ہمیشہ پیسے کا بھاری نہیں ہوتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اونچی سوسائٹی کی عورتیں نیند کی گولیوں کا سہارا نہ لیتیں“ مریم نے ماں کے ہاتھ نرمی سے دبا کر نینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک دفعہ رمان نے کہا تھا کہ بوجھ میں کسی ایسے شخص کی بیوی بننا ہرگز بھی پسند نہیں کروں گی جس کی راتوں کا کچھ پتا نہ ہو اور میں ہمیشہ اسی خوف میں جکڑے زندگی گزار دوں کہ میرا شوہر نہ جانے اس وقت کہاں ہوگا۔ مجھے دو سے چار کرنے والے آدمی سے شادی نہیں کرنا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس نے کسی جاگیردار کے رشتے کو ٹھکرایا تھا وہ اس کا یونیورسٹی فیلو تھا“ مریم کی بات میں وزن تھا ورنہ رضوی کسی گہری سوچ میں گم ہو گئیں وہ اپنی بیٹیوں کو کیا بتاتیں کہ انہوں نے بھی زندگی کے کئی سال جلتے بزرخ میں گزارے تھے ان کا باپ بھی ایک عیاش آدمی تھا۔ وہ اچھا شوہر ہرگز نہیں تھا البتہ وہ ایک بہترین باپ ضرور تھا اس نے اپنی اولاد کو بہت ہی والہانہ محبت دی۔ رومانہ رضوی کی اکثر راتیں بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزرتی تھیں۔ انہوں نے بھی ایک رئیس آدمی سے شادی کر کے تمام عمر اس کی سزا کاٹی تھی انہوں نے اپنی بیٹیوں کو بیاہنے سے پہلے صرف ایک چیز کو مد نظر رکھا تھا وہ چیزیں شراف اور مقابل کا کردار اور یہ دونوں خوبیاں رجب میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

☆☆☆

”آج تو دیسی گیس کے چراغ جلا نا پڑیں گے۔ سو صاحبہ تشریف لائی ہیں“ ہسمہ،

سو ما کو تنہا آتا دیکھ کر خوشگوار حیرت سے لبریز آواز میں بولی۔

”خواہ مخواہ شرمندہ نہ کرو“ سو ماجز برزی ہوئی۔

”مون کدھر ہے“

”دور آسمان پر“ سومانے شرارتا کہا۔

”میں اس ”مون“ کی نہیں اپنی مون کی بات کر رہی ہوں جس کی وجہ سے رضوی ہاؤس میں اجالا ہے“ ہسمہ نے ہنستے ہوئے سومانے کے لیے کرسی خالی کر دی اور خود گھاس پر پھسکڑا مارے بیٹھ گئی۔

”تو کیا ہماری وجہ سے رضوی ہاؤس میں لوڈ شیڈنگ رہتی ہے“ سومانے آنکھیں دکھائیں۔

”یہی سمجھ لو“ ہسمہ نے نچلا ہونٹ دانت تلے دالیا۔

”اس قدر گھٹے گھٹے ماحول میں تم کسی طرح خوشگوار اور مطمئن رہتی ہو“ اس نے کچھ حسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”بات ساری دلی اطمینان کی ہے مجھے یقین ہے کہ پہلے والا وقت بھی نہیں رہا، یہ بھی نہیں رہے گا اور ان شاء اللہ اچھا وقت ضرور آئے گا“ ہسمہ نے رمان سے کہا۔

”آخری کاروبار یہ تمہارے ساتھ بے حد تحقیر آمیز ہوتا ہے اس کے باوجود تم نے کبھی شکوہ نہیں کیا“

”شکوہ اول تو کروں کسی سے۔ اور ویسے بھی ممی کی باتیں مجھے غصہ نہیں دلاتیں۔ میں ان میں ایسے معنی ڈھونڈ ہی لیتی ہوں۔ جو میرے حق میں بہتر ہوتے ہیں“ وہ دھیرے سے مسکرائی اور بولی۔

”چائے پیو گی؟“

”نہیں“

”تمہارے پاس بھی تو کچھ رشتوں کی کمی ہے پھر بھی تم پرسکون رہتی ہو؟“ وہ اس کے پرسکون چہرے پر نظر جما کر بولی۔

”باپ نہ رہیں تو چار دیواری گرتی ہے اور اگر ماں مر جائے تو چھت ڈھے جاتی ہے میں بھی ایک ایسے ہی طبقے میں سانس لے رہی تھی پھر جب پاپا بھی نہ رہے تو مجھے لگا زندگی کا بس اختتام ہو گیا ہے مگر آتی جاتی سانسوں نے زندہ رہنے کی گواہی دے کر پھر سے پر جوش کر دیا تھا کہ زندگی میں ہمارے حصے کی کچھ خوشیاں بھی موجود ہیں“ ہسمہ نے آنکھ میں اتنی نمی کو آستین سے پونچھا۔

”تم جس گھر میں رہتی ہو تمہارے اطمینان کے لیے کافی ہے کہ یہ گھر تمہارے باپ کا ہے“

بسمہ نے افسردگی سے بتایا۔

”انسان اتنی سی عمر میں اس قدر گناہ کر لیتا ہے کہ پھر کفارہ ممکن نہیں رہتا“ رمان نے تلخ لہجہ میں کہا۔

”اس کے باوجود میں می کی بہت خدمت کرتی ہوں“

”یہ تمہارا ”ظرف“ ہے“ رمان نے بسمہ کا ہاتھ نری سے دبایا۔ وہ بہت اپ سیٹ تھی۔

”تم جانتی ہو۔ نودانے اٹلی میں شادی کر لی ہے“

”شاید آنٹی کی خرابی صحت کی اصل ”وجہ“ بھی یہ ہے اپنی اولاد کا دکھ اسی طرح توڑ پھوڑ دیتا ہے“ وہ سچائی بیان کر رہی تھی۔ بسمہ گہری سوچ میں گم ہونے لگی۔

”ممی کے لیے یہ خبر کسی شاک سے کم نہیں تھی۔ انہوں نے تین دن کسی سے بھی کلام نہیں کیا“

”آہستہ آہستہ نارمل ہو جائیں گی“ رمان نے اسے تسلی دی۔

”میری دعا ہے وہ جلد از جلد صحت مند ہو جائیں اب ممی کے علاوہ میرا اس دنیا میں کون ہے۔ جو اب بھی شاید ہی پاکستان آئے“ جو اد اور نودانوں تقریباً تین ماہ پہلے لڑ بھگڑ کر ابراڈ چلے گئے تھے اور وہاں پہنچتے ہی نودانے اپنی شادی کی اطلاع دے کر حمیرا بیگم کو سخت ہراساں کر دیا تھا ان بیٹوں پر انہیں بہت مان تھا اور آج یہی مان ان کا منہ چڑا رہا تھا۔

”انسان جو بوتا ہے وہ ہی کاٹتا ہے۔ ہم برا عمل کر کے نجانے اچھے کی امید کیوں رکھتے ہیں“ رمان نے رنجیدگی سے کہا۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے کی آواز آرہی تھی۔ شاید اسامہ آنٹی کو ہسپتال لے جا رہا تھا۔ بسمہ اٹھ کر چائے بنانے لگی۔

”ایک بات سچ سچ بتانا بسمہ!“ رمان نے کچھ سوچتے ہوئے بسمہ کے چہرے کی طرف بغور دیکھا۔

”میں تم سے پہلے بھی جھوٹ نہیں بولتی“

”تمہیں اسامہ کیسا لگتا ہے؟“

”کیا مطلب“ بسمہ کا دل پہلو میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”ماما تمہارا ہاتھ مانگنا چاہتی ہیں اور میری خواہش ہے کہ ہم ہاتھ کی بجائے پوری کی پوری بسمہ کو اڑا کر لے جائیں“ رمان کو جواب کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی اس کے گالوں

”سوا! تم کیسی باتیں سوچتی ہو۔ اگر آنٹی کو تمہارے خیالات کی خبر پہنچے تو وہ صدمے سے ٹوٹ ہی جائیں“ بسمہ کو سچ بچ بہت دکھ سا ہوا۔

”تم سے ایک بات شیر کروں بسمہ! یہ بات تو میں رمان سے بھی نہیں کہتی ورنہ اس نے نصیحتوں کی پٹاری کھول لیتی تھی۔ میری خواہش ہے کہ میرا ایک محل نما گھر ہو۔ جس کے وسیع لان میں اونچے اونچے پام اور پام ٹری کے درخت ہوں۔ وہ محل صرف میرا ہو۔ اس پر صرف میری حکومت ہو اس محل میں مام جیسی کوئی عورت نہ ہو۔ نہ اس محل میں رمان جیسی چودھویں صدی کی کوئی لڑکی ہو۔ نہ اس میں ہر وقت رمان کی خوبیاں گنوانے والا اسامہ ہو۔ وہاں صرف میں رہوں، صرف میری بادشاہت ہو۔ یہ میرا ایسا خواب ہے جسے تعبیر میں ہر صورت دوں گی۔ میں اپنے بچوں کو ادھورا رہنے نہیں دوں گی۔ تمام عمر مجھے ایک احساس نے ہر وقت کچوکے لگائے ہیں اور وہ احساس، اترن کا ہے نئے نئے کور قیمتی ملبوسات پہننے کے باوجود مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں رمان کی اترن پہن رہی ہوں۔ اور مجھے رمان کی ”آپاؤں“ کی طرح کسی تنخواہ دار ملازم سے شادی نہیں کرنی خواہ وہ اعلیٰ سرکاری آفیسر ہی کیوں نہ ہو۔ میں کسی بزنس مین سے شادی کروں گی جو میری ہر خواہش کو لمحوں میں پورا کرے تاکہ پل پل، لمحہ لمحہ مہینہ گزرنے کے انتظار میں خود کو کسکایا نہ جائے“ بسمہ پوری آنکھیں کھولے بے انتہا حیرت سے سوما کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس بل بسمہ کو وہ بہت ہی خود غرض اور بے حس محسوس ہو رہی تھی جسے صرف اپنی خواہش عزیز تھیں۔

”تم ایک محل نہیں ”مندر“ کی خواہش رکھتی ہو۔ تم چاہتی ہو لوگ تمہیں دیوی مان کر تمہاری پرستش کریں۔ تم جیسے غیر مطمئن لوگ ہمیشہ بے سکون رہتے ہیں“ بسمہ نے تلخی سے سوچا تھا اور اسے جاتا دیکھتی رہی۔

اسی شام مون، حمیرا آنٹی کی خرابی طبیعت کا سن کر اسامہ کے ہمراہ آئی تھی بسمہ کو سوچوں میں الجھتا پا کر حیران رہ گئی۔

”کون سا مسئلہ حل نہیں ہو پا رہا جس پر اپنے ننھے سے دماغ کو زحمت دے رہی ہو“

”کچھ نہیں، آؤ تم اتنے دنوں بعد نظر آرہی ہو“ بسمہ نے مصنوعی بشامٹ سے کہا۔

”اسامہ بھی آیا ہے۔ آنٹی کا چیک اپ کر رہا ہے۔ شاید ای سی جی کے لیے انہیں ہسپتال جانا پڑے“

”ممی کی صحت دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ اب ان میں پہلے والا دم خم باقی نہیں رہا“

کے گلابوں اور جھلی جھلی نظروں نے سارے راز ظاہر کر دیئے تھے۔

”توبہ، کتنی گھنی ہو تم بسمہ“ رمان نے اسے ڈھیر ساری گدگد کی کر ڈالی اور وہ شرماکر اس سے لپٹ گئی تھی۔ بسمہ کے حصے کی خوشیوں نے ہولے ہولے دستک دینا شروع کر دی تھی اور اس نے ڈھیرے سے اٹھ کر تمام در پیچے کھول دیئے۔

☆☆☆

نینا کے ہاں بیٹے کی ولادت نے ان سب کو بے پایاں مسرت سے ہمکنار کر دیا تھا ماما اور رمان پچھلے تین دن سے نینا کے پاس تھیں۔ آج صبح اسامہ، ماما کو لے گیا تھا البتہ رمان نینا کے پاس ہی رک گئی۔ ابھی نینا کی صحت اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ کچن کا چھوٹا موٹا کام سرانجام دے سکتی۔ سورمان نے بچے سمیت کچن کا کام بھی سنبھال لیا۔ ویسے بھی اکثر شام کی چائے پر قاسم بھائی کے دوست، احباب وغیرہ مبارک دینے، ننھے نومولود کو دیکھنے آ جاتے تھے سورمان کو آل ریڈی بہت کچھ تیار کرنا پڑتا تھا اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے اس کے کوننگ کے کورسز کام آرہے تھے سو وہ کباب، رول، سمو سے اور پکڑے وغیرہ پہلے سے ہی تیار رکھتی تھی۔

آج اچانک عاشر بچے کو دیکھنے چلا آیا تھا اور رمان کو دیکھ کر گویا اس کے من کی مراد بر آئی تھی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ چائے بنا رہی تھی جب پیچھے سے عاشر کی آواز سنائی دی۔

”اللہ کا کرم ہے“

”وہ تو واقعی ہے“ عاشر اس کے سراپے پر نگاہ جما کر بولا۔

”آپ کو کچھ چاہئے؟“ رمان اس کی موجودگی سے الجھ رہی تھی۔

”جی“

”کیا؟“ اس نے چونک کر پلٹ کر پوچھا۔

”اپنے ٹھکرائے جانے کا جواب چاہئے۔ رد کرنا آسان ہے۔ رد ہونا بہت تکلیف

دیتا ہے۔

”میری والدہ نے جو مناسب سمجھا وہی کیا ہے۔ سو آپ میرے ساتھ اس موضوع پر

بات نہ ہی کریں تو بہتر ہے“ وہ رکھائی سے بولی۔

”تمہیں اس انکار کی قیمت چکانا پڑے گی“ وہ لہجوں میں ہی لہجہ بدل کر پھنکارا۔

”یہ دھکیاں کسی اور کو دینا“ وہ تنفر سے بولی۔

”تمہارے اس غرور کو توڑ دیا تو کہنا“

”بہت تکبر ہے تمہیں اپنے ان بڑے بولوں پر اللہ کی قہر سے ڈرو نادان انسان“ وہ پلٹ کر برز بند کر کے چائے فلاسک میں ڈالنے لگی۔

”تمہارا ایک بھائی ہے اس کی خیریت کی دعائیں مانگا کر“

”اے اللہ کی امان میں دے رکھا ہے۔ تمہارے جیسے شیطان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے“ اس نے زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے ٹرائی کو گھسیٹا۔

”اونہ، دیکھ لوں گا میں تمہیں“ وہ آگ بگولہ سا ٹرائی کو زوردار ٹھوکر مار کر باہر نکل گیا تھا۔ نینا دہل کر بیڈروم سے باہر نکلی۔

”کیا ہوا مون؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ قطعاً نہیں گھبرائی تھی۔

”یہ آواز کیسی تھی اور عاشر کہاں چلا گیا ہے“ پھر جوں ہی نینا کی نظر کچن میں اونٹھی ٹرائی پر پڑی وہ گویا سب کچھ سمجھ کر ایک پل کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

”عاشر نے تمہارے ساتھ“ نینا کچھ خوفزدہ سی لرز کر رہ گئی۔

”اتنی جرات نہیں ہے مسٹر عاشر میں۔ اور مجھے اپنا دفاع کرنا آتا ہے“ وہ جھک کر ٹوٹے برتن اٹھانے لگی تھی۔

”مجھے عاشر سے اس بد تہذیبی کی امید نہیں تھی“ نینا نے پشیمانی سے کہا۔

”اور مجھے آپ سے دیور سے ہر طرح کی کمینگی کی توقع ہے“ فلاسک میں سے چائے نکال کر اس نے مگ میں ڈالی اور پھر سمو سے اور کپچ لے کر نینا کے پیچھے لاؤنج میں آ گئی۔

”میں سوچ رہی تھی کہ عاشر کچھ سلجھ گیا ہو گا مگر شوبز کی تیلیوں کے ارد گرد رہتے ہوئے

ایسا ممکن کہاں ہے۔ میں قاسم سے بات کروں گی“ نینا کو بے حد غصہ آیا۔

”کیا بات کریں گی“

”یہی عاشر کی بے ہودگی کی“

”چچ۔ بہت افسوس ہو رہا ہے نیانی سیٹ جو ٹوٹ گیا“ اس نے آپی کا دھیان

بنانے کی غرض سے شوخی سے کہا۔

”بھائی میں جائے ٹیٹ“ نینا کو سخت تاؤ آرہا تھا۔ قاسم بھائی کے گھر آتے ہی وہ گویا پھٹ پڑی۔ پوری بات سن کر ان کی پیشانی پر شکنوں کا جال نمودار ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس وقت گاڑی کی چابی اٹھائی اور عاشر کی طرف آگئے۔

”بڑے نصیب کی بات ہے کہ بھائی جان تشریف لائے ہیں“ وہ انہیں دیکھتے ہی چہکا۔

”تم نے رمان کے ساتھ بدتمیزی کی ہے“ انہوں نے سلگ کر پوچھا۔

”تو کیا سالی صاحبہ نے فوراً شکایت لگا دی“

”بکواس بند کرو“

”سالی کیا بھائی سے زیادہ عزیز ہے“ عاشر نے پاؤں جھلانے کا عمل ترک کر کے

مصنوعی سنجیدگی سے پوچھا۔

”اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ ورنہ اپنا ناقابل تلافی نقصان کر بیٹھو گے“ قاسم نے

وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ معصومیت کے ریکارڈ توڑنے کے درپے تھا۔

”وہ شریف اور عزت دار لوگ ہیں انہیں کسی پچھتاوے میں مبتلا کرنے کی کوشش

مت کرنا“

”کون سے پچھتاوے کی بات کر رہے ہیں“

”ہمارے ساتھ رشتہ جوڑنے کی غلطی۔ مجھے افسوس ہے کہ تم میرے بھائی ہو“ وہ سختی

سے کہتے ہوئے اٹھ گئے۔

”آئندہ مجھے شکایت نہیں ملنی چاہئے“ جاتے جاتے انہوں نے وارننگ دی تھی۔

ایک مرتبہ جب ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی تب بھی عاشر نے مون کے ساتھ بدتمیزی

کرنے کی کوشش کی تھی تب وہ نینا کو جھڑک کر خاموش کروانے کے بعد لا پرواہ ہو گئے تھے مگر کچھ

عرصہ بعد انہیں پھر سے نینا نے بتایا۔ عاشر مون کی یونیورسٹی پہنچ گیا تھا۔ ان کے ڈانٹنے جھڑکنے کا

اتنا اثر ہوا کہ عاشر نے فی الوقت اپنی دلچسپیوں کا رخ موڑ لیا۔ اتنے عرصے بعد وہ بھی سمجھنے لگے

تھے عاشر کچھ سدھر گیا ہے۔ پھر اس کے سلیقے سے پر پوزل دینے کے مشورے پر انہوں نے بغیر

سوچے سمجھے عمل کر لیا تھا۔ ان کی ساس بہت دانشمند خاتون تھیں۔ سو انہوں نے بہت سلیقے سے

عاشر کی فطرت کے بارے میں انہیں باور کروایا کہ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں اور

فطرت کبھی بھی نہیں بدلتی سو وہ خاموش ہو گئے تھے بہر حال ان کی ساس نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ وہ بھائی سمجھ کر عاشر کی کون کون سی غلطیوں پر پردہ ڈالتے۔ اپنے حصے کی تمام پر اپنی بیچ کر اس نے ایڈورٹائزنگ کمپنی اسٹبلش کر لی تھی۔ اگرچہ اس کی کمپنی ان چند سالوں میں اچھی ساکھ بنا چکی تھی تاہم عاشر کی ”شہرت“ کے بھی خوب چرچے سننے کو ملتے رہتے تھے۔

آئے دن تو وہ خبروں کی زد میں رہتا تھا۔ نینا بھی عاشر کی سرگرمیوں سے واقف تھی پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی والدہ کو دھوکا دیا جاتا۔

وہ گھر آئے تو رمان جا چکی تھی۔ انہیں نئے سرے سے تاسف نے گھیر لیا۔ تاہم نینا نے ان کی تسلی بخشی کروادی تھی کہ رمان خفا ہو کر نہیں گئی۔

ادھر رمان نے ماما کو صاف صاف بات بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔

”عاشر نے کوئی فضول حرکت تو نہیں کی“ انہوں نے دہل کر پوچھا۔

”نہیں ماما۔ ایسے بزدل انسان صرف خالی خولی دھمکیاں دیتے ہیں“ رمان نے

اطمینان سے ہاتھ جھاڑے۔

”آئندہ تمہیں نینا کی طرف اکیلے نہیں بھیجوں گی“ وہ ماں تھیں ایک دم خوفزدہ ہو گئیں۔

”آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں“ اس نے ماما کے نرمی سے ہاتھ دبائے۔

”نجانے کیوں دل کو دھڑکا سا لگ گیا ہے“

”سارے ذہنوں کو چولہے میں جھونک دیں آپ کی بیٹی کوئی کمزور اعصاب کی مالک

نہیں ہے“ وہ ان کے ہاتھ آہستہ آہستہ دبا رہی تھی۔ ان کے دل میں سکون کی لہریں سی اٹھنے لگی

تھیں پھر اچانک یاد آنے پر دھیرے سے بولیں۔

”آج رخصت آیا تھا“

”کیوں؟“ اس کا دل دھڑک اٹھا۔

”شہوانہ نے بھیجا تھا اے، مٹھائی دے کر گیا ہے نینا کے بیٹے کی، نجانے کیسی

اچانکیت کی مہک آتی ہے مجھے اس سے دل خود بخود کھینچنے لگتا ہے“

”ماما! آپ نے آپا جان کو کیا جواب دیا ہے“ بہت جھجکتے ہوئے بالآخر اس نے پوچھ

ہی لیا تھا۔

”ابھی کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ میں کچھ اور سوچ رہی ہوں“

”کیا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔ اسی پل فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ ماما فون کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ رمان چپکے سے پچھلے صحن میں آ کر بیٹھ گئی۔ رجب کا تصور اس کے ہمراہ تھا۔ نجانے کیوں دل اس کے نام پر زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ ہتھیلیاں پسینے سے نم ہونے لگتیں۔ وہ اکثر رجب سلطان کو تنہائیوں میں سوچنے لگی تھی اور وہ اس کی آنکھوں میں خواب بن کر اتر آیا تھا۔ محبت کے اس سفر میں رجب سلطان تنہا ہر گز نہیں تھا۔

☆☆☆

”آپ نے واضح لفظوں میں کوئی جواب نہیں دیا خالہ جان“ آپا جان فون پر کہہ رہی تھیں۔ ”اسامہ ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے کراچی گیا ہے۔ اس کی واپسی کے ساتھ ہی آپ کو جتنی جواب دوں گی“ انہوں نے سلیقے سے نرمی سے کہا۔ ”ہم اچھے جواب کی امید رکھیں“

”آپ تسلی رکھیے بیٹا! رجب مجھے بہت عزیز ہو گیا ہے۔ اس کی شریک سفر تو بہت خوش قسمت لڑکی ہوگی“ رومانہ بیگم نے بہت حلاوت سے کہتے ہوئے سوما کی طرف دیکھا۔ وہ صوفے میں دھنسی کسی میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی۔

”اسامہ کی واپسی کب تک متوقع ہے؟“ شہوانہ نے بے چینی سے پوچھا۔ ”اتوار شام تک آجائے گا انشاء اللہ“ مزید کچھ دیر بات کرنے کے بعد انہوں نے فون رکھ دیا تھا۔

”ماما! آپ رمان کے لیے آئے پر پوزل کو فائل کرنے والی ہیں“ سومانے میگزین میز پر اچھالتے ہوئے پوچھا۔

”ہوں“ انہوں نے محض ہنکارا بھرا۔ اس پل بسمہ ایک باؤل اٹھا کے اندر آتی دکھائی دی تھی۔ گفتگو کا موضوع خود بخود ہی بدل گیا۔

”کیا لالائی ہو“ سومانے بے صبری سے پوچھا۔

”کڑھی کوفتہ“

”اونہد۔ یہ بھی کوئی ڈش ہے“ سومانے منہ بنالیا۔

”لاؤ ادھر دو مجھے“ ماما نے اس کے ہاتھ سے باؤل پکڑ لیا۔

”رنگت تو خوب ہے ذرا کفہ بھی یقیناً اچھا ہوگا“ ماما کی تعریف سے بسمہ کھل اٹھی۔

”تھینک یو آئی جی“

”کاش اسامہ ہوتا تو کم از کم اس ”کڑھی کوفتہ“ کی شان میں ایک غزل تو ضرور کہہ دیتا“ سومانے معنی خیزی سے آنکھیں گھما کر کہا۔ بسمہ کچھ فحش سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔

”کیسی طبیعت ہے حمیرا کی؟“ ماما نے اسے خجالت کے حصار سے نکالتے ہوئے پوچھا۔ ”اب قدرے بہتر ہیں“

”فوان، جواد کا فون تو آتا ہے“

”جی، کبھی کبھی بات ہوتی ہے“

”کال جواتی مہنگی ہے“ سومانے مصنوعی سنجیدگی سے کہتے ہوئے رمان کو آواز دی۔

”بسمہ آئی ہے، نکل آؤ اپنے حجرے سے“

”تیل ڈالنا تھا دروازہ کی چوٹ میں“ رمان نماز پڑھ کر آئی تھی۔ ابھی تک دوپٹہ نماز کے اسٹائل میں لپیٹ رکھا تھا۔

”اللہ خیر کا وقت لائے، سارے ارمان پورے کروں گی“ ماما نے محبت سے بسمہ کے

چہرے کی طرف دیکھا۔ اسامہ نے چند دن پہلے ہی اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا سودہ کچھ دن تک حمیرا کی طرف جانے کا پروگرام طے کئے ہوئے تھیں۔ غینا کی صحت یابی کا انتظار تھا۔

اگلی شام اسامہ گھر پہنچ گیا تھا اور انہوں نے اسامہ سے مشورے کے بعد شام کو بلوایا۔

”رمان کی طبیعت میں بہت ٹھہراؤ ہے رجب بھی بہت صلح جو طبیعت کا معلوم ہوتا ہے

جبکہ سوما بہت گرم مزاج کی ہے۔ اسے جلدی غصہ آتا ہے اس کے لیے رجب جیسا ٹھنڈے مزاج

کا بندہ ٹھیک رہے۔ سو میں نے سوما کی بہتری جان کر رجب اور سوما کی بات طے کرنے کا فیصلہ

کیا ہے۔ کیا تم لوگوں کو کوئی اعتراض ہے؟“

”ماما“ رمان کے لب پھڑ پھڑائے تھے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا دھیرے دھیرے

اس کے پیروں تلے سے زمین سرک رہی ہے۔

”مجھے آپ کا فیصلہ منظور نہیں ہے“ سوما آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہو کر چلائی۔

”جھل سے بات کرو، ہم سب بہرے نہیں ہیں“

اسامہ نے ناگواری سے اسے ٹوکا۔

”جس کے لیے پر پوزل آیا ہے اسی کے لیے“ ہاں“ کریں تو بہتر ہے“



”مگر بیٹے میں تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہی ہوں۔ سیر کو سوا سیر مل گیا، تو گزارہ کیسے ہوگا۔ میں کیا تمہارے مزاج سے واقف نہیں ہوں حاکمیت پسندی تو تم میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے“ ماما نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ایک بارہ ہزار ماہوار کمانے والے شخص سے آپ میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ کون سی ”بہتری“ کا دھندورا پیٹ رہی ہیں۔ اپنی بیٹیوں کے لیے کسی شخص کا انتخاب کر لینا تھا آپ مجھے تمام عمر کے لیے آنے والے بھاء میں الجھانا چاہتی ہیں“ وہ ہر خند ہو کر چلائی ماما کی رنگت متغیر ہونے لگی تھی۔

”اس قدر زہر بھرا ہے تم میں“ صدے کی شدت سے ان کی آواز پھٹ سی گئی۔

”بد تمیز، واہیات، ذرا اپنے الفاظ پر غور کرو“ رمان نے بھی دانت پیس کر اسے غصے سے ڈپٹا۔

”اپنے حق میں آواز اٹھانا کہاں کی بد تمیزی میں شمار ہوتا ہے۔ اگر اتنے ہی رجب سلطان میں سرخاب کے پر گلے ہیں تو رمان کے لیے ہاں کہہ دیجئے، سوما کی آنکھوں میں بھر پور چیلنج کی چمک تھی۔ اسامہ کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔

”سوما! فضول بکواس مت کرو، ٹھیک ہے۔ جاؤ تم اپنے کمرے میں کوئی بھی فیصلہ تمہاری مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا“

”میں رمان کی ”ہاں“ سے بغیر تو نہیں جاؤں گی“ وہ ڈھیئوں کی طرح وچیں کھڑی رہی۔ شروع سے ہی وہ ایسی تھی۔ اکھڑ، ضدی اور ہٹ دھرم۔ ان سب کے لیے سوما کا رویہ مختلف نہیں تھا غصے میں تو وہ اس سے بھی زیادہ بدکلامی کا مظاہرہ کرنے لگتی تھی۔

”اسامہ، شہوانہ سے بات کروادو میری۔ بہر حال رجب سلطان جیسے لڑکے کو صرف اس وجہ سے رد کرنا کہ وہ بارہ ہزار ماہوار تنخواہ لیتا ہے دانشمندی نہیں۔ میں نے تمہارے بھلے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ رجب میں اس ایک برائی کے علاوہ اتنی خوبیاں ہیں جو تم میں سے کسی کو نظر نہیں آسکتیں۔ اپنے قوت بازو پر بھروسہ کر کے حلال رزق کمانا تو عبادت ہے۔ اگر میں اس سے مل نہ چکی ہوتی، اسے پرکھ نہ چکی ہوتی تو شاید میرا فیصلہ اس وقت مختلف ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی اس بارہ ہزار کمانے والے رجب سلطان کے ساتھ اچھی زندگی کا آغاز کرے گی کہ اس کی ماں کی ”ممتا“ اور ”انا“ پر بڑی گہری ضرب پڑی ہے“ ماما نے اسامہ کے ہاتھ سے کارڈس پکڑ کر

اک گہری نگاہ سوما پر ڈالی تھی اور پھر فون کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ رات کو سوما اس کے بیڈروم میں آئی تو دونوں کی زوردار جھڑپ ہو گئی۔

”تم تحمل سے بھی اپنا نقطہ نظر واضح کر سکتی تھیں۔ ماما سے بدکلامی کرنا ضروری تھا“

”میں نے کوئی بد تمیزی نہیں کی۔ اور ماما مجھ سے ناراض ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ انہیں پتا کہ میں کس قدر منہ پھٹ ہوں“ سوما نے چڑ کر لوٹن اٹھایا اور بیڈ پر آلتی پالتی مارے بیٹھ گئی۔

”یہ خوبیاں“ تمہیں بہت نقصان سے دو چار کریں گی“

”میرے بارے میں اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے بارے میں سوچو، رجب سلطان کے سنگ تمہیں رخصت کرنے کی پلاننگ پر عمل درآمد کیا جانے لگا ہے۔ ماما کے ایک قفلے فیصلے میں اسامہ بھی ان کا ہنوا ہو چکا ہے اب تم ابھی سے ہی خود کو تیار کر لو کہ کس طرح حالات سے نمٹنا ہے“

”اپنے حال سے مطمئن ہونے والے مستقبل سے خوفزدہ نہیں ہوتے“ رمان نے سوچ بورڈ پر ہاتھ مار کر لائٹ آف کر دی تھی۔

☆☆☆

شام چار بجے نکاح تھا اور سات بجے رخصتی۔ اتنی سادگی سے نکاح کیا جا رہا تھا حالانکہ اسامہ اتنی بھی سادگی کے حق میں نہیں تھا مگر رمان کی ضد کی وجہ سے اسے خاموشی اختیار کرنا پڑی وہ نمود و نمائش کے حق میں نہیں تھی۔

”یہ شادی ہو رہی ہے یا چالیسویں کا ختم“ سوما کی زبان کے آگے تو خند قحقی۔ ثناء آپا نے دہل کر اسے ڈپٹا۔

”میں تو اپنی شادی بہت دھوم دھام سے کرواؤں گی تاکہ مدتوں لوگوں کے ذہنوں میں تازہ رہے“ وہ اپنے قیمتی ڈریسز پر تنقیدی نظر ڈال کر کہہ رہی تھی رمان نے پارلر جانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ شہوانہ آپا بری کی شاپنگ کے سلسلے میں اس کی پسند پوچھنے کے لیے آئیں تب بھی اس نے سہولت سے منع کر دیا۔

لہنگا کی بجائے اس نے سوٹ بنوانے کے لیے کہا تھا۔ آپا تو اس کی سمجھداری کی قائل ہو گئی تھیں انہیں رجب کی قسمت پر بے اختیار رشک آیا۔

نکاح کے بعد سوما اس کی تیاری سے مطمئن ہو کر ڈرائنگ روم کے دروازے سے چپک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اصل میں وہ رجب کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے رمان کے دولہا کی تصویر تک بھی نہیں دیکھی تھی۔

نجانے اس لمحہ میں کون سا جادو تھا۔ کیسا سحر تھا جس نے سوما کو اپنے حصار میں لے کر گویا جکڑ لیا دروازے کی جھری میں اسے وہ سامنے صوفے پر بیٹھا دکھائی دیا تھا اور سوما کو لگا محض چند پل میں اس کے دل کی دنیا پر ایک قیامت بیت گئی ہے۔ اس نے رجب کو ایک مرتبہ دو مرتبہ اور پھر کئی مرتبہ دیکھا۔ وہ اسے یک ٹک دیکھے جارہی تھی۔ اسے اپنی ”نگاہ“ پر اختیار نہیں رہا تھا اسے زمان و مکان بھول چکے تھے اسے یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ اس کی کزن کا شوہر بن چکا ہے اسے یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ اسے پانے کے تمام اختیار کھو چکی ہے۔

اسے یاد رہا تو بس اتنا کہ رجب سلطان اس کی زیست کا حاصل بن چکا ہے دل نے کس مقام پر آکر دھوکا دیا تھا۔

جب وہ پلٹ کر سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تب وہ اپنے آپ میں نہیں تھی اس نے اپنی سوچیں، خواب، حتیٰ کہ احساس تک رجب سلطان کے قدموں ڈھیر کر دیا تھا کوئی اس طرح بھی لٹتا ہے؟

اسے بھول چکا تھا کہ سوما سرفراز کو ایک بہت بڑی پیر ماڈل بننا ہے اسے بھول چکا تھا کہ سوما کو محل نما گھر کی خواہش تھی اسے اپنے خوابوں سے کراہیت آنے لگی تھی وہ لٹے پٹے انداز میں بیڈ پر ڈھے گئی۔

سوما سرفراز کو ڈھلتی ہوئی سلونی شام کے اس غریب اپالو سے محبت ہو گئی تھی جو ام رمان کا اسیر تھا اور جسے ام رمان سے راہ چلتے پہلی نظر میں عشق ہو گیا تھا۔

لمحہ لمحہ بیتتا رہا، قطرہ قطرہ دل پگھلتا رہا۔ سوما کی راتیں رات جگے کے عذاب کے اولین ذرائع سے آشنا ہونے والی تھیں۔

رمان کو محسوس ہوا کہ سوما اس کے ارد گرد کہیں بھی نہیں ہے حتیٰ کہ رخصتی کے وقت بھی سوما اسے دکھائی نہیں دی تھی۔

ماں نے اسے قرآن پاک کے سائے تلے رخصت کیا۔ بھائی نے بہت محبت سے تمام کرا سے گاڑی میں بیٹھایا۔ بہنوں نے اسے اللہ کی امان میں سونپا اور مطمئن ہو گئیں۔ گاڑی

انجانے راستوں پر رواں دواں تھی۔

اسے ایک مہکتے گلابوں سے سج کرے میں بیٹھایا گیا تھا۔ شہوانہ آپا کے تینوں بیٹے اس کے دائیں بائیں تھے۔

”بھابھی! نوٹویشن کے لیے تیار ہو جائیے“ نومی کیمرے تھامے الٹ تھا۔

”ملک کے مایہ ناز کیمرہ مین تشریف لائے ہیں“

”ایک نوٹویری بھابھی کے ساتھ بنانا“ شانی، رمان کے ساتھ چپک کر بیٹھ گیا۔

”پچھلے ہولنگور میں ایک بھی تصویر ضائع نہیں کرنا چاہتا“ نومی نے ڈپٹ کر کہا۔ شانی بسور نے لگا تھا بھی ٹامی بھی بے تھے نیل کی طرح ڈمگنا آ گیا۔

”امی کہہ رہی ہیں فوراً نیچے آ جاؤ۔ اب صبح بھابھی کا دماغ چاٹنا۔ ابھی وہ تھکی ہوئی ہیں اسی پل شہوانہ آپا کھانے کی ٹرے اٹھائے چلی آئیں انہوں نے بیٹوں کو ڈپٹ کر کمرے سے نکالا۔ وہ تینوں ہی منہ بسور تے ہوئے باہر نکل گئے۔

”میں تمہیں کچھ باتیں بتانا چاہتی ہوں رمان بیٹی! رجب میرا بہت ہی ذہین اور عزیز از جان اسٹوڈنٹ تھا اس کے والدین کا انتقال ہو گیا ہے۔ بچپن سے ہی رجب میرے بہت قریب رہا ہے وہ اس طرح کہ میرے شوہر رشتے میں رجب کے کزن لگتے تھے پہلے یہ اپنی پھوپھی کے پاس ہوتا تھا انہوں نے ہی رجب کو پالا پوسا ہے بی اے کے بعد رجب کو اچانک تعلیمی سلسلے کو منقطع کرنا پڑا۔ اس کی پھوپھی کو اچانک اک موذی مرض نے گھیر لیا تھا رجب کے پاس جمع جتنا جو کچھ بھی تھا سب اس نے بیچ ڈالا وہ ان کے علاج کے لیے کراچی تک گیا تھا مگر پھر بھی ہاتھ کچھ نہ آیا۔

اس کی پھوپھی کے انتقال کے بعد میرے بے حد اصرار پر بھی اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہیں لیا تھا پورے ساتھ ماہ نوکری کی تلاش میں بھٹکنے کے بعد اس نے ایک فیکٹری میں ملازمت کر لی تھی اسے کسی پربوجھ بننا پسند نہیں تھا پہلے اسے چار ہزار ماہوار تنخواہ ملتی تھی مگر اس کی محنت اور لگن کی وجہ سے ترقی ہوتی گئی مجھے یقین ہے رجب بہت آگے جائے گا۔ اس نے پرائیویٹ ایم اے کے پیپرز کی تیاری کر رکھی تھی۔ پچھلے ہفتے وہ امتحان سے فارغ ہو گیا ہے ان شاء اللہ جلد اسے اچھی ملازمت مل جائے گی۔ جن کے ارادے پختہ ہوں اور اللہ تعالیٰ پر نظر ہو وہ کسی بھی طوفان سے گھبراتے نہیں ہیں“ شہوانہ آپا نے اس کی پیشانی چوم کر عادی تھی۔

”رجب اندر آنے کو بے چین ہے مگر وہ شریعہ بنانے کون کون سے نیگ وصول کر رہے

ہیں اس سے ضرورت کے وقت وہ بہنوں، ہندوں اور سالیوں کے تمام رول نبھالیتے ہیں، وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی تھیں جبکہ رمان کی نظر شرم سے جھک گئی۔

☆☆☆

وہ اس کے مقابل بہت آہستگی سے بیٹھ گیا تھا۔

”السلام وعلیکم“ لہجے میں بے پایاں خوشی، تازگی کے تمام رنگ نمایاں تھے۔ سفید کاشن کے قمیض شلوار میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ رمان نے نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر مسکرا دی۔

”میں نے آپ پر سلامتی بھیجی ہے“ اک شریر مسکراہٹ اس کے لبوں پر چمکنے لگی۔

”وعلیکم السلام“ رمان کو دھیمے سروں میں کہنا پڑا۔

”میں خواب کے سفر میں ہوں ام رمان! مجھے یقین دلاؤ کہ میں تمہیں پاچکا ہوں“ اس

کے لفظ لفظ سے سرشاری پھوٹ رہی تھی۔

”جس چاند کی میں نے تمنا کی تھی آج وہ چاند میرے درتچے میں سے جھانک رہا ہے

مجھ سے زیادہ روئے زمین پر کوئی بلند بخت نہ ہوگا“ مسرت کی کرنیں اس کی روشن آنکھوں کو تابناک کر رہی تھیں۔

”میرا اور تمہارا خوج آسمان پر لکھا تھا ورنہ مسز رومانہ رضوی کے لیے ایک مزدور آدمی

کا پرپوزل ایکسپٹ کرنا کس قدر کٹھن ہوگا“ وہ اس کے گال پر ہاتھ پھیر کر گویا اس کی موجودگی کو محسوس کر رہا تھا۔

”میں بہت معمولی سا آدمی ہوں۔ شہرت اتنی سی ہے کہ محلے کے لوگ بھی نہیں جانتے

ہوں گے۔ بہت زیادہ روپیہ بھی نہیں ہے مگر میں تمہیں کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہونے دوں گا۔ چاند، تاروں کے وعدے افسانوں سی باتیں ہیں مگر میں زندگی کی ہر آسائش تمہیں دینے کا خود سے وعدہ

کر چکا ہوں۔ وہ تمام آسائشات جو تم چھوڑ کر آئی ہو۔ اور اس ضمن میں پہلا قدم میں نے اٹھالیا جس روز مسز بکس کے ہال میں نے تمہیں دیکھا تھا اسی روز سے آگے بڑھنے کی لگن ایک مرتبہ پھر

مجھے کتابوں کی دنیا میں لے آئی تھی۔ میں مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تمہاری دعائیں میرا ساتھ دیں گی بس زندگی کی کٹھنوں سے گھبراتا ہوں۔ تمہارا کی ڈنگا تا قدم

میرے ارادوں کو توڑ ڈالے گا“ رجب نے اس کی روشن پیشانی کو چھو کر نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

”کچھ بولو گی نہیں؟“

”کیا بولوں“

”یہی بتا دو کہ میں تمہیں کیسا لگا ہوں؟“

”اچھے ہیں“ وہ بمشکل بولی۔

”صرف اچھا“ رجب نے حیرانی سے پوری آنکھیں کھولیں۔

”زیادہ اچھے تو تب لگیں گے جب رونمائی کا تحفہ دیں گے“ رمان کے منہ سے نہ

جانے کیسے پھسل گیا تھا۔ رجب کے نفیس سے قمیض نے اسے قدرے تجل سا کر دیا۔

”اوہو، تو کیا آپ کو رونمائی کا تحفہ چاہئے“ وہ بہت محظوظ ہو رہا تھا پھر اس نے جیب

میں سے ایک سرخ مخملی کیس نکالا۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں اس معاملے میں بالکل ”کورا“ ہوں“

”نہیں، آپ تو بہت تجربہ کار، معلوم ہوتے ہیں“

”میں آپ کی حاضر جوابی کی داد دینا چاہتا ہوں“ اس نے نفیس سا ایک نگن اس کی

گداز کلائی میں سجایا تھا وہ اتنے مہنگے تحفے کو دیکھ کر حیران سی رہ گئی تھی۔

”تو سوچ کیا رہے ہیں“ رجب کے ہلکے پھلکے دوستانہ رویے نے رمان کو مطمئن کر دیا

تھا اس کا کھویا ہوا اعتماد پھر سے لوٹ آیا تھا۔

”اجازت ہے“ وہ رجب کی پہلی پیش قدمی پر گڑبڑائی۔

”میرے داد دینے کا انداز قدرے مختلف ہے“ وہ اس کے کان میں سرگوشی کرتے

ہوئے دھیرے سے بولا تھا۔ رمان نے سرشار سے انداز میں مسکراہٹ دہالی۔

☆☆☆

ویلہ سے فارغ ہو کر وہ ماما کی طرف کچھ دن رہنے کے لیے آگئی تھی رجب نے اسے

ایک رات رکنے کی اجازت دی تھی وہ بھی طویل ترین بحث مباحثے کے بعد۔

”بائیس سالوں سے ماما کے پاس ہی رہ رہی ہو۔ اور میری بائیس دن کی محبت سے

اکتا گئی ہو“

”بائیس دنوں میں راتوں کو بھی کاؤنٹ کر لیجئے“ رمان نے جتا کر کہا رجب طویل

ترین بحث کے بعد اسے ماما کی طرف چھوڑ گیا تھا۔

ماما اسے بے حد خوش دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھیں اسی طرح بہنوں کو بھی کچھ خدشات

بے چین کر رہے تھے مگر رمان کی کھنکھتی ہنسی نے انہیں ہر خدشے سے آزاد کر دیا تھا۔  
 ”ماما! سوما کہاں“ وہ اپنی خوشیوں میں اس حد تک گمن ہو چکی تھی کہ اسے ارد گرد کی کچھ خبر نہیں رہی تھی۔

”اس نے جاب کر لی ہے“ انہوں نے مختصر بتایا۔

”کہاں؟“

”کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں“ وہ اون سلائیوں کی طرف متوجہ تھیں۔

”اور وہ ماڈلنگ کا بھوت“

”شکر ہے اتر گیا ہے“

”کب تک آئے گی“

”چھ بجے تک“

”میں بسمہ سے مل آؤں“

”ہاں، کیوں نہیں وہ تو روز ہی تمہارا پوچھنے کے لیے آتی ہے نمبر مانگ رہی تھی میں

نے اسے بتایا تھا کہ تم سیل ادھر ہی چھوڑ گئی ہو“

”اب ساتھ لے کر جاؤں گی“

کرلوں گی“ وہ خود کلامی کرتے ہوئے باہر نکل آئی بسمہ اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی تھی۔

”بے وفادوست، بیا کو ایسے پیارے ہوتے ہیں“

”تو پھر کیسے پیارے ہوتے ہیں؟ اس نے شرارت سے پوچھا۔

”بکو نہیں، یہ بتاؤ رجب بھائی کیسے ہیں؟ یہ تو پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ تم کتنی

خوش ہو۔ ماشاء اللہ سے چمکتا دمکتا چہرہ سارے بھید کھول رہا ہے“ وہ اس کی آنکھوں سے پھونتی

روشنیوں کو دیکھ کر محبت سے بولی۔

”کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ مجھے میں ایسا کیا ہے جو رجب اس حد تک دیوانہ ہے میرا“

وہ حیرانی سے کہنے لگی۔

”اللہ تمہاری محبت اور خوشیوں کو سلامت رکھے۔ اللہ نظر بد سے بچائے“ بسمہ نے

خلوص دل سے دعا دی۔

پھر اچانک اسے خیال آیا تو کہنے لگی۔

”سوما سے ملاقات ہوئی ہے“

”نہیں“

”تم سوما کو دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی“ بسمہ نے ناقابل فہم لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب ہے“ رمان چونکی۔

”وہ تو بہت بدل گئی ہے۔ کہاں وہ پہلے والی چنگھاڑتی..... ضدیں کرنے والی سوما اور

اب“ بسمہ نے لہجے میں ڈھیروں تجسس سمو کر کہا تو رمان ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی۔

”مومن کی بچی! تم نے مذاق میں اڑادی ہے میری بات“ بسمہ فوراً برا مان گئی۔

”مجھے اتنے دن نہیں ہوئے ہیں اس گھر سے گئے ہوئے اور تم اتنی ناممکن سی بات

کر رہی ہو سوما کے سدھرنے کے لیے ماما نے یہ لہجے وظیفے تک پڑھے ہیں مگر اس کی طبیعت

میں ٹھہراؤ نہیں آیا اور تم کہہ رہی ہو کہ سوما بدل گئی ہے“

”تم اسے دیکھو گی تو دنگ رہ جاؤ گی“ بسمہ ابھی تک اپنی بات پر قائم تھی۔

”میں نہیں مان سکتی“ اس نے نفی میں سر ہلایا مگر اسی رات بسمہ کی ہر بات کی گویا

تصدیق ہو گئی تھی۔ رمان نے سوما کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی وہ واقعی سر تا پا بدل چکی تھی۔ اگلے

کچھ مہینوں کے بعد اس میں اور بھی بہت سی تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ وہ اکثر رمان کے گھر

آ جاتی۔ ان کی باتوں کا محور رجب کی ذات ہوتی۔ وہ رجب کے بارے میں گفتگو کرتی اور سوما

خاموشی سے پیروں سنتی رہتی۔ جہاں کہیں اس کا دھیان پٹا سوما سلسلہ کلام دہیں سے جوڑ دیتی۔

رمان کو کبھی محسوس ہی نہیں ہوا تھا۔ سوما کسی اور رنگ میں رنگی جا رہی تھی۔ رمان بتاتی

تھی رجب کو دھیما بولنے والی خواتین پسند ہیں اسے ضدی اور خود سر عورتوں سے چڑ ہے اسے لہجے

بال پسند ہیں۔

اسے گلے میں دوپٹہ ڈال کے گھومنے والی عورتیں بھی اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اسے میک

اپ سے بھی چڑھتی۔ وہ عورت کو سادگی میں دیکھنا پسند کرتا تھا اسے رمان گھر بلو جلیے میں زیادہ

اچھی لگتی تھی۔

”رجب تم سے کتنی محبت کرتا ہے“ ایک صبح رجب کے فیکٹری جانے کے بعد وہ لیٹی ہی

تھی جب سوما جلی آئی۔

”میں اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہوں کہ میرے شوہر کے دل و دماغ پر صرف

میرا ہی عکس ہے“ وہ لمبوں پر دھبی مکان سجا کر کہتی۔

”جانتی ہو سوما! ابھی صبح میں سو رہی ہوتی ہوں اور رجب اٹھ جاتے ہیں اور جب میری آنکھ کھلتی ہے تو میں رجب کو اپنا منتظر پاتی ہوں اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی ہر صبح کا آغاز اتنا ہی دلچسپ ہوتا تھا اور ہر رات کی خنک میں جذبوں کی مہک اور سرمستی کی سی کیفیت ہوتی ہے۔

وہ پوجنے کی حد تک میرے عشق میں مبتلا ہے“ اس کے لبوں پر گلاب کھلنے لگتے۔  
 ”تمہیں یاد ہے وہ ڈھلتی سلونی شام کا غریب سا پالو جس نے تمہاری کتابوں کی پے منٹ کر دی تھی۔ بس اسی شام کے قوس و قزح ہماری زندگی پر پھیلے ہیں“ وہ دکشی سے مسکراتی۔  
 اس صبح وہ رجب کے ساتھ ہی ماما کی طرف آئی تھی۔ رجب اسے چھوڑ کر فیکٹری چلا گیا تھا۔ وہ اندر آئی تو سوما کو کچن میں مصروف دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”تم کچن میں کیا کر رہی ہو؟“

”ناشتہ بنا رہی ہوں“ سوما نے سادہ انداز میں جواب دیا تو رمان ہنسنے لگی۔

”میری گناہ گار آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں“

”فضول بکواس مت کرو۔ بتاؤ تمہارے لیے بھی پراٹھا بناؤں“

”جی نہیں، ہم اپنے ”انہوں“ کے ساتھ بھگوا سا ناشتہ کر کے آرہے ہیں“ وہ شاہانہ

انداز میں بولی۔

”تم تو اتنی صبح صبح ناشتہ نہیں کرتیں“

”ہاں، مگر رجب کو فیکٹری جانا ہوتا ہے اور وہ اکیلے ناشتہ نہیں کرتے۔ مجبوراً مجھے ان کا

ساتھ دینا پڑتا تھا اب تو خیر عادت ہو گئی ہے“ رمان نے فلاسک میں سے چائے نکالتے ہوئے جواب دیا۔

”ماما اپنے کمرے میں ہیں“ وہ رمان کی خود پر جمی نظریں محسوس کر کے سرعت سے

بولی تھی۔

”تمہارے بال تو کافی لمبے ہو گئے ہیں“ رمان نے حیرانی سے کہا۔

”ہوں۔ اب لمبے بالوں کا فیشن ہے“ وہ پچھلے سے لہجے میں بولی۔ سوما جتنے بھی بال

بڑھا لیتی رمان جیسے لمبے گھنے تو نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ انفرادی سے رمان کی پشت پر لہراتی چٹیا کو دیکھتی رہ گئی۔

”ماما! یہ سوما تو اچھی خاصی گھٹڑ ہو گئی ہے“ سوما، ماما کے لیے ناشتہ لے کر آئی تو رمان نے شرارت سے اسے دیکھ کر کہا۔

”میری بیٹی تو ہے ہی بہت سلیقہ مند۔ پہلے اس میں بچپنا تھا اب سمجھدار ہو گئی ہے“ انہوں نے شفقت سے کہا تھا۔ سوما کی گزشتہ بدتمیزیاں وہ ہمیشہ کی طرح بھلا چکی تھیں۔ ویسے بھی سوما میں اتنی اچانک تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں کہ اس کے ارد گرد رہنے والے سب حیران تھے۔ لنچ ٹائم سے پہلے ہی وہ گھر جانے کے لیے بے تاب ہو گئی تھی۔

”ہوا کے گھوڑے پر سوار آتی ہو۔ شام کو چلی جانا“ ماما نے خفگی سے کہا۔

”رجب لنچ کرنے اتنی دور سے گھر آتے ہیں۔ میں یہاں ڈیرہ لگا کر بیٹھ جاؤں“ وہ چادر اٹھا کر باہر کی طرف بھاگی۔

”رکھو سوما! میں تمہیں چھوڑ آتی ہوں“ سوما کچن سے برآمد ہوئی۔ گاڑی کی چابی اٹھا کر وہ اس سے پہلے ہی چلی آئی۔

”رجب سے کہو سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید لے“

”فی الحال تو نہیں لے سکتے۔ ابھی تو شادی کی وجہ سے رجب پر کافی قرض تھا۔ حالانکہ میں نے انہیں زیورات اور بری بنانے سے منع بھی کیا تھا مگر رجب“ وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر کے منظر دیکھنے لگی۔

وہ گھر پہنچی تو آپا کا شانی داخلی دروازے میں کھڑا تھا۔

”آپ کے مجازی خدا سر کے تاج نصف بہتر تشریف لا چکے ہیں“

”اف میں نے تو ابھی ہنڈیا بھی نہیں پکائی“ وہ سوما کے ہمراہ سرعت سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

”مجھے فون کر دیا ہوتا۔ میں واپسی پر تمہیں لے آتا“ رجب نے اس کے پیچھے آتی سوما کو نہیں دیکھا تھا۔

”تم گھر میں نہیں تھیں تو ہر طرف اندھیرا تھا۔ سچ میری بینائی تو تم ہو“ وہ اس کی چادر کے پلو کو کھینچتے ہوئے لگاوٹ سے بولا۔ اسی اثناء میں رجب کی نظر سوما پر پڑی تھی۔ رمان چادر پھینک کر کچن میں گھس گئی رجب اور سوما مختصر سے لاؤنج میں بیٹھ گئے تھے۔

”کیا مصروفیت ہے تمہاری“ اس نے گفتگو بڑھانے کی غرض سے سوما سے پوچھا۔

محسوس کر رہی ہوگی، رجب نے اک آنکھ دبا کر کہا۔  
 ”فٹافٹ کھانا کھا لیجئے۔ پھر جلدی جلدی کا شور مچا دیں گے، وہ اس کی ”گستاخیوں“  
 پر بندھ باندھتی سرعت سے بولی۔  
 ”میں پندرہ دن کی چھٹی لے چکا ہوں، رجب نے اطمینان سے فروٹ سلا دکھاتے  
 ہوئے بتایا۔

”کیوں؟“

”ہم ہنی مون پر جائیں گے“

”کہاں“

”چاند کے اس پار“ وہ مزے سے بولا۔

”کوئی ضرورت نہیں فضول خرچی کی“ رمان نے صاف منع کر دیا۔

”مگر کیوں؟“

”پہلے ہی اتنا قرض لے رکھا ہے۔ اس عیاشی کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ سڑکوں پر  
 مارے مارے پھرنے اور پہاڑوں درختوں کو دیکھنے سے بہتر ہے ہم گھر میں اطمینان سے رہیں“  
 وہ سنجیدگی سے کہنے لگی۔

”ابھی انہیں سنبھال کر رکھیے۔ شاید آگے ہمیں زیادہ روپوں کی ضرورت ہو۔ انشاء اللہ  
 حالات کچھ بہتر ہوئے تو ضرورتی مون منانے جائیں گے“ وہ رجب کے ہاتھ پر اپنا نرم ہاتھ رکھ  
 کر نرمی سے بولی۔

”ہوں۔ ضرور جائیں گے مگر تین، چار بچوں کو ساتھ لے کر“ وہ جل کر بولا تھا۔ رمان  
 بے اختیار ہنسنے لگی۔

☆☆☆

”برتن میں ٹیبل پر لگا لوں گی۔ بس تم جلدی سے اوپر جاؤ اور تیار شیار ہو کر رجب کے ہمراہ  
 نیچے آنا“ شہوانہ آپا نے زبردستی اسے بھیجا۔ وہ ان کی مدد کے خیال سے دو پہر کو ہی نیچے آگئی تھی۔  
 باتوں کے دوران وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس وقت شام کے سائے بڑھ چکے تھے۔  
 اس نے کمرے میں قدم رکھا تو نیم اندھیرے کی وجہ سے کچھ بھائی نہیں دیکھا، سوکچ  
 بورڈ پر ہاتھ مار کر اس نے ایک ساتھ کئی لائٹس آن کر دیں۔

”جواب اور گھر کے علاوہ تیسری مصروفیت فی الحال نہیں ہے“ کس قدر مشکل تھا اس  
 شخص سے گفتگو کرنا۔ جو رگ جاں سے بھی قریب تھا مگر کتنے فاصلے موجود تھے۔  
 ”آپ مون کو جواب کی پرمیشن کیوں نہیں دیتے“  
 ”اس لیے کہ یہ گھر میں میرا انتظار کرتی زیادہ اچھی لگتی ہے“ وہ کچن میں مصروف رمان  
 کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”مون کی کون سی خوبی نے آپ کو متاثر کیا تھا“

”اس میں اتنی خوبیاں ہیں کہ کسی ایک کا ذکر کیا کرنا“ رجب، رمان کے ہاتھ سے

کولڈ ڈرنکس کے گلاس پکڑتے ہوئے کہنے لگا۔

”کسی چیز کی ضرورت ہے تو بازار سے لا دوں“

”نہیں، میں چکن بنا چکی ہوں۔ بس پھلکے اتاروں گی آپ میز پر برتن لگا دیں“

”کوئی اور حکم“

”پانی کا جگ بھی رکھیے گا“

”کچھ اور“

”فروٹ سلا د بنانا ہے۔ آپ ایسا کریں فروٹ کاٹ دیں“ بالوں کو جوڑا کیے سادہ  
 سے چلبے میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ سوما سے مزید اس محبت بھرے ماحول میں بیٹھا رہنا  
 دشوار ہو گیا۔

”مون! آپا کی طرف دعوت ہے۔ رات کو ذرا جلدی تیار ہو کر نیچے چلی جانا“

”ہوں“ رجب نے فروٹ کاٹ کر جوں ہی لاؤنج میں قدم رکھا سامنے خالی صوفہ

دیکھ کر حیران ہی رہ گیا۔

”مون یار! تمہاری کزن کہاں غائب ہو گئی ہے“

”کیا چلی گئی ہے سوما!“ وہ خود حیران تھی۔

”کچھ سر پھری سی معلوم ہوتی ہے“ رجب نے شرارت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کمال ہے کھانا کھائے بغیر چلی گئی۔ میں اسی کے لیے تو اتنا تیز تیز ہاتھ چلا رہی تھی“

مون جی بھر کے بد مزہ ہوئی۔

”سمجھدار تھی سو چلی گئی ہے۔ نئے نویلے میاں بیوی کے درمیان وہ خود کو مس فٹ

”رحب! رمان نے اس کا کندھا ہلایا۔

”اٹھ جائیے سات بجنے والے ہیں۔ آپا کی طرف نہیں جانا۔“

”ہوں“ رجب نے کسمسا کر روٹ بدلی۔

”اٹھ جائیے نا“ اب وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی تھی۔ رجب نے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر اپنے لبوں سے لگالیا۔

”باد صبا ہو یا خوشبو کا جھونکا“ وہ بھاری آواز میں بولا۔

”ام رمان ہوں“

”ام رمان ہو یا میری جان ہو۔ جتنا قریب آتی ہو، اور طلب بڑھتی ہے“ رجب کی آواز میں جذبوں کا خمار تھا۔

”زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں“ رمان نے اس کی پیش قدمی کو روکنا چاہا۔

”یہ آتش عشق ہے۔ وصل کی گھڑیوں میں اور بھڑکتی ہے۔ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے ہجر کے دوزخ میں جلنے سے بچایا ہے“ اس کی مٹھی سرگوشیاں رمان کی روح سرشار کر رہی تھیں۔

”رحب! آپا اور بچے انتظار کر رہے ہیں“

”ہوں“ اک گہری سانس کھینچتا وہ بستر چھوڑ گیا تھا۔

”میں نہالوں تب تک تم تیار ہو جاؤ“

”میں نے آپ کے کپڑے ہاتھ روم میں لٹکا دیئے ہیں“

”آپ کی دن والی اور“ رات“ والی عنایتوں اور خدمتوں کا شکر یہ“ وہ آنکھ کا کونا دبا کر ہاتھ روم میں گھس گیا تھا۔ رمان خفت سے سرخ پڑ گئی۔

”وہ جھٹ پٹ تیار ہو گئی تھی۔ رجب کو میک اپ پسند نہیں تھا سو اس نے نیچرل ہی لپ اسٹک لگا کر بال کھلے چھوڑ دیئے تھے۔

”رحب نہا چکا تھا اب گنگنا تے ہوئے بالوں کو تو لیے سے اچھی طرح رگڑ رہا تھا۔

”ہیر ڈرائیو سے خشک کر دوں؟“

”نہیں، جانم! تم بس آنکھوں کے سامنے بیٹھی رہو“ اس نے خوب اچھی طرح پرفیوم اسپرے کر کے بوتل اس کی طرف اچھالی۔

”یہ فارمین ہے میں اس کا کیا کرو“ وہ حیرانی سے بولی۔

”ذرا کھڑے ہونے کی زحمت گوارا کیجئے“

”کیا مطلب؟“ وہ پرفیوم کی بوتل اٹھا کر اس کے قریب چلی آئی۔ رجب نے پرفیوم

اس کے ہاتھ سے پکڑ کر ڈھیر سا اس پر چھڑک دیا تھا۔

”رحب! بس بھی کریں“ اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔

”میں چاہتا ہوں۔ میرے عشق کی خوشبو تمہارے روم روم میں بس جائے“ وہ اس

کے چہرے پر جھک گیا۔ رمان نے دونوں ہاتھوں سے اسے پرے دھکیلا۔

”پہلے بھی“ وہ اسے ہاتھ سے کھینچ کر باہر لے آئی۔

دونوں جب نیچے آئے تو شانی، نومی اور ٹامی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔

رمان نے تینوں کو کٹ کیٹ کے سرخ رپر میں لپٹے پیکٹ پکڑائے۔

چاکلیٹ کیک آپا کو تھمایا۔

”تھینک یو بھابھی!“ تینوں بیک زبان بولے۔ شانی میٹرک میں جبکہ نومی اور ٹامی

نالکھ کے اسٹوڈنٹ تھے۔

”مجھے تھینک یو بولتے زبان گھتی ہے۔ یہ کٹ کیٹ کے پیکٹ لے کر تو میں ہی آیا

ہوں“ رجب نے مصنوعی خشکی سے کہا۔

”جلنے کی بو آرہی ہے“ رمان نے ہنسی دہائی۔

”کہاں سے؟“ نومی نے پوچھا۔

”پڑوسیوں کا“ دل“ جل رہا ہے“ رمان مزے سے بولی۔ رجب اسے آنکھیں

دکھانے لگا تھا۔

”مون سون! یہ زیادتی ہے“ رجب نے دہائی دی۔

”آپا! آپ کا“ ہیرڈ“ تنگ کر رہا ہے“ رمان رو ہانسی ہو کر منائی۔

”فکر کیوں کرتی ہیں بھابھی جان! ہم ہیں نا آپ کے شیر جوان دیور“ شانی سینہ

ٹھوک کر میدان میں اتر آیا۔

”شیر جوان کی پہلے“ ہاڈی“ ملاحظہ کیجیے۔ ہڈیوں کا انجر، پنجر“ ٹامی نے ہنسی اڑھائی۔

”تو گوشت پوست کے پہاڑ اپنی زبان بندھ ہی رکھو“ شانی جل کر بولا۔

”تم لوگ پھر سے چونچیں لڑانے لگے ہو۔ چلو پہلے کھانا کھاؤ“ آپا نے بچوں کو ڈپٹ

رمان کے بتانے پر رجب نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔

”بجھدار، ذمہ دار بیوی قدرت کی طرف سے تحفہ ہوتی ہے“

”میرا شعر بھی تو سنئے“ ٹامی گفتگو کے رخ کو بدلتا دیکھ کر ناراضی سے منہ پھلا کر بولا تو

حاضرین محفل ایک مرتبہ پھر ٹامی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

تیری محبت تیری وفا کافی ہے

تمام عمر یہ احساس کافی ہے

میری دعوت کرو تو تکلف نہ کرنا

میرے لیے پڑا، تک اور کریمہ ہی کافی ہے

”وہ موٹے! کیا شعر سنایا ہے۔ اتنا کچھ ٹھونس کر بھی ”کھانے“ کی طرف دھیان

ہے۔ کیوں کھا کھا کر پھٹنے کا ارادہ ہے بدذوقی کی کوئی حد ہے۔ اتنے اچھے شعر کا بیڑا غرق کر دیا

ہے“ رجب نے اسے بری طرح لتاڑ دیا۔ موٹا قل قل ہنس رہا تھا۔

”کچھ اور سناؤ ٹامی!“ رمان نے فرمائش کی۔

نہ چاند ہوں گے نہ تارے ہوں گے

کیا ہم ہمیشہ کنوارے رہیں گے

اس دنیا میں رجب بھائی سمیت کتنوں کے نکاح ہو گئے ہیں۔

کیا ہمارے نصیب میں نکاح کے چھوڑے ہوں گے؟“

ٹامی نان اسٹاپ شروع ہو چکا تھا اور رمان کا ہنس ہنس کر آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

”خوب بہت خوب۔ ٹامی کا دیوان چھپے گا ان شاء اللہ“ اب کے رجب نے بھنا کر

کشن دے مارا تھا اسے۔

”مائی گاڈ! کتنے مسخرے ہو تم ٹامی!“ رمان نے اس کے پھولے پھولے سرخ گال کو

تھپتھا کر کہا۔ رجب بھی ہنس پڑا تھا۔ باہر تیز طوفانی بارش شروع ہو چکی تھی۔ انہوں نے اندرونی

سیڑھیوں سے اوپر جانا تھا جانے سے پہلے آپا۔ نے دو عدد دیدہ زیب سوٹ رمان کو دیئے۔ رجب

کے لیے بہت خوبصورت سوٹر تھا۔

”آپا! اس کی کیا ضرورت ہے“

”تم میری بھابھی بھی ہو اور بیٹی بھی۔ مجھے رجب اپنے بیٹوں سے بڑھ کر عزیز ہے“

کرکاک کی طرف دیکھا۔ لاسٹ جانے کے خدشے کے پیش نظر انہوں نے جلدی کھانا لگا دیا تھا۔

”آپا! میرے جانے کے بعد آپ نے کیا کچھ مزید بنالیا ہے“ رمان نے اک طائرانہ

نگاہ میز پر ڈالی تو شانی کی رگ شرارت پھر سے پھڑک اٹھی۔

”آپ کے طفیل ہماری بھی موجیں ہو گئی ہیں بھابھی! اور نہ روزانہ ہی کدو، بیگن اور

توری کا سالن کھا کر پیٹ میں اٹھن ہو گئی تھی“

”بھابھی! ایک شعر سناؤ“ ڈنر کے بعد وہ سب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ آپا چائے

بنانے کچن میں گئیں تو ٹامی کی شاعرانہ روح مچل اٹھی۔ شانی اور رجب کارپٹ پر نیم دراز تھے۔

نومی اور وہ کاؤچ پر بیٹھے تھے جبکہ ٹامی صوفے پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ شعر کیا یاد آیا وہ ایک دم اچھل

کر سیدھا ہو گیا۔

”ارشاد۔ ارشاد۔“ نومی نے سر دھن کر کہا۔

”تیری محبت تیری وفا کافی ہے“ وہ شروع ہو چکا تھا۔

”تمام عمر یہ احساس کافی ہے“ ٹامی نے لہک لہک کر کہا۔

”واہ بھئی، کیا شعر ہے۔ کس قدر خوبصورت لفظوں کا چناؤ کیا ہے“ شانی اور رجب

خوب خوب متاثر ہوئے جبکہ رمان بھی دلچسپی لے رہی تھی۔

”ٹامی! تم میں ایک بہترین شاعر بننے کے جراثیم موجود ہیں۔ کیا زبردست شعر سنایا

ہے تیری محبت تیری وفا کافی ہے۔ تمام عمر یہ احساس کافی ہے۔ حساس دلوں کے لیے اور میرے

جیسے ”عاشقوں“ کے لیے یہ شعر ایک تحفہ ہے“ رجب نے خوب تعریفوں کے ڈونگرے برسائے

تھے۔ ٹامی کا سینہ تغر سے پھول گیا۔

”موٹے! امت اتنا اترا، پھٹ جائے گا“ نومی نے جل کر کہا۔ رجب کا تعریفی انداز

اسے مبغض نہیں ہوا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ رجب نے پانچ سو روپے انعام کے طور پر تو ٹامی کو ضرور

دینے ہیں۔

”رجب! پورا شعر تو سننے دیجئے“ رمان نے مزا کر کہا ہونے کے خدشے کے تحت۔ اسی پل

ایک دم ہی آندھی و طوفان کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ آپا نے تیزی سے کھڑکیاں دروازے بند کئے۔

”کوئی کھڑکی وغیرہ تو نہیں کھلی؟“ رجب نے اٹھے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، میں نے آتے ہوئے تمام دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کر دی تھیں“



رمان ان کے خلوص سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔

”ابھی وہ کپڑے چھینچ کرنے کا سوچ ہی رہی تھی جب دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ بیرونی سڑیوں والا ان کا داخلی دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ رجب نے حیرانی سے کلاک کی طرف دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر اس طوفانی بارش میں سر سے پیر تک بھیگی ہوئی سوما کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی۔ وہ رومان کی طرف دیوانہ وار بڑھی۔

☆☆☆

”میرے عاشق کو مجھ سے چھین کر اب سپنوں کے تاج محل بجائے بیٹھی ہو۔ پہلے عاشق کے دل کے ساتھ کھیل کر اسے ٹھکرایا اور اب اس شریف آدمی کی زندگی میں زہر گھولنے والی ہو۔ یہ تمہاری نیک، شریف بیوی ایک فاحشہ عورت ہے۔ یہ بد کردار ہے۔ یہ حسین عورت طوائف ہے“ سوما ایک جنون کے عالم میں اس قدر یقین سے کہہ رہی تھی کہ رومان کی سانسیں تھمتھکیں گیں۔

”تم پاگل ہو چکی ہو سوما! کیا بکواس کر رہی ہو۔ کیا تمہارا ذہنی توازن ٹھیک ہے“ رومان غصے کے عالم میں پھٹ پڑی۔

”شرم، حیاباتی ہے تم میں بد بخت“ وہ غصے سے پھنکاری۔

”رجب! سوچو، اس نے اتنے امیر ترین آدمی کو کیوں ٹھکرایا ہے۔ یہ اس کے ساتھ راتیں گزارتی رہی ہے“

”شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ۔ اپنا منہ بند رکھو سوما! اس قدر انسانیت کے معیار سے کیوں گر رہی ہو۔ مجھے بتاؤ، میں نے کیا نقصان کیا ہے تمہارا جو میری پینتیس دنوں پر مشتمل شادی شدہ زندگی تباہ کر دینا چاہتی ہو“ وہ ٹوٹ کر بکھر گئی تھی اور رجب گویا پتھر کا بت بنا ایک نلک رومان کو دیکھے جا رہا تھا۔ نجانے اس کی آنکھوں میں کون سا رنگ گہرا تھا۔ محبت کا، نفرت کا، ترس یا کراہیت کا۔

”رجب! آپ خاموش کیوں ہے۔ اس کا منہ کیوں نہیں توڑ دیتے“ وہ تڑپتے ہوئے رجب کے قریب آئی تھی۔

”یہ دیکھو، رجب سلطان تمہاری فاحشہ بیوی کے کارنامے“ اس نے سات آٹھ تصویریں رجب کی طرف اچھالی تھیں جن پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد کسی شریف عورت کی شاید موت واقع ہو جاتی اور مر تو وہ اس لمحے گئی تھی جب رجب کی آنکھوں میں بے اعتباری کے سائے بڑھنے لگے تھے۔

”اور میرے پاس جیتا جاگتا ٹھوس ثبوت بھی موجود ہے“ سوما کی نظر برف کی طرح سرد ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت عورت نہیں ایک پھری ہوئی حسد کی ماری خونخوار زہریلی ناگن لگ رہی تھی جس نے ام رومان کو عین جو بن پر ڈسا تھا۔ وہ لمحوں میں خزاں رسیدہ درخت کی مانند ہو گئی تھی۔ اس کا شباب تانہ پڑ گیا۔

اس کے حس کو کالی شام نے گھیر لیا۔

اسے رجب سلطان کی ایک چپ نے مار ڈالا۔

اسے رجب سلطان کے لبوں کے ”قفل“ نے لحد میں اتار دیا۔ بے اعتباری کے

بھالے اس کا نازک سادل چھلنی کر گئے۔

رجب سلطان کی آنکھوں میں اترے آنسو دیکھ ہی نہ سکی اور وہ بھر بھری ریت کی مانند بکھر گئی جب سوما پھنکار رہی تھی۔ وہ تب بھی رو رہا تھا جب رومان منتیں کر رہی تھی اس کی پتھر آنکھوں سے اس وقت بھی لہو نیک رہا تھا اور جب شہوانہ آپا دل تھا مے دلہیز پر ساکت بیٹھی ام رومان کو دیکھ رہی تھیں تب بھی اس کی آنکھوں میں آنسو کچھل رہے تھے اور جب عاشق نقوی اس پر تہمت لگا رہا تھا۔ بہتان باندھ رہا تھا تب رجب سلطان پھٹ پڑا۔

”اپنا غلیظ، ناپاک وجود لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ“ وہ عاشق کو دھکے دے کر چلایا۔

عاشق اور سوما پورا منصوبہ بنا کر آئے تھے اس وقت دونوں کے ذہنوں پر شیطانیت سوار تھی۔

رجب! رومان کو دیکھو۔ شاید بے ہوش ہو گئی ہے“ آپا نے چیخ کر کہا۔

”آپا! میرا دل پھٹ جائے گا۔ میرے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی۔ آپا! یہ

سب جھوٹ ہے۔ بکواس ہے۔ میری رومان ایسی نہیں۔ آپا ان سب سے کہو، رومان کو گالی مت دیں“ وہ ان کے قدموں میں بیٹھا رو دیا تھا۔

”رجب! رومان کو دیکھو“ وہ ٹوٹے، شکست قدموں سے اٹھا اور رومان کو جھنجھوڑنے لگا۔

”رمان اٹھو، آنکھیں کھولو۔ اپنے اوپر کچھڑا اچھالنے والوں کا منہ توڑ دو۔ آپا! دیکھیں

مومن بول نہیں رہی“

”رجب! یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔ دیر مت کرو“

آپا کچن سے پانی لینے کے لیے جلدی سے اٹھ گئیں۔

”آپا میں نیکی لے کر آتا ہوں“

گئے تھے اس انکشاف نے اسے دہلا دیا۔

”اور خدا اپنے پسندیدہ بندوں کے دلوں میں ”رحم“ ڈالتا ہے اور نرم دل والوں کی آنکھیں بہتی ہیں“ کوئی اس کے کان کے قریب بہت زور سے چلایا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر کی طرف بھاگنے لگی۔ وہ بد بخت لوگوں میں سے تھی۔ ایسے لوگ جن کے دلوں سے خدا ”رحم“ کو نوج لیتا ہے۔

☆☆☆

ملک کا کامیاب ترین سرجن اسامہ رضوی ہسپتال کے کوریڈور میں کھڑا رجب سلطان کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

”اس عمر میں کسی کو ہارٹ اٹیک ہوتا ہے“ رمان کی ماں بڑی حسرت بھری نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کاش یہ کہہ دے رمان زندہ ہے۔ حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ام رمان کی موت واقع ہو گئی۔

آہستہ آہستہ، دھیرے دھیر اس ”غم“ پر بھی وقت نے گرد ڈال دی۔ اسامہ کی شادی سادگی سے بسمہ کے ساتھ ہو گئی۔ بہنیں بھی اپنے بچوں اور گھروں میں مصروف ہوتی چلی گئیں۔ رمان کی ماں بھی اللہ کی رضا مان کر صبر کی بھاری سلیں دل پر رکھے اسامہ کے بیٹے کی ققار یوں میں خود کو بہلانے لگیں۔

جسے زندگی کی رنگینیاں اور بہلاوے اپنی طرف متوجہ نہیں کرتے تھے وہ رجب سلطان تھا۔ جس طوفانی رات میں سومانے رمان کے بے داغ کردار کو رگیدا۔ اس رات رجب کی چند لمحوں پر محیط خاموشی محض ”شاک“ کی وجہ سے رمان کے اندر سناٹے اتار گئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی رجب اس سے بدگمان ہو رہا ہے۔ بے اعتباری کے پہلے گھاؤ نے رمان کے دل کو لرزادیا تھا حالانکہ وہ صرف ”شاک“ کی کیفیت میں کھڑا تھا۔

وہ سوما سرفراز کے بارے میں اتنا جانتا تھا کہ شاید وہ خود بھی اپنے متعلق کچھ نہیں جانتی ہوگی اسے یہ سب بتانے والی رمان تھی۔ جس کی باتوں میں اکثر سوما کا ذکر آ جاتا وہ اس کی خالہ زاد بہن تھی۔ اس کی پرورش رمان کی والدہ نے کی تھی سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ سوما کے والدین حیات نہیں تھے اور وہ ان کی کی اتنی محبتوں کو پا کر بھی محسوس کرتی تھی رجب کو سوما سے بہت ہمدردی محسوس ہوتی تھی شاید اس لیے بھی کہ اس کا اور سوما کا درد مشترک تھا اس نے بھی چھوٹی عمر میں والدین کو کھودیا تھا۔

”فاروقی صاحب سے کہو۔ ایمر جنسی ہے، گاڑی نکالیں“ انہوں نے اپنے پڑوسی کا نام لیا۔ وہ رمان کے چہرے کو ہاتھوں سے تھپتھا رہی تھیں۔

”رجب“ اس کے خشک لبوں سے صدا بھری۔ وہ دروازے تک گیا تھا۔ رمان کی التجا پر بے قراری سے پلٹ آیا۔ شہوانہ خود فاروقی صاحب کے گھر جانے کے لیے دوڑیں۔

”رجب۔ یہ۔ جھوٹ“

”میں جانتا ہوں۔ تم پریشان نہ ہو“ رجب نے اس کی نم پسینے سے نیچے پیشانی کو چوما رمان کا سر اس کے زانوں پر تھا۔ وہ اس کی معدوم ہوتی دھڑکنوں کو سن رہا تھا رجب کے پہلو میں موجود دل پھڑ پھڑانے لگا۔ اک عجیب سے خوف نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا رمان کی رنگت نیلی ہو رہی تھی اس کی پکلیں بند ہو رہی تھیں۔ رجب نے وحشت کے عالم میں رمان کو جھنجھوڑا۔

”مون! آنکھیں کھولو۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا“

”رجب! تمہیں۔ یقین ہے میں۔ سچ۔ بول“

”مجھے یقین ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں“ تم جی ہو۔ میں قسم کھاتا ہوں تم سیپ میں بند موتی کی طرح ہو۔ میں قسم کھاتا ہوں تم بہت مقدس ہو، بہت پاکیزہ ہو۔ تم میرا ”دل“ ہو رمان! میں نے تم سے عشق کیا ہے تمہاری پاکیزگی سے عشق کیا ہے۔ ستمبر کی وہ سلونی شام میری دیوانگی کی گواہ ہے۔ تم اس غریب اپالو کی زندگی کا حاصل ہو ام رمان! تم وہ چاند ہو جس نے تیسرے پہر میں جھلک دکھا کر میری زندگی کو روشن کر دیا تھا۔ پھر امادس کی رات نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا“ اس کے آنسو رمان کا چہرہ بھگور رہے تھے۔ اس نے بہت مطمئن بہت پرسکون ہو کر دھیرے سے پکلیں موند لیں۔ وہ گویا رجب کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ کی ہی منتظر تھی۔ رجب کی گواہی نے اسے اندر تک سرشار کر دیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تھم گئی تھی رک گئی تھی آنکھوں کے چراغ بجھ گئے تھے۔ رجب کا دل وحشت سے پھٹنے لگا۔

”رجب! گاڑی آگئی ہے۔ دیر مت کرو“

دوسرے ہی لمحے وہ رمان کو بانہوں میں اٹھا کر دیوانہ وار باہر کی طرف دوڑا۔ اسی چھوٹے سے دو کمرے کے گھر کے ایک کونے میں وحشت زدہ سی، ڈری سہی سوما سرفراز پھٹی پھٹی آنکھوں سے رجب کو جاتا دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں گرا تھا اس کی آنکھیں بندر ہو گئی تھیں وہ رونا چاہتی تھی، چلانا چاہتی تھی مگر اس کی آنکھوں سے آنسو ہمیشہ کے لیے خشک ہو

عام سے نقوش والی سوما سرفراز میں رضوی ہاؤس والوں کی جان بند تھی اسے شہزادیوں کی طرح پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ وہ سب اسی کوششوں میں رہتے تھے کہ کہیں سوما کو کسی بات پر تکلیف نہ پہنچے۔

وہ سوما کے منہ سے نکلنے والے زہریلے لفظوں کو سن کر حیران تھا کیا یہی سوما سرفراز تھی جسے اتنی محبتوں سے نوازا گیا تھا؟ کیا سامنے کھڑی جنونی سی یہ لڑکی اتنی چاہتوں اور توجہ کے قابل تھی؟ اس آستین کے سانپ کو رمان کی ماں نے آنکھوں کا تارہ بنا رکھا تھا سوما کیوں اتنی بدگمان تھی؟ سوما کیوں رمان کے کردار پر کچڑا اچھال رہی تھی۔

آخر کیا ”وجہ“ تھی کہ سوما رمان کو ذلتوں کے گڑھے میں اتار دینا چاہتی تھی؟ رمان نے اسے کون سا نقصان پہنچایا تھا جو وہ انسانیت کے معیار سے گر کر بونی دکھائی دینے لگی تھی؟

عاشق نقوی کون تھا؟

اتنے سارے سواہد نشانوں نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا اور پھر جب اس کی نظر رمان کے زرد چہرے پر پڑی تو وہ یکدم ٹھنک گیا۔ وہ زمین پر گر چکی تھی اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ رمان کی سانسیں رک رک کر چل رہی ہیں اس کی رنگت پہلے زرد پھر سفید اور پھر نیلی پڑ گئی۔ رمان کے ساتھ پینتیس دنوں میں وہ پینتیس سالوں کا سفر طے کر چکا تھا۔ اس کے اندر سے جینے کی امنگ ختم ہو گئی تھی۔ ام رمان نے اس کی بانہوں میں دم توڑ دیا تھا۔

ڈاکٹر زکی تشخیص کے مطابق وہ بہت کمزور دل رکھتی تھی۔ اس کے دل کے ایک کونے میں سوراخ تھا اور کسی انتہائی صدمے کے زیر اثر اس کا دل کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔

یہ عین خدائی امر تھا کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی ایک سانس تک چھیننے پر قادر نہیں۔ رمان کی موت اسی طرح اول روز سے ہی لکھی جا چکی تھی سوما نے اتنا ہی جینا تھا مگر اس کی تمام ترمذ داری سوما کے سر آتی تھی۔

رمان کو سوما کے لفظوں کے کوڑوں نے قتل کیا تھا اور رجب سلطان نے زندگی کی آخری سانس تک اسے معاف نہ کرنے کا خود سے عہد کیا۔ اس عہد کو وہ ابھی تک نبھا رہا تھا رمان کے ”غم“ نے کئی سالوں تک اسے خود سے غافل رکھا۔ پھر آپا کے مجبور کرنے پر اس نے مقابلے کا امتحان دیا۔ کامیابیوں نے راہ دیکھ لی سو وہ آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔

سوما کے مجبور کرنے پر ماما نے رجب سے شادی کی بات کی تھی خلاف توقع وہ خاموشی سے مان گیا تھا رمان کی موت کے پانچ سال بعد اس نے کسی عورت سے کاغذی تعلق قائم کیا تھا یہ تعلق اس کے انتقام کی ایک کڑی تھی۔ اور سوما جو سمجھتی تھی کہ اپنے عشق، صبر اور فرما نبرداری سے رجب کے دل کو جیت لے گی۔ مگر وہ اس کے دل کے شہر کے ہر دروازے پر سرنگراں کر کر تھک گئی تھی ٹوٹ گئی تھی، ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔

اس نے سوما کو ایک سونے کا بنجرہ خرید کر دیا اور پھر اس میں آزاد چھوڑ دیا۔ ان پندرہ سالوں میں آج تک رجب سلطان نے سوما سرفراز سے کلام نہیں کیا تھا۔ اس گھر کے نوکر گواہ تھے۔

رجب کا دل آج بھی اجاڑ، ویران صحرا کی مانند تھا بس رمان کی یادوں کا چراغاں تھا جو آتی جاتی سانسوں کی ضمانت بنا جینے پر اکساتا تھا۔

وہ اپنی زندگی میں آنے والی اس پہلی عورت کو کبھی بھلا ہی نہیں سکا تھا جس نے بارہ ہزار ماہوار تنخواہ لینے والے غریب سے اپالو سے شادی کی تھی۔ جس کا مکان بھی کرائے پر تھا اور وہ پھر بھی اپنی جنت میں خوش تھی۔ مطمئن تھی جسے اچھے دنوں کا انتظار تھا۔

اس نے پینتیس دنوں میں پینتیس سال کے سفر کو طے کر لیا تھا۔ پھر اس کے دل میں جذباتوں کی چنگاری کہاں پھونتی۔

وہ رمان کے ساتھ پینتیس سال گزار چکا تھا ان پینتیس سالوں کی رفاقت کے بعد کسی اور عورت کی طلب اس کے دل میں کہیں بھی نہیں تھی۔

مگر وہ آج بھی اس حقیقت سے نادانف تھا کہ سوما سرفراز نے اس کی رمان پر کیوں گندگی اور کچڑا اچھالا تھا؟ کیوں رمان کے کردار کو داغدار کیا؟ اس نے کیوں ناگن کی طرح رمان کو ڈسا؟ سوما سرفراز کیوں زہر زہر ہو رہی تھی؟ آخر سوما کی رمان کی ساتھ کس نوعیت کی دشمنی تھی جبکہ رمان تو اس کی محبتوں کا دم بھرتی تھی؟

اگر سوما ضمیر کے کوڑوں سے ادھ موٹی ہو کر اسے سچائی بتا دیتی۔ اگر وہ رجب کو بتا دیتی کہ اس طوفانی رات رمان کو اذیتوں سے دوچار کرنے کا آخر مقصد کیا تھا؟ تو رجب اسے فوراً زندگی کے اس بوجھ اور قید سے آزاد کر دیتا مگر وہ ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی وہ نشانِ عبرت بن کر اور جینا چاہتی تھی۔

اس رات پوری بساط ایک دم الٹ گئی تھی۔ وہ رجب کو رمان سے بدگمان کرنے کی پوری پلاننگ بنا کر آئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ رجب کھڑے کھڑے رمان کو طلاق دے دے گا مگر تمام بازی الٹ گئی۔ اس کا منصوبہ بری طرح ناکام ہو گیا۔

ام رمان کی موت اس کی سچائی کو ثابت کر گئی۔

اس کا دل اس ذلت کو سہا نہیں سکا تھا اور وہ مر گئی۔

ام رمان مر گئی تو رجب سلطان کا دل بھی مر گیا۔

اور اسی بھیانک، کالی خوفناک رات میں سوما سرفراز کے اندر سے یکدم جینے کی، زندہ رہنے کی امنگ ختم ہو گئی۔ وہ چلتی پھرتی ایک لاش بن چکی تھی جس کے اندر صرف سانس باقی تھا اور جس کا پورا وجود مردہ ہو چکا تھا۔

وہ رجب سلطان کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس سے ام رمان سے بھی زیادہ محبت کرتی ہے۔ مگر اس رات کے بعد اس کی زبان میں لکنت آ گئی۔ وہ پوری بات کہہ نہیں سکتی تھی۔ کبھی کبھی اسے اپنا جسم کوڑھ کی مانند محسوس ہونے لگتا تھا۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا تھا کہ اس کے پورے وجود پر کیڑے ریگ رہے ہیں۔

اسے رجب کی غمخیز زندگی پچھتاؤں کی آگ میں دھکیل دیتی۔

اسے ماما کی آنکھوں میں اترتی وحشت خود سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیتی اور اسامہ برف جیسی سرد نگاہ سے اسے یوں دیکھتا گویا کہنا چاہتا ہو۔

”بچپن سے ہر شے چھینتی آئی ہو میری رمان سے۔ آخر ”زندگی“ بھی چھین لی ہے تم نے اس سے“

اور رضوی ہاؤس کا وہ بوڑھا مالی جو روزانہ رمان کی تربت پر پانی چھڑکنے اور پھول ڈالنے جاتا ہے اور پھر پہروں وہیں بیٹھانہ جانے کیا کیا سوچتا ہے شاید مومن کے بچپن کو اس کی جوانی کو اور اس کی ناگہانی موت کو۔

اور اگر وہ رجب سلطان کو بتادے کہ سوما سرفراز کے عشق اور جنون نے ام رمان کی جان لے لی ہے اور اگر وہ رجب کو بتادے کہ اس کی محبت نے سوما کو فنا کر دیا ہے تو کیا وہ باقی ماندہ جیون سوما سرفراز کی خاطر تیاگ دے گا؟

شاید نہیں، کبھی نہیں۔ وہ سوما سرفراز ہے، ام رمان نہیں۔

”اب بتاؤ عانیہ عدیل! مجھ سے کتنی نفرت کرنے لگی ہو؟“ سوما کے سانولے بے رنگ چہرے پر وحشتوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ میں نے اک تھکی تھکی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور پھر خاموشی سے اٹھ کر واپس چلی آئی۔ میں اس سے کہنا چاہی تھی کہ ”تم سے نفرت کا رشتہ قائم کرنا بھی گناہ ہے کہ نفرت ہو یا محبت، انسانوں سے کی جاتی ہے۔ تم عورت ذات کی تو ہیں ہو۔ تم انسانیت کی تو ہیں ہو“ مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ رجب سلطان کے ”دکھ“ اور ام رمان کی موت نے میری آنکھیں بھگو ڈالی تھیں۔ پوری رات میرا تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔

☆☆☆

صبح میرا وجود بخار میں جل رہا تھا۔ عدیل نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

”عانیہ! اٹھ بھی جاؤ۔ میں ذرا برابر والے گھر جا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے رجب کی بیوی کی ڈتھ ہو گئی ہے“ عدیل تیز تیز بولتا باہر نکل رہا تھا۔ میں گویا اسپرنگ کی طرح اچھل پڑی۔

”عدیل! رکیتے تو۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں“ میں تقریباً دوڑتے ہوئے عدیل کے پیچھے آئی۔

”تمہیں بخار ہے۔ پہلے چائے پی کر میڈیسن لو پھر آ جانا“ میں عدیل کی اس توجہ پر بے ہوش ہو کر گرنے والی تھی۔

”اگر، مگر کچھ نہیں۔ اپنی حالت دیکھو، پہلے ہی تمہارا پی پی نارل نہیں رہتا“ عدیل باہر نکل گئے تھے جبکہ میں ابھی تک حیران سی وہ، کھڑی رہ گئی۔

چائے کے ساتھ ایک رس لے کر دووا کھانے کے بعد میں جلدی سے برابر والے گھر پہنچ گئی تھی۔ لاؤنج میں سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں میں دھڑکتے دل کیساتھ وہیں پہنچ گئی۔ سامنے سفید چادر کے نیچے سوما کا ساکت وجود پڑا تھا۔ اس کے سر ہانے رمان کی والدہ بیٹھی تھیں۔ ساتھ شاید رمان کی بہنیں بھی تھیں۔ رمان کی والدہ رو رہی تھیں۔ انہیں شاید رمان کی موت کا ایک ایک منظر یاد آرہا تھا۔

”شانی! تم ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلوادو“ اس نے شانی کو آہستگی سے ہدایات دیں۔ وہ چلا گیا تو رجب اپنے قریب کھڑی اس ادھیڑ عمر عورت سے مخاطب ہوا۔

”شہوانہ آ! میں تو اس عورت کی نماز جنازہ پڑھنے کا حوصلہ بھی خود میں نہیں پاتا۔ اس

عورت کے زہر نے میرے وجود کو زخم زخم کر دیا ہے“ میں نے دیکھا، رجب کو آنکھوں میں آنسو تھے میرا دل غم کے احساس سے بوجھل ہو گیا رجب کے دل میں آج بھی اپنی محبوب بیوی کی یادوں کا خراجِ اغاں روشن ہے۔

سوما کو اسی شام بہت خاموشی سے فن کر دیا گیا تھا کچھ عرصہ بعد عدیل نے بتایا کہ رجب جاب چھوڑ کر سعودی عرب چلا گیا ہے۔ اس نے نئی عمرے کئے۔ حج کئے۔ اس نے عشق مجازی کو کھو کر عشقِ حقیقی کو پالیا تھا۔ اس نے اپنے پروردگار سے ایسی لو لگائی کہ پھر دل کی تمام تر بے چینیوں، غم اور اذیتیں خود بہ خود مٹ گئیں۔ ختم ہو گئیں۔ اس سفر میں اسے اللہ کی رحمتیں اور اس کا فضل مل گیا۔ یہ جتنو کا ایک اور سفر تھا جس میں اسے صرف پانا ہی پانا تھا۔ اس نے عشقِ حقیقی کے جام بھر کر پیئے اور اس کی روح سرشار ہوتی چلی گئی۔

خانہ کعبہ کی چھاؤں میں بیٹھ کر وہ ام رمان کے لیے دعائے مغفرت کرتا تھا۔ کبھی کبھی سوما کا نام خود بہ خود اس کی دعاؤں میں شامل ہو جاتا اور وہ اللہ سے اس کی بخشش کے لیے دعا کرتا۔ ادھر میں اکثر برابر والے اجازت گھر کو دیکھ کر پہروں سو جتی رہتی۔ اسی گھر کے اجازت لان میں پہلی مرتبہ میں نے اس پاگل پاگل سی الجھی، بکھری بد صورت عورت کو دیکھا تھا۔ جس کی رنگت سنو لا کر جھلس گئی تھی اور جو چیخ چیخ کر کہتی تھی کہ میں نشانِ عبرت ہوں۔

اکثر میں سو جتی تھی کہ سوما بہت انتہا پسند تھی ہر سوچ کی انتہا، ذلت کا گڑھا پستی اور زوال ہے۔ انتہا پسندی عقل شعور چھین کر انسان کو بے بسی کی سرحدوں پر لائیتی ہے جہاں سے پھر پچھتاؤں کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا آغاز ہوتا کہاں سے ہے؟ نفس کی بے لگامی سے۔ اندھی خواہشوں کی جنونی طلب سے۔

جو لوگ ”حد“ کو کراس کرتے ہیں وہ اسی طرح ذلیل ہوتے ہیں۔

بہتان باندھنے والوں کا انجام دنیا اور آخر میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔

اور قیامت کے دن ان کی گردنوں میں آگ کے طوق ہوں گے۔

دلوں کو نہیں مت پہنچاؤ۔ خدا دلوں میں رہتا ہے۔

میرا دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے پھیلنے لگتا آنکھیں برس برس کر تھک جاتیں اور میں سوما کے لیے اللہ سے بخشش طلب کرتی۔ میں اس کی روح کے پرسکون رہنے کی دعا کرتی۔ میرے اندر کی تبدیلیوں نے عدیل کو بھی ٹھنکا دیا تھا۔ شاید میرا رویہ بہت بدل چکا تھا تبھی تو عدیل

حیرانی سے کہتے۔

”خدا کے لیے عافیہ! پہلے کی طرح کوئی فرمائش کوئی شکوہ تو کرو۔ مجھے تمہاری اتنی خاموشی ہضم نہیں ہوتی۔ کم از کم اور کچھ نہیں تو غصے میں دو تین برتن ہی توڑ دو“ اور میں دھیرے سے مسکرا دیتی تھی۔ اتنی چھوٹی سی زندگی میں خواہشات کے انبار تلے ہم اپنے حال کو کسی قدر نا آسودہ بنا رہے ہیں خوشیوں اور مسرتوں کے اس وقت نے زیت کی طرح ہاتھ سے پھسل جانا تھا اور میں اس وقت کو اپنی مٹھی میں قید کرنا چاہتی تھی۔ میں نے عدیل کی ماں کو تنہا کر دیا تھا سوسب سے پہلے میں امی کو منا کر یہاں لانا چاہتی تھی۔ میں عدیل کے معاملے میں بہت انتہا پسند تھی۔ بہت پوزیٹو تھی۔ میں عدیل کو ان کی ماں بہنوں کے ساتھ شیئر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اور نہ جانے کب میرے دل میں اپنی ساس اور نندوں کے لیے نفرت کے جذبات موجزن ہو گئے تھے۔

نفرت ہو یا محبت، کسی بھی چیز کی ”انتہا“ سوائے خسارے کے کچھ نہیں دیتی اور میں ”پچھتاؤں“ کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

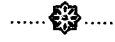
سوما کو محبت کی ”انتہا“ نے جی دامن کر دیا تھا اور مجھے نفرت کی انتہا نہیں راستوں کا مسافر بنانے والی تھی۔ سوما کی زندگی کے تاریک پہلو میری آنکھوں کی کھوئی ہوئی بینائی لوٹا گئے تھے ضروری تو نہیں کہ کوئی اچانک لگنے والی ٹھوکر ہی سنبھلنے کا سبب بنے۔

میں نے پنڈی جانے کے لیے بیک تیار کر لیا تھا مجھے چمکتی دہکتی صبح کا انتظار تھا جو عدیل کی آنکھوں میں روشنی سی بھر دیتی۔

رمضان کے بابرکت مہینے کی آمد کے ساتھ میں نے اپنے گزشتہ رویوں کی عدیل سے معافی مانگ لی تھی میں اپنی پہلی عید سسرال میں سب کیساتھ منانا چاہتی تھی میرا یہ اعلان سن کر عدیل کس قدر مسرور ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر حیرانی بھی تھی کیونکہ میں ظاہر نہ بھی کرتی تب بھی اتنا تو وہ جانتے تھے کہ میں سسرال والوں سے خار کھاتی ہوں۔ میرے گزشتہ رویے چیخ چیخ کر بتاتے تھے اب مجھے اپنے رویوں کو بدلنا ہے اپنی سوچ کو نکھارنا ہے خود کو بدگمانیوں اور آلودگیوں سے پاک کرنا ہے کہ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں دلوں کو رنجشوں کا سبب بنا دیتی ہیں۔

مختصری اس زندگی میں ہم نہ جانے کس کس کا دل دکھاتے ہیں۔ اگر اس تیز رفتار زندگی میں رک کر ٹھہر کر چند بل کے لیے سوچیں تو خود سے نظر ملانا بھی مشکل ہو۔ میں نہ جانے کب تک سوچوں میں گم رہتی۔ عدیل نے ”چاند نظر آ گیا ہے“ کی پکار اور مسلسل پکار سن کر میں بھی.....

چھت پر پہنچ گئی تھی۔ عدیل آسمان کی وسعتوں میں نظر جما کے یقیناً ”چاند“ تلاش کر چکے تھے۔  
 ”کہاں ہے مجھے بھی دکھائیں“ میں نے بے چینی سے عدیل کا شانہ ہلایا۔ عدیل نے  
 چونکنے کی ایکنگ کی تھی پھر میرے شانے پر اپنا بازو دراز کر کے بڑی محبت سے بولے۔  
 ”یہ میرے پہلو میں“ عدیل کی مسکراہٹ اب ہنسی میں تبدیل ہو چکی تھی میں نے بھی  
 سرشار ہو کر بے ساختہ تہقہہ لگایا۔ یعنی وقت ابھی میری ”قید“ میں تھا اور میں اس وقت کو بہترین  
 ”یاد“ بنا سکتی تھی۔



## روشنی سی چار سو ہے

”طلاق؟ تمہیں طلاق چاہئے“ گلاب، مویہ اور ایئر فریشنر کی خوشبو میں مہکتے  
 کمرے میں اچانک یوں لگتا تھا کسی نے گیس کے چولہے کا برز کھول دیا ہو وہ اچھل کر دور ہٹا۔  
 گویا کسی دہکتے انگارے کو ہاتھ لگایا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت، دکھ، صدمے اور بے یقینی کے  
 کئی رنگ ایک ساتھ جھلکنے لگے تھے۔ سومیہ کو ایک پل کے لیے افسوس سا ہونے لگا۔ جمال کے  
 چہرے پر سائے لہرا رہے تھے۔ گہری شام کے بھیاں ک سائے۔

”ہاں“ سومیہ نے سر جھکائے لرزتی آواز میں اپنا مطالبہ دہرایا۔  
 ”تمہیں یعنی سومیہ مراد کو نکاح کے محض چھ سات گھنٹے بعد اپنے شوہر سے طلاق  
 چاہئے؟“ وہ شاید اس حیرت اور بے یقینی کے جھٹکوں سے سنبھل چکا تھا تب ہی سومیہ کے سبے  
 ہوئے سراپے کو ایک نظر دیکھ کر پھبتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ہاں“ وہ بھی خود کو مضبوط ظاہر کرنے کے چکر میں بھرپور اعتماد کا مظاہرہ کرنے لگی تھی۔  
 ”کیوں؟ وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“ جمال نے اپنی پھری ہوئی سانسوں کو ہموار کرنے کی  
 کوشش کی تھی۔ وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔ اس کے لہجے کی روانی اور چہرے کے  
 تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کچھ لمحے پہلے جذبوں اور تمنائوں کی تکمیل کے  
 احساس سے یہ چہرہ دہک کر لوہے رہا تھا۔ مگر اب یوں لگتا تھا سانے بیٹھا جمال مرسلین برف کی  
 دیوار بن گیا ہے، سرد، بے حد سرد اور ہر احساس سے عاری۔

”وجہ؟“ سومیہ دھک سے رہ گئی تھی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ کوئی ”وجہ“ بھی  
 بتانا ہوگی۔ ایسے جو کچھ کہا گیا تھا۔ وہ سب تو اس سے کہہ دیا تھا اور ”وجہ“ بھی اسے ذہن نشین

کروائی گئی تھی۔ سو کچھ تامل کے بعد وہ دھیرے سے بولی۔

”اس شادی میں میری پسندیدگی شامل نہیں“

”کیا تمہیں نکاح سے پہلے خبر نہیں تھی۔ عالم بے ہوشی میں دستخط کئے تھے“ وہ یکدم

زہر خندہ ہوا۔

”انکار کر دیتیں؟ کوئی زبردستی تھوڑی تھی“ جمال کا رواں رواں سلگ اٹھا۔

”انکار؟“ سومیہ نے پھر سے سوچنے میں وقت لیا تھا، ”میرا انکار مجھے زمانے کی نظر

سے گرا دیتا؟“

”اتنی بھولی تو نہیں ہو، جس قدر بھولپن خود پر طاری کر رکھا ہے۔ اس چال بازی اور

دھوکہ دہی کا حساب الگ سے لوں گا۔ ابھی تو مجھے صرف اپنی ناپسندیدگی کی وجہ بتاؤ“ وہ تنفر سے

اسے دیکھتا غراتے ہوئے بولا۔

”تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟“ سومیہ کی طویل خاموشی سے اکتا کر جمال نے پوچھا۔

”جی“ سومیہ نے سر ہلا کر جمال کے بدترین خدشات کی تصدیق کر دی تھی اور اس

وقت وہ جمال کو اس قدر زہر لگ رہی تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا اس نجی سبائی مورت کو اٹھا کر باہر

پھینک دے۔ ابھی تین لفظ اس کے منہ پر مارے۔ مگر بہت سوچ و بچار کے بعد یہ غیر مناسب حل

اس نے اطمینان سے ایک طرف رکھ دیئے تھے۔

”مجھے دھکارتے والی، رینجکٹ کرنے والی سومیہ مراد بھی ”بامراد“ کبھی نہیں ہوگی۔

ہرگز نہیں۔ کم از کم میری زندگی میں تو نہیں“

اس نے آخری سلگتی نظر سومیہ کے کپکپاتے وجود پر ڈالی اور غصے کے عالم میں اپنا

موبائل اٹھا کر باہر چلا گیا ادھر سومیہ کا سویا سویا ذہن نیند کے جھونکوں کی وجہ سے اور بھی بھاری ہو

رہا تھا اور وہ گھومتے دماغ سے سوچ رہی تھی کہ اس نے جمال سے کیا کیا بول دیا ہے؟

☆☆☆

”سومی! میری جان اٹھ جاؤ نا“ شبانہ پھوپھو نے تیسری مرتبہ کمرے میں جھانک کر

حالات سے کہا تھا۔ سومی نے کسمسا کسمسا مندی مندی آنکھیں کھولیں۔ پھوپھو کے شفق مہربان

محبت کے رنگوں سے سجدے کی طرف دیکھا اور پھر سے کروٹ بدل کر بے سدھ ہو گئی۔

”سومی گڑیا! اٹھ جاؤ نا۔ دیکھو گھڑی نو بج رہی ہے۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے، اور پھر مجھے

کچھ دیر کے لیے کہیں جانا ہے“ پھوپھو اب اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔ ان کی نرم انگلیاں

سوی کے بالوں میں سرسرا نے لگیں۔

”پھوپھو! سونے دیں نا“ وہ نیچے میں سرگسا کر بھاری سی آواز میں بولی۔

”کر لیا نا لگا خراب“ پھوپھو نے وحشت کے عالم میں بے ساختہ چیخ ماری۔ اسی لیے

سومی بھی ہڑبڑا کر اٹھ گئی تھی۔

”کیا ہوا پھوپھو؟“ وہ ہراساں ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

”ہونا کیا ہے منع کیا تھا رات کو آکس کریم نہ کھاؤ۔ اب اپنی آواز پھٹے ڈھول جیسے کر لی

ہے۔ رات کو مہمان بھی آئیں گے“ پھوپھو کوئی فکر لاحق ہو گئی۔

”کون سے مہمان؟“ سومیہ چونکی۔

”بتایا تو تھا تمہیں“ پھوپھو نے خفگی سے جتایا، ”زیرا کے جاننے والے ہیں۔ تمہارے

سلسلے میں آئیں گے“

”اوہو“ سومیہ قل قل ہنسنے لگی تھی۔ اسے پھوپھو کی پریشانی کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔

”اس موقع پر لڑکیاں اوہو۔ ہو، نہیں کرتی“ پھوپھو ناراضی سے بولیں۔

”تو کیا کرتی ہیں؟“ سومیہ نے شرارت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”شرماتی لجاتی ہیں“ پھوپھو اپنے دھیان میں گم تھیں۔

”یوں، اس طرح“ سومیہ نے باقاعدہ دوپٹے کا کونا منہ میں دبا کر دکھایا تو پھوپھو خفا

ہو کر گئیں۔

”میں بھی تمہاری بونگیاں سننے بیٹھ گئی ہوں“ پھوپھو سر پر ہاتھ مار کے کھڑی ہو گئیں۔

”کہاں جا رہی ہیں؟“ سومیہ کو بھی بالآخر اٹھنا پڑا تھا۔ نیند تو ویسے بھی اچاٹ ہو گئی

تھی۔ رات کو اس کی طبیعت اچھی خاصی بگڑ گئی تھی۔ سر میں درد تھا، وہ بہت دیر سے سوئی تھی تب

یہ آنکھ جلدی نہیں کھل سکی۔

”مارکیٹ تک۔ کچھ سامان لاؤں گی۔ آج مہینے کی پہلی تاریخ ہے پینشن بھی مل

جائے گی۔“ پھوپھو کو بیوگی کے بعد اپنے شوہر کی طرف سے ٹھیک ٹھاک رقم گورنمنٹ کی طرف

سے ملتی تھی۔ پھوپھو کی چار بیٹیاں تھیں ایک بیٹا تھا۔ بیٹیاں شادی شدہ تھیں جبکہ بیٹا اسٹڈی

ڈیزے پر سویڈن پڑھنے کے لیے چلا گیا تھا۔ یہ اس کی پڑھائی کا آخری سال تھا اور پھوپھو اس

کی واپسی کے انتظار میں دن گن رہی تھیں۔

”تم ناشتہ کر لینا۔ بہت لاپرواہ ہو۔ ماسی بھی آنے والی ہے اپنی نگرانی میں صفائی کروا لینا“ پھوپھو ہدایت نامہ اسے تھا کر باہر نکل گئی تھیں۔

ماسی کے آنے سے پہلے سومیہ نے ہلکا پھلکا ناشتہ کر لیا تھا۔ پھر چھوٹے چھوٹے کاموں کے دوران وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا تھا اور پھوپھو نو بجے کی ٹنگی چھ بجے کے قریب واپس آئیں۔

”ہائے..... تھک گئی ہوں۔ جوڑ جوڑ دکھنے لگا ہے“ پھوپھو صوفے پر ڈھسے گئی تھیں۔

سومیہ اسکو اٹش کا جگ فریج سے نکال لائی۔

”آپ تو مارکیٹ تک گئی تھیں اتنی دیر سے کیوں آئی ہیں؟“

”زیرا کی طرف چلی گئی تھی۔ بیمار تھی۔ بچے بھوک سے بلبلارہے تھے۔ سارا گھر

تکپٹ تھا“

زیرا باجی، پھوپھو کی تیسرے نمبر والی بیٹی تھیں۔ پھوپھو اپنی تھکاوٹ کی تفصیل بتا رہی تھیں اور سومیہ جمائیاں روکنے میں ہلکان ہونے لگی۔ ایک تو اسے بے تحاشا نیند آیا کرتی تھی ہر وقت ذہن سویا سویا رہتا سستی بھی ہر وقت اس کے گرد گھیرا تنگ کے رکھتی تھی اور پھوپھو کو اس کی بے تحاشا سونے کی عادت سے چڑھتی۔

”تم ابھی سے سونا شروع کر دو“

”سچ پھوپھو! سارا دن نہیں سوئی“ وہ ٹھٹک کر بولی۔

”کیا کرتی رہی ہو پورا دن؟“ پھوپھو نے ناگواری سے اس کی سرخ ہوتی آنکھوں کو

دیکھا ”تم نے دوا بھی نہیں کھائی ہوگی؟“

”اسی لیے سر میں درد ہو رہا ہے ابھی میڈیسن لیتی ہوں کم از کم نیند تو پرسکون آتی ہے پھوپھو! یوں لگتا ہے، دوائیوں کی اس بوتل کے ساتھ ہی عمر تمام ہو جائے گا“ بے زاری سومیہ کے لہجے سے عیاں تھی۔

”مایوسی کی باتیں نہیں کرتے“ پھوپھو نے بے اختیار ٹوکا۔

”امید کی کرن کہاں سے لاؤں؟ ہوش سنبھالتے ہی یہ دوائیاں منہ کو لگی ہیں اور

چھوٹے کا ابھی تک نام نہیں لیا“

”بری بات بیٹے! یوں نہیں کہتے“ پھوپھو نے ہمیشہ کی طرح نگاہ چرائی۔

”ارے..... وہ آپ کے مہمان کہاں گئے؟“ سومیہ کو اچانک گھڑی دیکھ کر خیال آیا تھا۔

”ان کا پروگرام بدل گیا ہے“ پھوپھو کے لہجے میں واضح تھکن اتر آئی۔

”اوہو“ سومیہ نے زہریلے تبسم کو دانتوں تلے روند ڈالا ”کیا انہیں میری بیماری کی

اطلاع مل گئی ہے پھوپھو!“

”سومی!“ پھوپھو نے محبت سے ڈپٹا، ”خبردار جو فضول بکواس کی تو“

”حقیقت اور سچائی اگر چہ تلخ ترین ہو۔ ایک دن سامنا تو کرنا ہوتا ہے نا“ سومیہ نے

اسی تلخ ترین انداز میں کہا۔

”تمہیں خدا نخواستہ کوئی بیماری نہیں سومی!“ پھوپھو ہمیشہ کی طرح اس کی تلخی کے اثر کو

زائل کرنے کی کوشش میں جت گئیں۔

”کوئی بڑی بیماری نہیں۔ بس سانس ذرا سا اکھڑ جاتا ہے۔ سر درد کے عذاب میں ہر

وقت مبتلا رہتی ہوں۔ نیند کا شمار کبھی اتر نہیں۔ سستی اور بے زاری کے علاوہ آج تک کوئی اور

احساس چھو کر مجھے نہیں گزرا۔ ان حالات میں کوئی احمق ہی مجھ سے شادی کرے گا پھوپھو!“ اس

نے بڑی سفاکی سے سچائی کا پردہ چاک کیا تھا۔

”دنیا میں احمقوں کی بھی کمی نہیں“ پھوپھو شاید ماحول پر چھائی کثافت کے اثر کو رفع

کرنے کی کوشش میں شگفتگی سے بولیں۔

”پلیز پھوپھو! مجھے شادی نہیں کرنا۔ آپ اس سلسلے کو پلیز ختم کر دیں۔ آئے دن کوئی

نہ کوئی منہ اٹھائے چلا آتا ہے“ سومیہ کی آنکھیں اور بھی سرخ ہو گئی تھیں۔

”تم پہلے دوا کھاؤ؟“ پھوپھو لیٹنے سے پہلے تاکید ابولیں۔

”آپ دوائیوں کا نسخہ لگائی تھیں“ سومیہ اٹھتے ہوئے مڑ کر پھوپھو کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں، وہ شاپر میں ساری دوائیں ہیں۔ یہ کام میں بھول سکتی ہوں“

”کھانے میں کیا بناؤں؟“ کچن کی طرف جاتے ہوئے سومیہ نے پوچھا۔

”اروی گوشت پکا لو۔ بلکہ رہنے دو“ میں خود ہانڈی چڑھاتی ہوں تم تو خیر چھوڑو“

پھوپھو بولتی ہوئی سومیہ کے پیچھے چلی آئی۔

”کہہ دیجیے تم تو اروی کو گھول کر ملوہ بنا دو گی“ سومیہ ہنس پڑی۔

”چل ہٹ“ پھوپھو نے لاڈ سے اس کے کندھے پر دھپ لگائی ”سب کچھ سکھا کر



گیا اور ثمانہ اس کی شکل پر سمجھ گئی مراد نے ایسی چوٹ دل کو لگائی کہ پھر چپکے سے دنیا سے ہی چلا گیا۔  
ان کے آنسو بھل بھل کرنے لگے تھے بھائی کی ناکام ازدواجی زندگی اور پھر بھری جوانی میں دنیا سے چلے جانا، یہ ایسا غم تھا جو پھوپھو کو اکثر رلانے کا سبب بنتا اور یہ سومیہ کے لیے بھی ایسا غم تھا جو کہ ہمہ وقت اس پر طاری نیند کی خضاری تک کو شکست دے ڈالتا تھا۔

”ایسی بے حیا عورت، تو بہ تو بہ!“ سمیرا باجی کی ساس سیکنے آئی نے دونوں ہاتھ کانوں کو لگا کر دانتوں تلے زبان دبالی ”معصوم بچی پر لمحہ بھر کو بھی ترس نہ آیا۔ ہائے کیسی ظالم ماں تھی“ آئنی کی ترجم بھری نظریں وقتاً فوقتاً سومیہ کی طرف بھی اٹھ رہی تھیں اور ادھر سومیہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو کٹھن سے میں کھڑا محسوس کر رہی تھی۔

”ثمانہ کے میکے سے کوئی نہ آیا۔ اتنی بڑی بات ہو گئی بچی بھی تنہا“ سیکنے آئی پر ہمدردی کا تاپ چڑھ گیا تھا شاید اور سومیہ جی ہی جی میں بری طرح تمللانے لگی ”ثمانہ کے اس انتہائی قدم کا اثر میکے پر بھی ضرور پڑا ہوگا“ اب قیاس آرائیاں شروع ہو گئی تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا محض گفتگو کو طویل کرنے اور اس قصے میں پختارے لینے کی وجہ سے ”اوپننگ“ کی گئی ہے۔

”میکے میں تھا ہی کون۔ بڑھی ماں، نفیسی بھائی۔ وہ بھی کیا سومیہ کی ذمہ داری اٹھاتا۔ اسے تو اپنا ہوش نہیں تھا۔ بیوی اس کی بھلی مانس عورت تھی۔ ایک لڑکا بھی تھا، تاہم سومیہ کو ان کے حوالے کرنا، اپنے بھائی کی اکلوتی نشانی کو نظروں سے دور کرنا مجھے گوارا نہیں تھا۔ جنت (ثمانہ کی بھابھی) سوتی کو لینے آئی بھی تھی۔ شاید دنیا دکھاوے کے لیے مگر میں نے اپنی بچی کو جانے نہیں دیا۔ اس ماحول میں اور اس کھٹن زدہ گھر میں رہنا کسی آزمائش سے کیا کم تھا۔ میری سومیہ کہاں کسی گاؤں میں رہنے کی عادی ہے۔ جہاں سہولتوں کا فقدان، زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے روپیہ پیسہ بھی چاہئے ہوتا ہے۔ جبکہ ثمانہ کا بیک گراؤنڈ بہت کمزور تھا۔ یہ تو حسن کی دیوانگی تھی جو ثمانہ ایک چھوٹے سے گاؤں سے اٹھ کر اس گھر میں آئی۔ مگر اس کی بد فطرتی نے اسے عزت سے رہنے نہیں دیا“ پھوپھو کو ماضی کا نجانے کون کون سا منظر یاد آ رہا تھا ان کے چہرے پر ہر رنگ اپنا اثر چھوڑنے لگا۔ ماحول خود بخود بوجھل ہو گیا تھا۔

”اتنے سالوں میں کبھی سومی کی مامی، ماموں نے پلٹ کر نہیں پوچھا؟“ سیکنے آئی نے ایک اور تاسف بھری نگاہ سومیہ پر پھینکی۔

”نجانے زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ ماموں تو ان دنوں میں ہی دو چار دن کا مہمان لگتا

اگلے گھر روانہ کروں گی“

”یہ اگلا گھر کون سا ہے؟“ سومیہ نے انجان بننے ہوئے شرارت سے پوچھا۔ اس کا موڈ خود بخود خوشگوار ہو گیا تھا۔

”جلد پتا لگ جائے گا“ پھوپھو کا انداز دھمکی آمیز تھا۔

”آپ بھی پرے بیٹے میں آپ کی جان چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گی۔ چپکی رہوں گی ہمیشہ آپ کے ساتھ لٹوڑے کی طرح“

”میں اس لٹوڑے کے پیڑ کو کسی اور کے آگن میں لگا آؤں گی“ پھوپھو پیاز کاٹنے میں مصروف ہو چکی تھیں۔

”چائے بنادو“ سومیہ پیاز کی کڑواہٹ سے بچنے کے لیے کچن کے دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

”رہنے دو۔ ابھی موڈ نہیں“

”میرا بھی موڈ نہیں“ سومیہ دوائیوں کا شاہراہ اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ آٹا نانا اسے یہ دوائیوں کا چھوٹا سا شاہراہ کسی بھاری گھڑی کے مشابہہ لگنے لگا تھا۔ وہ نیند سے بند ہوتی آنکھوں کو مسلتے ہوئے بیڈ پر ڈھے گئی۔

☆☆☆

سومیہ، حسن مراد کی اکلوتی اولاد تھی۔ بد قسمتی سے اس کی ماں سومیہ کو جنم دینے کے بعد حسن مراد سے طلاق لے کر کسی اور کا گھر بسا چکی تھی۔ اس کے والد اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ بغیر کسی بیماری کے ایک رات سوئے اور چپکے سے خالق حقیقی سے جا ملے۔ تب ننھی سومیہ کو اس کی اکلوتی پھوپھی شانہ نے اپنے شفیق بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔

وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر بھائی کے گھر محض سومیہ کی محبت اور تنہائی کے خیال سے آئی تھیں۔ عرصہ ہوا تھا اس قصے پر گرد پڑے مگر کبھی کبھار نادانستی میں پھوپھو کو اس گھسے پٹے قصے اور شرمناک داستان سے گرد جھاڑنے کا خیال آ جاتا تھا۔ جیسے کہ اس وقت پھوپھو اپنی سادگی میں سمیرا باجی کی ساس کے پوچھنے پر اپنے اندر کا ابال نکالنے لگی تھیں۔

”اچھی صورت پر مان تھا۔ نہ سسرال کی لاج رکھی نہ بیمار ماں کے چنے جھاٹے (سفید بالوں) کا خیال کیا۔ مراد کا کاروباری دوست تھا۔ گھر میں آنا جانا لگا رہتا تھا بس پھر وہ ثمانہ کا اسیر ہو

تھا۔ نشے نے اس کی مت مار کر رکھ دی تھی، پھوپھو نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

”آپ کے جذبات کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ یتیم بھتیجی کو سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ ورنہ آج کے دور میں کون کسی کو پوچھتا ہے۔ خون سفید ہو چکے ہیں۔ بھائی دوسرے بھائی کا دشمن ہے۔ نجمانے وقت نے کیا کچھ دکھانا ہے، سیکینہ آئی نے ایک کٹیلی نظر بہو پر پھینکی۔ سیراباجی نے پہلو بدل کر منہ کے زاویے بگاڑ لیے تھے۔

”ہم نے کون سا احسان کیا ہے۔ میرے دل کا ٹکڑا ہے۔ میری بھتیجی ہے۔ اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے۔“

”پھوپھو نے سیکینہ آئی کے دھیان کو ایک مرتبہ بھر بٹا دیا تھا، جو کہ اب اپنی بہوؤں کے بننے ادھیڑنا چاہتی تھیں۔ آئی کی تینوں بہویں ان دنوں آئی کے محبت سے بنائے آشیانے کے حصے بخرے کرنے کی تیاریوں میں تھیں۔ بقول سیراباجی کے اس مرغی کے دڑبے میں کوئی کب تک رہے“ اس لحاظ سے سیراباجی بھی ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ سب کو ہی اپنا معیار زندگی بہتر بنانے کا شوق ہوتا ہے۔

”ویسے بہن! میں آپ کی ہمت، صبر اور بلند حوصلے کو اکثر سراہتی رہتی ہوں، سیکینہ آئی پھر سے پر جوش ہو چکی تھیں۔ پھوپھو اپنی تعریف پر انکساری سے مسکرا دیں۔ پھوپھو کی سادگی، وضع داری اور سلیقے قرینے کی تو ایک دنیا قائل تھی۔

”بس یہ سب میرے اللہ کا کرم ہے“

پھوپھو کی آنکھیں بھینکنے لگیں۔ بیوگی کے بعد انہوں نے بہت کڑا وقت گزارا تھا۔ بہت مشکل حالات سے مقابلہ کیا تھا۔ جب کوئی اپنا بھی ساتھ دینے کو تیار نہ تھا۔ تاہم ان کی محنت۔ انتھک کوشش اور صبر رنگ لایا تھا۔ ان کے پانچوں بچے کامیاب تھے۔ بیٹیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں، اپنے اپنے گھروں میں خوشگوار زندگی گزار رہی تھیں، دو ملک سے باہر تھیں اور دوسری شہر میں بیاہی تھیں۔ پھوپھو کا اکلوتا بیٹا ندیم بھی ذہین اور محنتی نوجوان تھا۔ سو پھوپھو کو اپنی اولاد کی طرف سے راتیں اور سکون میسر تھا۔ بس ایک فکر تھی تو سومیہ کے مستقبل کی۔ سومیہ کا غم ہی پھوپھو کو پورے دل سے خوش نہیں ہونے دیتا تھا۔ ایک تو سومیہ کی بیماری، پھر شکل و صورت بھی واجبی سی تھی۔ اوپر سے تعلیم بھی نہ ہونے کے برابر۔ کم از کم پھوپھو کی قابل اور بے حد ذہین بیٹیوں کے سامنے سومیہ اور بھی دب کر رہ جاتی تھی۔

”سومیہ! تم نے کیوں اپنا تعلیمی سلسلے کو منقطع کر دیا ہے بیٹا!“ آئی نے حلاوت سے گم صم بیٹھی سومیہ سے کہا تھا۔ وہ گڑبڑا کر چوکی۔ اس سوال کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ اسی لیے چونک کر کنفیوزی پھوپھو کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا بتاؤں بہن!“ پھوپھو کی آواز بھرا گئی ”میں سومیہ کے معاملے میں نجمانے کیوں اتنی حساس اور دہمی ہوں، شاید اس لیے بھی کہ بچپن سے ہی اسے سانس کی تکلیف ہو جاتی تھی۔ بیٹھے بٹھائے ہاتھ پیر چھوڑ دیتی تھی۔ سانس بری طرح اکھڑ جاتا تھا۔ دھول مٹی اس کی صحت کے لیے شدید نقصان دہ ہے۔ نجمانے میٹرک تک کیسے میں نے اسے سکول جانے دیا تھا۔ کئی مرتبہ اسکول سے فون آتا، سومیہ سخت بیمار ہے۔ اس کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ سکول سے آ کر لے جائیں۔ بس اسی وجہ سے یہ آگے پڑھ نہیں سکی۔ میٹرک کے پرچے بھی نہیں دے سکی تھی۔ ورنہ میں تو چاہتی تھی سوئی اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاتی“

پھوپھو نے جو کچھ کہا اس میں جھوٹ کی ذرہ بھر ملاوٹ نہیں تھی۔ سومیہ کو اپنی بیماری کے اس موضوع سے بھی شدید قسم کی چڑچڑاہٹ تھی۔

”تو بیٹا! پرائیویٹ امتحان دے لیتیں، سیکینہ آئی شاید آج فرصت سے آئی تھیں۔“

”مجھے مزید پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا، سو اسی لیے“ سومیہ نے پھوپھو کو کسی بھی قسم کی وضاحت سے بچا لیا تھا۔

”امی! یہ سوسے تو چکھیں،“ سیراباجی نے آئی کی فراٹے سے چلتی زبان کو روکنے کی ایک کوشش کی۔

”ہاں، کیوں نہیں“ آئی نے سلسلہ کلام منقطع کیا۔ پلیٹ دائیں ہاتھ میں پکڑی ”تم بھی کچھ سومیہ سے بنانا سیکھ لو، خوش ذائقہ، خستہ سا سوسہ نزاکت سے منہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے بہو کو مخاطب کیا۔

”سومیہ سے،“ سیراباجی کو اچھو لگ گیا ”سومیہ سے کیا بنانا سیکھو۔ اسے کچھ آتا ہے؟“

”چائے بنا سکتی ہوں،“ سومیہ نے کچھ شرمندہ ہو کر جواب دیا۔

”کیوں بہن! سومیہ کو کچھ پکانا بھی نہیں سکھایا؟“

آئی نے طنز یہ لہجے میں کہتے ہوئے توپوں کا رخ پھوپھو کی طرف موڑ لیا۔ سومیہ اور پھوپھو دونوں ہی گڑبڑا گئی تھیں۔ پھوپھو بے چاری کیا بتاتیں کہ سومیہ کو مسالے کی خوشبو سے بھی

الرجی تھی۔ چھینک چھینک کر برا حال ہو جاتا۔ سر میں درد کی ٹیسس اٹھنے لگتیں۔ سووہ سکون کی ایک گولی لے کر لمبی تان کے سوجاتی تھی۔ کبھی کبھی اسے یاسیت کے دورے پڑنے لگتے تھے اور وہ افسردگی سے سوچتی تھی کہ اس نے دنیا میں آکر سوائے سونے کے کوئی اور کام نہیں کیا۔ اگر ان بیٹے ماہ و سال میں کچھ کیا تھا تو پانچ وقت کی نمازیں تھیں جو سومیہ بڑے خشوع و خضوع سے ادا کرتی تھی۔ ”میری بیٹی ہرن میں طاق ہے۔ سینا پر ونا سب آتا ہے۔ سلائی کڑھائی میں ماہر ہے۔ ایسے ایسے ڈیزائن بناتی ہے کہ سب دیکھتے ہی رہ جائیں“ پھوپھو نے محبت سے سومیہ کا چہرہ دیکھا۔ ”ہاں، ڈیزائننگ تو بہترین کرتی ہے“ آنٹی نے ستائشی نظروں سے سمیرا باجی کے دیدہ زیب لباس کو دیکھا تھا۔ یہ سوٹ بلکہ ہر سوٹ سومیہ خود اپنے ہاتھوں سے سلائی کر کے سمیرا باجی اور زنیہ باجی کو بھجواتی تھی۔ ان کے بچوں کے کرتے سیتی، کڑھائیاں کرتی، سویٹر بنتی، پچھلی سردیوں میں اس نے سمیرا باجی کو ایک شال بھی بنا کر دی تھی۔ سومیہ کو یہ مصروفیت دل و جان سے پسند تھی۔ وہ بڑے شوق اور لگن سے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ بناتی رہتی تھی چاہتی تھیں سومیہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح زندگی کے ہر رنگ سے لطف حاصل کرے وہ اسے خوش دیکھنا چاہتی تھیں اور ادھر سومیہ کی بھی یہی خواہش ہوتی تھی کہ پھوپھو اس کی وجہ سے غم زدہ نہ ہوں۔

”سومیہ کی کہیں بات چلائی ہے؟“ سومیہ جو آنٹی کی بے سرو پا باتوں سے بے زار ہو کر کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ ایک پل کے لیے ٹھک کر رک گئی۔

”بس یہ بات پوچھنے کی کسر رہ گئی تھی۔ نجانے باجی بھی اپنی ساس کو گھر میں روک نہیں سکتیں۔ آئے دن آنٹی کو ہم سے ملنے کی ہڑک بے چین رہتی ہے“ سومیہ نے جل کر بھن کر سوچا۔ ”جہاں میرے رب کو منظور ہوا۔ جس کیساتھ سومیہ کا جوڑ لکھا ہو گا خود بخود ان ہی راستوں پر چل پڑے گا جو ہمارے گھر کی طرف آتے ہیں“ پھوپھو نے سادگی سے جواب دیا تھا اور سومیہ اس شاعرانہ قسم کے جواب کو سن کر بے اختیار ہنس پڑی۔

”سومیہ بچپن کی ہو رہی ہے یہ مناسب عمر ہے لڑکی کی شادی کی۔ بیٹا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا“ آنٹی تو ماہ و سال کا حساب کتاب کرنے لگی تھیں۔

”سومیہ کی مجھ سے بڑھ کر بھی کسی کو فکر ہو سکتی ہے؟“ پھوپھو نے ناگواری چھپا کر کہا۔

”یہ بات تو ہے“ آنٹی نے فوراً تائید میں سر ہلایا۔

”اب جانے کی تیاری کرو بیٹی!“ پھوپھو نے آنکھ کے اشارے سے بیٹی کو سمجھا۔ وہ

خود سیکڑہ آنٹی کی نکتہ چینی طبیعت اور بات کی کھوج میں لگے رہنے کی عادت سے خار کھاتی تھیں۔ ”امی! اٹھ جائیے۔ رات کے سات بجنے والے ہیں“ سمیرا باجی نے ماں کے اشارے کو سمجھ کر سر ہلا دیا تھا۔

”چلتے ہیں بیٹی! جلدی کا ہے کی ہے۔ کبھی کبھار تو میں شبانہ بہن سے ملنے کے لیے آتی ہوں“ آنٹی کا شاید ابھی گھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”امی! بچے گھر میں اکیلے ہیں“ سمیرا نے دانت پیس کر زنی سے جتلیا۔ ”کتنی مرتبہ کہا تھا، بچوں کو ساتھ لے چلو۔ ہمیشہ اسی طرح جلدی کا شور مچا دیتی ہو“ انہوں نے بے زاری سے جواب دیا۔

”آپ کا اپنا گھر ہے شوق سے رک جائیے۔ بلکہ کھانا کھا کر جائیے گا“ پھوپھو کو مرونا کہنا پڑا۔

”تمہاری ماں اتنا اصرار کر رہی ہے۔ کچھ دیر ڈرک جاؤ“ آنٹی، پھوپھو کی مروت کے جواب میں لگاوت سے بولیں۔ وہ دونوں تمللا کر رہ گئی تھیں۔ بھلا ہوا س موبائل فون کا جو بروقت بج اٹھا تھا۔ باجی کی دیورانی کا فون تھا۔ بچے اپنے آپے میں نہیں رہے تھے شاید۔ ماں کی غیر موجودگی میں بچوں نے پورا گھر تلپٹ کر دیا تھا۔ باجی کی دیورانی التجا کر رہی تھیں کہ دونوں خواتین گھر تشریف لے آئیں۔

باجی موبائل فون کان سے ہٹاتے ہی پرس پکڑ کر باہر کی طرف بھاگی تھیں۔ باجی کی پیروی میں آنٹی کو بھی بالآخر اٹھنا پڑا۔ حالانکہ ابھی وہ کھانا کھانے کے بعد چائے پینے کا ارادہ بھی رکھتی تھیں۔ سومی ان کے جانے کے بعد بھی دیر تک ہنستی رہی۔

☆☆☆

آٹھت کے اس کاروبار میں پچھلے سال کی طرح اس دفعہ بھی اسے کچھ خاص منافع نہیں ہوا تھا۔ سال کے آخر میں جمع کی ہوئی رقم تھوڑی تھوڑی کر کے بیوپاریوں کے پیٹ میں اتر چکی تھی۔ وہ کینو کا کاروبار کرتا تھا۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں بیوپاریوں سے خریدار کیونو مخصوص سبز منڈی میں بھجوانا، اسی کے ذمے تھا۔ وہ خود اپنی نگرانی میں ٹرک لوڈ کرواتا تھا اس کے باوجود منشی ہیر پھر کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہو جاتی تھی اور اس گڑبڑ کے بعد لالی اپنا مخصوص پیلے اور اق والا زجر اٹھائے منہ کے زاویے بگاڑے سبزی منڈی سے کچھ دور اس کے دکان نما چھوٹے

سے دفتر میں داخل ہو کر رجسٹرڈ میز پر رکھ کر منہ پھلائے بیٹھ جاتا۔ آج بھی ایسے ہی ہوا تھا۔  
 ”منشی پھر سے اوقات دکھا گیا ہے۔ آپ اس سے دو ٹوک بات کیوں نہیں کرتے  
 جمال بھائی!“ لالی کا غصہ بجا تھا۔ جمال نے سامنے رکھی ڈھیروں رسیدیں اکٹھی کر کے دراز میں  
 ڈالیں اور پھر لالی کے لال بھوکا چہرے کی طرف متوجہ ہوا۔  
 ”واپس تو آ لینے دو۔ ٹھیک ٹھیک حساب لوں گا۔ وارنٹک دی تھی مگر یہ پھر بھی اپنی  
 اصلیت دکھا گیا ہے“

”آپ نے کیا حساب لینا ہے جمال بھائی!“ لالی نے خفگی سے کہا ”منشی اپنی میٹھی  
 زبان کے جوہر دکھا کر پھر سے بری الذمہ ہو جائے گا“  
 ”اب کے ایسا نہیں ہوگا“

”دیکھتے ہیں، آپ اس دفعہ کیا کرتے ہیں“ لالی نے طنزیہ انداز میں کہا۔  
 ”اپنے باپ کی عمر کے آدمی کو اور کیا کہوں“ جمال نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے رجسٹر  
 کھول کر دیکھنا شروع کر دیا۔

”آپ کی نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اس قسم کے لوگ“ لالی نے ہمیشہ والا راگ  
 الاپا تھا۔

جمال نے سر جھٹک کر رجسٹر پر لکھی عبارت پڑھنا شروع کر دی۔  
 ”آج کے حساب کو نہیں، پچھلے ہفتے کے حساب کو پڑھیں“ لالی نے کرسی سے اٹھ کر  
 رجسٹر کے اوراق پلٹ کر ایک جگہ پر انگلی رکھ کر نشاندہی کی۔

”اٹھارہ کریٹ مالٹے کے ٹرک سے منڈی پہنچنے سے پہلے غائب ہوئے ہیں“  
 ”تمہاری منشی سے بات ہوئی ہے؟“ کچھ دیر سوچنے کے بعد جمال نے پوچھا۔  
 ”نہیں“ لالی نے نفی میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے۔ میں خود منشی سے آخری مرتبہ بات کرنے بلکہ سمجھانے کی کوشش کرتا  
 ہوں۔ اگر اس کے یہی طریقے رہے تو کسی بھروسے کے آدمی کو رکھ لو اور منشی کا پچھلا حساب کلیئر کر  
 کے چھٹی کروادو۔ آئے دن کے یہ چھوٹے موٹے نقصان کسی بڑے خسارے سے دو چار کر دیں  
 گئے“ جمال کے چہرے پر خطرناک قسم کی سنجیدگی چھائی تھی۔

”بہتر جناب“ لالی پھرتی سے کاغذات سمیٹ کر دراز لاک کرنے لگا تھا۔

”گھر چلیں“ جمال نے بایک کی چابی اٹھا کر لالی کا کندھا ہلایا۔  
 ”آپ چلیں، میں نان، کباب لے کر آتا ہوں“ لالی پھرتی سے شکر گرا کر تالا لگانے کے  
 بعد بولا۔

”کیوں؟“ جمال حیران ہوا ”تھانیدارانی نے کھانا تو پکایا ہوگا“  
 ”آپ کے لیے ضرور پکایا ہوگا۔ مجھ غریب کو کیوں گالیوں سے پیٹ بھروانے کے  
 لیے ساتھ لے کر جا رہے ہیں“ لالی نے بے بسی سے کہا۔

”کو نہیں یار!“ جمال نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی ”چل بیٹھ، وقت پر گھر پہنچنا  
 ہوگا۔ یہ نہ ہو تھانیدارانی دروازہ ہی نہ کھولے“ جمال نے لالی کو دھمکانا چاہا۔

”ہم خالہ پر دین کی بیٹھک میں بستر لگالیں گے“ لالی ہنستے ہوئے اچھل کر پیچھے بیٹھ گیا۔  
 لالی کے خدشات کے عین مطابق تھانیدارانی نے کھا جانے والی نظروں سے لالی کو  
 گھورا تھا۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں جمال سے پوچھا ”اسے پھر اٹھالائے ہو؟“ (کچھ عرصہ  
 پہلے لالی ہوٹل شفٹ ہو گیا تھا)

”کیوں میرے یتیم مسکین اس معصوم سے اکلوتے یار کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہو“  
 جمال نے تاسف سے کہا۔ لالی نے مصنوعی ناراضی خود پر طاری کر لی تھی۔

”ابھی ہاتھ کہاں دھوئے ہیں۔ آٹا گوندھتے ہوئے آئی ہوں“ تھانے دارنی (حسنہ  
 بیگم) نے اپنے گورے گورے ہاتھ سامنے کر دیئے تھے جن پر تازہ آٹے کی باقیات سے پتا چل  
 رہا تھا حسنہ بیگم بچن سے سیدھی گیٹ تک جلباتی ہوئی آئی تھی۔

”کھانا تیار ہے تو میز پر لگا دو“ جمال نے ڈرتے ڈرتے درخواست پیش کی تھی۔ لالی  
 اس درخواست پر تمللا اٹھا۔ اس کے یار دلدار کو محض اسی کی خاطر ایک تک چڑھی لڑکی کی خوشامد  
 کرنا پڑ رہی تھی۔

”روٹی پکالوں تو پھر میز پر کھانا لگا دیتی ہوں“ خلاف توقع تھانیدارانی نے ذرا نرم لہجے  
 میں جواب دیا تھا۔ ورنہ وہ تو ہمیشہ انگارے چبائے رکھتی تھی۔

”یا حیرت“ ان دونوں نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا اور یہ حیرت دسترخوان پر  
 پنے لوازمات کو دیکھ کر دو چند ہو گئی۔

”آج حسنہ بیگم کا موڈ خوشگوار ہے“ لالی نے جمال کے کان میں سرگوشی کی۔

”اللہ خیر کرے“ جمال نے دہل کر کہا۔

”میرے لیے دعا کریں کہ اللہ میری خیر کرے“ لالی نے ڈرتے ڈرتے سالن پلیٹ

بیں نکالے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ جمال نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس چکن کی ڈش میں کہیں زہر نہ ملا ہو“ لالی نے سرگوشیا نہ کہا۔

”تھانیدارنی کم از کم مجھے ہرنہیں کھلا سکتی۔ سو تم اطمینان سے کھاؤ“ جمال مزے سے بولا۔

”لقمان! روٹی کھا کر میری بات سننا“ حسہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی کمرے میں

داخل ہوئی۔

”جی بہتر“ لالی ہلکیا کر رہ گیا۔ حسہ پلٹ گئی تھی۔

ادھر جمال مسکراہٹ چھپانے کی غرض سے پلیٹ پر جھک گیا۔

”تھانے دارنی نے مجھ سے کیا کہتا ہے جمال بھائی!“ لالی کے حلق میں نوالہ پھنس گیا تھا۔

”یہ تو میری جان حسہ بیگم سے تم خود پوچھ لو۔ مجھے الہام تو نہیں ہوا“

”آپ بھی میرے ساتھ چلتا“ لالی نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

”کیوں؟“

”ذرا میرے دل کو تسلی رہے گی“ لالی نے معصومیت کے تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے کہا۔

”نہ میری جان! یہ پہاڑ تمہیں تنہا ہی سر کرنا ہوگا“ جمال نے صاف دامن بچالیا۔

”اچھے یار ہو مصیبت میں ساتھ چھوڑ رہے ہو جمال بھائی!“ لالی رو دینے کو تھا۔

”مرد بن کیوں عورتوں کی طرح ٹسوے بہانے لگا ہے“ جمال نے لالی کو چھیڑا۔ تبھی

باہر سے آواز آئی تھی۔

”لالی اولی! کتنی روٹیاں اور کھانی ہیں۔ بس کر، تیرے باپ کا اناج ہے“

”لو، کر لوگ“ لالی نے پانی کا گلاس خالی کر کے اٹھتے ہوئے کہا ”ایک تو روٹی کھلاتے

ہی گنتی کرنا شروع کر دیتی ہے تاکہ کھانے والے کا ہاضمہ خراب ہو جائے“

”مجھ پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونک مار دو جمال بھائی!“ وہ شرارت سے جمال کے

قریب جھکا تھا۔ جمال نے ہنستے ہوئے لالی کے سر پر چپٹ لگائی۔

”آپ کہاں چل دئے“ جمال کو اٹھتا دیکھ کر لالی سرعت سے بولا۔

”میں اماں کو دیکھنے جا رہا ہوں“

”ٹھیک ہے، آپ چلیے میں بھی تھانے دارنی کو سلامی پیش کر کے آتا ہوں“ وہ ہنستے

ہوئے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

حسن آراء عرف تھانے دارنی جمال کے اکلوتے ماموں تھانیدار شیریز گجری اکلوتی صاحبزادی تھی۔ اس کے والد کے انتقال کے بعد ماموں نے بیوہ بہن اور یتیم بھانجے کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اس کے والد کی تھوڑی بہت زمینیں تھیں۔ جو قرضے میں جانے سے محض ماموں کی مہربانی سے بچ گئی تھیں۔ آج اس بنجر زمین پر ہرسو ہریالی تھی۔ اور زمین کا رتبہ بھی پہلے سے جمال کی محنت اور ذہانت کی وجہ سے بڑھ گیا تھا۔

ماموں کے دست شفقت کی وجہ سے اس نے زراعت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان بنجر زمینوں کو آباد کیا تھا اور ہر کسان کی طرح اسے بھی اپنی زمین کے اس خطے سے محبت تھی۔

اس کے ماموں ایک عظیم انسان تھے۔ بہت ایمان دار، محنتی اور اصولوں کے پابند۔ بیوی کی وفات کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی اور حسن آراء کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ جس طرح ماموں کو اپنی بہن، بیٹی اور بھانجے سے محبت تھی ان کی وفات جمال کو جہاں بے آسرا ہونے کا احساس دے گی تھی وہیں ڈھیروں ذمہ داریوں نے جمال کو وقت سے پہلے سمجھ دار کر دیا تھا اور ان ذمہ داریوں کو لقمان نے بھی برابر اس کیساتھ شیر کیا تھا۔ حالانکہ جمال لالی پر کوئی بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

لقمان، ماموں کے چچا زاد بھائی کا بیٹا تھا۔ بد قسمتی سے اسے بھی بہت بچپن میں یتیمی کا صدمہ سہنا پڑا تھا۔ جب پہلی مرتبہ ماموں لالی کی انگلی تھامے گھر لے کر آئے تو انہوں نے سب سے پہلے جمال سے لالی کا تعارف کروایا تھا۔

”جمال پتر! یہ لقمان ہے، سب کا لالی۔۔۔۔۔ آج سے یہ تمہارا بھائی ہوا۔ اب یہ ہمارے ساتھ رہے گا“ وہ لالی کے گھٹے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے بول رہے تھے۔ پھر انہوں نے اسی انداز میں لالی سے کہا ”لالی! یہ جمال ہے۔ تمہارا جمال بھائی“ لالی نے زور و شور سے سر ہلا کر جمال بھائی کی انگلی تھام لی تھی۔

”جمال بھائی! آپ میرے ہو“ لالی جلد گاتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دور

جاسن کے پیڑ کے نیچے حسنہ بیٹھی کھیل رہی تھی۔ اس منظر کو اس نے کافی حاسدانہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”جمال بھائی تو میرا ہے“ جب رہانہ گیا تو حسنہ بول ہی اٹھی۔

”نہیں، جمال بھائی اب میرا ہے“ لالی بھی حسنہ کی ٹکڑ کا تھا۔ پناخ سے بولا۔

”میں تمہیں ماروں گی“ حسنہ کا جلال عود آیا۔

”بری بات بیٹا!“ جمال کی اماں رسوئی سے باہر نکلیں ”جمال تم دونوں کا بھائی ہے“

اماں کی بروقت مداخلت نے اس وقت تو بات دبا دی تھی مگر ”تاریخ گواہ“ تھی حسنہ

نے اول روز سے جولالی سے شریکا لگایا تھا۔ وہ آج تک قائم و دائم تھا۔

حسن آرا کو تھانے دارنی کا خطاب محلے کے ان معصوم بچوں نے دیا تھا جو اکثر اس

کے عتاب کا نشانہ بن جاتے تھے۔ اس کی غصیلی فطرت کی بنا پر بچوں کی ماؤں نے اور پھر آہستہ

سب ہی نے ”تھانے دارنی“ کے لقب سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

”لور لور شہر کی سڑکیں ناپ کر، ویلے مسنڈوں کے ساتھ آوارہ گردی کر کے رات کو گھر

آجایا کرو اور آتے ساتھ ان بے حیا اچھلتی کودتی باندھیوں کا دیدار کرنے بیٹھا جایا کرو“

حسنہ بڑے جارحانہ تیور لیے اماں کے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔ رات کے سوا

سات بجے تھے۔ جمال ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ لالی نے کھڑکی میں اترتی شام کو دیکھ کر ٹھنڈی

آہ بھری ساتھ ہی ریموٹ کا بٹن دبا کر چینل بدل دیا۔

”میرے منہ میں خاک، کہیں آپ کی نظر تو نہیں کمزور ہو گئی۔ جمال بھائی سے کہتا

ہوں کسی اچھے سے ڈاکٹر سے وقت لیں۔ میں تو ملکی حالات سے باخبر رہنے کے لیے خبریں سن رہا

تھا۔ یکا یک آپ کو یہ ترتر منہ بگاڑ کے انگریزی میں خبریں پڑھتی ڈیسنٹ حسینہ ”باندھی“ دکھائی

دینے لگی ہے۔ اللہ آپ کے ان خوب صورت دیدوں پر رحم کرے“

”مجھے تمہاری اس بانگی جوانی پر رحم آجاتا ہے..... میرے ہاتھ سے تم ضائع ہو جاؤ

گے ایک دن لالی، بالی اور چائے کی ٹوٹی پیالی“ حسنہ غصے سے لال ٹماٹر ہو گئی۔

”بادرچی خانے میں کھانے کے اور بھی لوازمات موجود ہوں گے آپ کو بھی لال

مرچیں ہی چبانے کو ملتی ہیں“ لالی نے تاسف سے دائیں بائیں سر ہلایا۔

”میں تمہارے کسی دن اتنے ٹوٹے کر دوں گی کہ چینل کوو کو بھی نہیں ملیں گے“ حسنہ

سر سے پیر تک سلگ اٹھی ”سارے وجود کے ٹوٹے کر دیجئے گا صرف اس دل کو کچھ مت کہئے گا“

لالی نے گویا گڑگڑا کر التجا کی۔

”کیوں؟“ غصے میں حسنہ نے خواہ مخواہ پوچھ لیا۔

”اس معصوم دل میں یونیورسٹی کی حسینائیں اور ٹی وی انیا کائیں رہتی ہیں“

”تمہارے اس فتنے دل کو بچکی کے پاٹوں میں رکھ کر پیسوں کی“ حسنہ آگ بگولہ ہواٹھی۔

”توبہ توبہ اتنا بے حیا، جمال کو بتاؤں گی۔ اس پرکزی نگاہ رکھے“ وہ سوچتے ہوئے

لالی کو بغور دیکھتی رہی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں جناب!“ لالی معنی خیزی سے کھنکارا۔ حسنہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

”ہونہہ، نجانے خود کو سمجھتے کیا ہو“

”آپ کی طرح خود کو تھانے دار تو ہرگز نہیں سمجھتا“ لالی جوابی حملے کرنے میں کہاں

چوکتا تھا۔

”چار دن ہوٹل میں رہے ہو تو گھر میں بھی سکون رہا تھا اتنے دن“ حسنہ جلدلاتے

ہوئے ذہن پر زور ڈال کر یہ سوچنے لگی تھی کہ وہ اس لالی کے بچے کو آخر کیا کہنے کے لیے آئی تھی

اور پھر فضول سی تکرار میں دماغ الجھانے لگی۔

”آپ کے ہوتے ہوئے کم از کم اس گھر میں سکون تلاش کرنا ناممکن ہے“ لالی نے

دہائی دی۔

”میں تم سے کہنے آئی تھی۔ اماں کی دوائی کیوں نہیں لائے؟“ بالآخر حسنہ کو لالی کے

منہ لگنے کا اصل مقصد یاد آ گیا تھا۔

”جمال بھائی لیتے آئیں گے“ لالی نے اطمینان سے بتایا۔

”تم صرف روٹیاں توڑنے کے لیے ہو“ حسنہ تنفر سے بولی۔

”کہہ سکتی ہیں“ اس ڈھپٹ پر کون سا اثر ہوتا تھا۔ حسنہ ہر قسم کی بے عزتی کر کے دیکھ

چکی تھی۔ اسی بل جمال بھی اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ جھکن تھی۔ وہ ٹرک کے

ساتھ اوکاڑہ گیا تھا۔ ابھی ابھی واپسی ہوئی تھی۔ یہ ٹرک منافع کے ساتھ لوٹا تھا۔ سو اسی لیے

تھکاوٹ کے باوجود اک سرشاری کی کیفیت تھی جو رگ و جاں کو سرور کر رہی تھی۔

”اماں کی دوائی لائے؟“ حسنہ نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”دوائی بھول سکتا ہوں“

”روٹی لگاؤں“ حسہ نے اس کی جھکن کے خیال سے نرمی سے پوچھا تھا۔ اس نرم لہجے اور انداز پر لالی عیش عیش کراٹھا۔

”روٹی کہاں لگانی ہے؟ کیا تندو میں؟“ جمال نے حسہ سے بھی زیادہ نرم لہجے میں پوچھا۔

”نہیں تو۔ روٹی میں تو بے پروا چکی ہوں“

”تو یوں کہو ناں۔ دسترخوان لگانا ہے“ جمال نے بغیر جتلے اپنے ازلی نرم لہجے

میں سمجھایا۔

”تم بھی نا جمال بھائی!“ حسہ، لالی کے سامنے خفت سے سرخ پڑ گئی تھی۔

”ہونہ، مجھے پتا ہے“ وہ حسہ ہی کیا جو کچھ سمجھنے کی کوشش کرے“

”خاک پتا ہے“ لالی کی زبان پر پھر سے کھلی ہونے لگی۔

”ہاں..... ہاں، کچھ نہیں پتا تم دونوں تو شکر ہے عالم فاضل ہونا“ حسہ غصے سے

پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔

پھوپھو صبح صبح اسے زینر اباجی کے گھر چھوڑ گئی تھیں۔ زینر اباجی کی آج بھی طبیعت ٹھیک

نہیں تھی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی تھیں اور خرابی طبیعت کے باوجود کالج روانہ ہو گئی تھیں۔

سومیہ دونوں بچوں کے ہمراہی وی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ وہ بچوں کو چھوٹے چھوٹے

کھیل بتا رہی تھی۔ انہیں پونٹرنسار ہی تھی۔ حالانکہ بچے کافی چھوٹے تھے۔ ابھی کچھ بھی سمجھ نہیں

سکتے تھے۔ بچوں کے ساتھ مصروفیت میں کافی وقت بیت گیا تھا جب ٹیلی فون کی گھنٹی نے سومیہ کو

اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ پھوپھو کا فون تھا۔ وہ گھر پہنچ گئی تھیں اور سومیہ سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ

اس وقت کیا کر رہی ہے۔

”بچوں کے پاس بیٹھی ہوں۔ دونوں غنودگی میں ہیں کچھ دیر تک سو جائیں گے“

”بچے سو جائیں گے تو پھر تم کیا کرو گی؟“ ایئر بیس سے پھوپھوں کی آواز ابھری۔

”یہ تو آپ بتائیں۔ میں کیا کروں“ وہ معصومیت سے بولی۔

”تم یوں کرو“ پھوپھو نے سوچتے ہوئے کہا۔

”واٹشنگ مشین میں دیکھو، اگر کپڑے ہیں تو دھولو۔ الماری میں دیکھنا استری کرنے

والے کپڑوں کا بھی ڈھیر رکھا ہو گا۔ دل کیا تو استری کر لینا۔ خود کو مصروف رکھنا بیٹا! میں تمہیں اس

لیے چھوڑ کر آئی ہوں کہ کچھ تو ماحول بدلے۔ اپنے گھر میں ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ کہیں آتی جاتی نہیں ہو“

”ہمارے ہے ہی کون پھوپھو! جن کے گھر آنا جانا لگا رہے۔ باجیاں ہیں تو وہ بھی

انتہائی مصروف۔ نجانے زینر اباجی کب تک آئیں گی“ سومیہ سوئے ہوئے بچوں کو دیکھتے ہوئے

آہستگی سے بولی۔

”دو بجے تک آجائے گی۔ گھبرانامت“ پھوپھو نے نرمی سے تاکید کی۔“ اور کچھ کھا

بھی لینا بھوکی مت بیٹھی رہنا“

”جی اچھا“ سومیہ کا دل بے حد برا ہو رہا تھا۔ فون رکھنے کے بعد وہ بے دلی سے بیٹھی

رہی۔ زینر اباجی کے گھر وہ آج سے پہلے کبھی تنہا نہیں آئی تھی۔ ہمیشہ پھوپھو ساتھ ہوتی تھیں۔

پہلی مرتبہ پھوپھو نے اسے تنہا زینر اباجی کے گھر چھوڑا تھا اور سومیہ کے دل میں خواہ مخواہ کے

دوسے آرہے تھے۔ بے معنی سوچوں سے چھٹکارے کی غرض سے اس نے مشین لگا کر کپڑے

دھونے شروع کر دیئے تھے۔

باجی کی کام والی صبح سویرے آجاتی تھی۔ بچوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری بھی اسی کی

تھی۔ مگر آج شاید وہ چھٹی پر تھی اور شاید اسی لیے پھوپھو اسے یہاں چھوڑ گئی تھیں۔

جب تک کپڑوں کی دھلائی ہوتی رہی، وہ ساتھ ساتھ کپڑے بھی استری کرتی رہی۔

تھوڑے تھوڑے دیر بعد وہ کمرے میں جھانک کر بچوں کو بھی ایک نظر دیکھ آتی تھی۔ بچے ابھی تک سو

رہے تھے۔ شاید ماسی نے انہیں اتنی دیر تک سنانے کی عادت ڈال رکھی تھی۔

وہ باجی کے بیڈروم میں استری شدہ کپڑے رکھ رہی تھی جب ڈور بیل بج اٹھی۔

”ہائے..... یہ کون آگیا“ سومیہ حد درجہ خوف زدہ ہو گئی۔ بیل متواتر بج رہی تھی۔

سومیہ اس خدشے کے پیش نظر دروازے تک آئی تھی کہ مسلسل بجتی گھنٹی کی آواز سے بچوں کی نیند

نہ خراب ہو۔

”کون؟“ لاکھ چاہنے کے باوجود وہ اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں پاسکتی تھی۔

”میں ہوں سہیل۔ دروازہ کھولو“

”سہیل بھائی، اس وقت“ سومیہ نے حیران نظروں سے گھڑی کی طرف دیکھتے

ہوئے دروازہ کھول دیا۔

”سومیہ تم“ سہیل بھائی جو بہت غلٹ میں دکھائی دے رہے تھے۔ سومیہ کو اپنے گھر میں دیکھ کر ٹھک گئے۔

”جی“ وہ محض سر ہلا کر رہ گئی تھی۔ اپنی اس وقت موجودگی کا بھلا کیا جواز پیش کرتی کہ پھوپھو اس کا ماحول بدلنے کی بنا پر یہاں چھوڑ کر گئی ہیں۔

”کس کے ساتھ آئی ہو؟“ سہیل بھائی نے اپنی حیرت پر قابو پالیا تھا۔

”پھوپھو چھوڑ کر گئی ہیں..... ماسی آج چھٹی پر تھی۔ بچے تباہ تھے، اس لیے“ سومیہ نے جھجکتے ہوئے وضاحت کی۔

”زیراکو تمہاری آمد کے بارے میں علم ہے؟“ وہ کچھ سوچتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”شاید، پھوپھو نے بتایا تو ہوگا“

”بچے کہاں ہیں؟“ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ذرا رک کر پوچھنے لگے۔

سومیہ اپنی جھونک میں سہیل بھائی کے پیچھے چل رہی تھی۔ ان کے رکنے پر اس کا سر ان کے کندھے سے ٹکرایا۔

”سوری“ وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

”اٹس اوکے“ انہوں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو بچے بیڈ پر سوائے ہوئے نظر آئے۔

وہ کپڑوں کے ڈھیر سے بچتے بچاتے بیڈ تک گئے تھے۔

”یہ تم کن کاموں میں الجھی ہوئی ہو“ سہیل بھائی نے کافی ناراضی سے کپڑوں کی اتنی بڑی گٹھری کی طرف دیکھا۔ ”جس کا کام ہے وہ خود آ کر کر لے گی“

”کپڑے استری تو ہو گئے ہیں..... بس الماری میں سیٹ کرنے ہیں“ سومیہ نے

سر جھکا کر پیٹنگ شدہ کپڑوں کو اٹھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ چپکے سے چھوٹی سی

گٹھری پر نگاہ بھی ڈال لیتی تھی جو کہ بیڈ سائیز ٹیبل پر رکھی تھی۔ ہر دفعہ غیر ارادی نظر سہیل بھائی کی طرف بھی اٹھ جاتی۔ وہ گڑیا کے ساتھ ہی لیٹ چکے تھے اور دھیرے دھیرے اپنی کینٹیاں دبا

رہے تھے۔ سومیہ نے کچھ غور کیا تو خیال آیا۔ سہیل بھائی کی آنکھیں بہت سرخ تھیں۔ چہرہ بھی لال ہو رہا تھا۔ شاید ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تب ہی وہ اس وقت گھر چلے آئے تھے۔ سومیہ

نے جلدی جلدی کام سمیٹا اور باہر آ گئی۔

گٹھری نے تین بجائے تو وہ وحشت زدہ سی ہو گئی۔ باجی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔

جبکہ سومیہ کو فکر اور بھوک نے ادھ مواسا کر دیا تھا۔ کئی مرتبہ پھوپھو کو فون کرنے کے بعد وہ مایوس سی قالین پر بیٹھ گئی تھی۔ بیل تو مسلسل جارہی تھی مگر پھوپھو بچوانے کہاں تھیں۔ شاید سو گئی تھیں یا پھر کسی کام کے سلسلے میں گھر سے باہر نکلی تھیں۔

”کچھ دیر بعد گڑیا کے رونے کی آواز سنائی دی تھی۔ پھر سہیل بھائی بچی کو اٹھا کر باہر نکل آئے۔ اسے قالین پر بیٹھا دیکھ کر پہلے تو وہ ٹھنک گئے پھر بری طرح شرمندہ ہو گئے تھے۔

”آم سوری سومیہ! مجھے تو خیال نہیں رہا تھا کہ تم بھی یہاں ہو۔ میری طبیعت خراب تھی۔ دوا کھا کر سو گیا تھا۔ تم ہی جگا دیتیں۔ کچھ گھر میں موجود ہے یا کھانا منگوا لوں۔ تم بھی ضرور بھوکی ہوگی۔ مجھے خود سے خیال ہی نہیں آیا“

وہ بولتے ہوئے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئے۔ گڑیا فرش پر منتقل ہو چکی تھی۔ سومیہ اس کے ریں ریں کرنے سے پہلے دودھ کی بوتل اٹھا کر لے آئی تھی۔ سہیل بھائی فون سے فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئے اب ان کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر لگ رہی تھی۔

”تم جوس وغیرہ پی لیتیں۔ فروٹ بھی فروج میں رکھا ہوگا۔ یقیناً کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ میں بھی بلا کا بھلکھو ہوں“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئے۔ سہیل بھائی کو میز پر پلیٹیں رکھتے دیکھ کر مردوتا سومیہ کو کہنا پڑا۔

”میں برتن لگاتی ہوں سہیل بھائی! آپ پلیز بیٹھ جائیں“

”اٹس اوکے، میں کر لیتا ہوں۔ یہ کون سا پہاڑ توڑنے سے بڑا کام ہے۔ تم نے پہلے ہی خواہ مخواہ کپڑوں کے ڈھیر دھوئے اور استری کئے ہیں۔ ماسی نے کر لینا تھے۔ کبھی کبھار آتی ہو اور فضول کاموں میں لگی رہیں“

”میں فارغ ہی تھی اور کیا کرتی“ سومیہ نے پھر سے گٹھری کی طرف دیکھا۔ چار بجنے میں کچھ ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔

اسی پل ڈور بیل بجنے لگی۔ سہیل بھائی باہر نکل گئے۔ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں بڑا سا شاپر تھا۔ جس کے اوپر ”فرائی چکس“ بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔ انہوں نے شاپر سومیہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا سومیہ خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ ڈرم اسٹیکس، کباب، ایک رول اور چھپس پلیٹوں میں نکال کر لائی تو سہیل بھائی گڑیا کے ساتھ مصروف تھے، نفی بھی اٹھ کر آ گیا تھا۔ سہیل بھائی بچوں کو چس کھلاتے ہوئے گاہے گاہے سومیہ کی طرف بھی دیکھ رہے



”تم نے اسٹڈیز کیوں ڈراب کر دی“

”بس ایسے ہی، ہمیشہ کی طرح اسے کوئی جواز نہیں سوجھا تھا۔

”ایسے ہی اپنا فیوچر داؤ پر لگا دیا۔ تمہیں آگے بڑھنے کا شوق نہیں تھا؟ کالج جاتیں، فرینڈز بناتیں، رنگوں سے کھیلتیں، کتابوں سے باتیں کرتیں۔ کالج کی دنیا تو بہت رنگین ہوتی ہے۔ بڑا سنہرا دور ہوتا ہے جو تمام عمر اچھی یاد کی طرح ذہن میں محفوظ رہتا ہے۔ لوگوں سے ملنا، باتیں کرنا، اپنے خیالات کا اظہار کرنا، کچھ مقابل کی باتوں کو سننا، رویوں کو سمجھنا، لہجوں کو جانچنا، نگاہ کے مفہوم جاننا، چہرے پڑھنا۔ شعور کی انگلی کو پکڑا ہوتا تو آج تم کسی مقام پر پہنچی ہو تیں کیا تم نے آج تک اپنے اندر کسی کی کوئیس تلاش؟“ سہیل بھائی کا لہجہ کس قدر دھیمہ اور پراثر تھا۔ سومیہ ان کے لہجے کے بہاؤ میں بہنے لگی۔

”سومیہ.....!“ سہیل بھائی نے گلا کھنکھار کے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ گڑیا اور نفی کھیل میں مصروف ہو چکے تھے۔

”جی“ وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے آہستگی سے بولی ”میرے اندر صرف ایک کی نہیں۔ ایک طویل لسٹ ہے، کیا کیا بتاؤں۔ اعتماد کی کمی، اخلاقی کی کمی، سب سے بڑھ کر تعلیم کی کمی۔

”اخلاق تو تمہارا بہت اچھا ہے..... اور تعلیم کم ہے تو کیا ہوا۔ بس دماغ کی بند کھڑکیوں کو کھول لو“ انہوں نے نرم لہجے میں بڑی گہری بات کی تھی۔

”یہ کام بھی میرے اختیار میں نہیں۔ میرے اندر سستی اور بیزاری کوٹ کوٹ کر بھری ہے“ سومیہ نے بے بسی سے بتایا۔

”یہ تو اور بھی پریشان کن صورتحال ہے تمہارے اندر بیزاری اس ”گھٹن“ کی وجہ سے ہے جسے کوئی روزن کوئی دریچہ نہیں مل رہا“

”کوئی روزن غلط بھی کیسے“ سومیہ نے خود کو اور بھی بے بس پایا۔ ایک تو وہ اپنے دماغ میں چھڑی جنگ کسی سے بھی شیر نہیں کر سکتی تھی۔ ایک سگی، ساتھی کا ہونا کس قدر ضروری ہوتا ہے۔ سومیہ کو اس بل اپنا آپ اور بھی تنہا اور اداس لگا۔

”شادی کر لو“ انہوں نے اطمینان سے ایک حل پیش کیا ”تمہارا ماحول ہی نہیں۔ یہ گھٹن زدہ ذہن ہی نہیں، تم ٹوٹلی چیخ ہو جاؤ گی“

روشنی سی چار سو ہے

تھے۔ جو خاموشی سے کھا رہی تھی۔ وہ کھا چکی تو سہیل بھائی نے اس سے کہا۔

”زحمت نہ ہوتو مجھے چائے بنا دو“

”ابھی بنا کر لاتی ہوں“ سومیہ خالی پلیٹیں اٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ چائے کاگ اٹھا کر باہر آ رہی تھی تو اس نے سہیل بھائی کو فون پر مصروف پایا۔ اس نے گنگ سہیل بھائی کے سامنے رکھ دیا اور خود گڑیا کو گود میں اٹھا کر سہیل بھائی کے فون بند کرنے کا انتظار کرنے لگی۔

”باجی کب تک آئیں گی“ سومیہ نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بالآخر پوچھ ہی لیا ”اس کی واپسی تو رات تک ہوگی۔ شاید گیارہ بارہ بجے تک آئے“ سہیل بھائی نے موبائل میز پر رکھتے ہوئے بتایا۔

”اتنی دیر سے کیوں؟“ وہ الجھ کر بولی۔

”کیا تمہیں نہیں پتا“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں“ سومیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”کمال ہے..... تمہیں آنٹی نے بھی نہیں بتایا“ وہ خود بھی حیران رہ گئے۔

”نہیں“

”زیر اتو بچیوں کے ٹرپ کے ساتھ اسلام آباد گئی ہے“ وہ بتا رہے تھے۔

”اچھا“ سومیہ ششدر رہی تو رہ گئی ”پھوپھو نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”یہ تو پھوپھو کو ہی پتا ہونا چاہئے“ وہ ہنس پڑے تھے۔ ”تمہارے چہرے پر کیوں

ہوائیاں اڑنے لگی ہیں“

”مجھے گھر جانا ہے“

”تو میں ابھی چھوڑ آتا ہوں“ وہ نرمی سے بولے۔

”مجھے اسی وقت جانا ہے“ سومیہ بے چینی سے ابھی۔

”بابا! ابھی چھوڑ آتا ہوں۔ چائے تو پی لینے دو“ انہوں نے سومیہ کو تسلی دینا چاہی۔

”مجھے آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ انکار کر دیتی، زبردستی تھوڑی تھی“ وہ سوچوں کے تانوں

بانوں میں الجھنے لگی۔

”ایک بات تو بتاؤ سومیہ!“ وہ اس کا دھیان بنانے کی غرض سے بولے۔

”جی“ سومیہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کس سے؟“ سومیہ نے ایک بے تکا سوال بے دھیانی میں کر دیا۔

”اگر تو یہ سامنے کھلتے دو بچے نہ ہوتے۔ یا پھر مجھ پر شادی شدہ کا لیل نہ لگ چکا ہوتا تو میں اپنا پر پوزل تمہارے سامنے پیش کر دیتا“

سہیل بھائی نے اطمینان سے کہا تھا۔ سومیہ جو سر جھکائے بیٹھی تھی ایک دم غصے سے لرز کر سہیل بھائی کی طرف دیکھنے لگی سومیہ کو ان سے اس بے باکی کی امید نہیں تھی۔ وہ غصے میں کچھ بولنا چاہتی تھی مگر سہیل بھائی کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ جو کہ بہت ہی سادہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر اجلی سی مسکان پھیلی تھی۔

”پگلی لڑکی! تم بہت معصوم ہو جھلی! یہ اللہ کی اتنی وسیع دنیا ہے اور اللہ پاک نے تمہارے جوڑ کا آدمی بھی ضرور بنایا ہوگا اور وہ جو کوئی بھی ہوگا۔ بہت ہی خوش قسمت ہوگا۔ ایسے سچے موتی جیسے قیمتی لوگ نصیب والوں کے حصے میں آتے ہیں“ انہوں نے شفقت سے کہا۔

”میں ایسی تعریفوں کے قابل نہیں ہوں۔ اتنی عام سی، معمولی سی تو ہوں“ وہ احساس کمتری کا شکار نہیں تھی مگر جھوٹ بولنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اگر اس کی شکل کچھ اچھی ہوتی تو پھوپھو کے سر سے اس کا بوجھ کب کا اتر چکا ہوتا۔ وہ بے چاری اس کے غم میں گھل گھل کر آدھی ہو رہی تھیں۔

”تم میں اتنی خوبیاں ہیں..... جو کہ خود تمہارے علم میں بھی نہیں“ سہیل بھائی نے اپنی طرف لپکتی گڑیا کو گود میں اٹھا کر کندھے سے لگا لیا۔

”آپ مجھے جانتے ہی کتنا ہیں“ وہ جھینپ کر مسکرا دی۔ اپنی تعریفوں پر اسے ہنسی آرہی تھی۔

”تم حیران ہوگی۔ میں تو کافی عرصے سے تمہارا مطالعہ کر رہا ہوں“

”اچھا“ سومیہ کی آنکھیں خیر سے پھیلتی چلی گئیں ”پھر کیا جانا میرے بارے میں؟“

”یہ کتاب جس کا عنوان سومیہ حسن مراد ہے جتنی معصوم، شفاف اور واضح ہے اسی قدر الجھنوں کا شکار بھی..... اختتام کے بعد بھر پور تبصرہ کروں گا۔ تب تک انتظار کرو“ وہ سادہ سے انداز میں مسکرا دیئے ”تم بچوں کو کپڑے پہنچ کر داد پھر میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں“

سہیل بھائی اٹھ کر کمرے میں چلے گئے تھے۔

وہ بچوں سمیت باہر نکل رہے تھے جب پھوپھو سامنے سے آتی دکھائی دیں۔

”آپ کہاں رہ گئی تھیں“ سومیہ پھوپھو کو دیکھتے ہی پھٹ پڑی۔ پھوپھو نفی کو اٹھا کر چومتے ہوئے مسکرا دیں۔

”مجھے یقین تھا کہ میری بیٹی شدید غصے میں بھنارہی ہوگی“ پھوپھو نے پیار سے اسے ساتھ لگایا ”بور تو نہیں ہوئی بچوں کیساتھ اچھا وقت گزرا ہوگا۔“

”میں نے آپ کی بیٹی کو بور تو نہیں ہونے دیا“

”تم کب آئے؟“ پھوپھو اب داماد کی طرف متوجہ ہوئی تھیں ”تم نے تو آٹھ بجے آنا تھا“

”میری آج نائٹ ڈیوٹی ہے۔ ابھی کچھ دیر تک نکلوں گا“

”او..... اچھا، اچھا“ صاف پتا چل رہا تھا پھوپھو کو سہیل بھائی کی موجودگی ناگوار

گزری ہے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ آج گھر آجائیں گے۔ خرابی طبیعت کی وجہ سے انہیں

ہسپتال سے گھر آنا پڑا تھا۔ ورنہ پھوپھو سومیہ کو کبھی تنہا رہنے کی اجازت نہ دیتیں۔ وہ سومیہ کے

معالے میں بہت حساس تھیں۔

”تم خیر سے جاؤ، میں اور سومیہ بچوں کے پاس ہیں۔“ پھوپھو نے نرمی سے کہا۔

سہیل بھائی کے جانے کے بعد پھوپھو بچن میں کھس گئی تھیں۔ رات کے لیے سالن

پکانا تھا۔ سومیہ اب پرسکون سی بچوں کے ساتھ کھینے میں مصروف ہو گئی تھی۔ پھوپھو کی موجودگی

میں ہمیشہ اسے تحفظ کا احساس رہتا تھا۔

پھوپھو گھنٹہ بھر بعد بچن سے فارغ ہو کر باہر نکلی تھیں۔ اتنی دیر تک بچے سوچے تھے۔

پھوپھو نے سومیہ سے پوچھا۔

”روٹی بنا دوں؟ یا کچھ دیر بعد کھاؤ گی“

”ابھی بھوک نہیں ہے“ سومیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ حیرت سے سوچ رہی تھی کہ پورا

دن اسے ہلکا سا سردرد بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ پہلے کی نسبت آج وہ خود کو فریش محسوس کر رہی تھی۔

سب سے زیادہ حیرانی اس بات پر تھی کہ اسے نیند کے جھونکوں نے نہیں ستایا تھا ورنہ تو ہر وقت ہی

ذہن غنودگی کی زد میں رہتا تھا۔ سانس بھی ہموار چل رہی تھیں۔ یعنی آج کے دن وہ خود کو ہر لحاظ

سے فٹ محسوس کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دم وہ اور بھی ہلکی پھلکی سی ہو گئی۔ اپنے مزاج کی اس

تبدیلی نے سومیہ کو درط حیرت میں ڈال کر دیا تھا۔

”سوی! کیا سوچ رہی ہو“ پھوپھو نے کب اس کے قریب آکر بیٹھ گئی تھیں۔ سو میر کو قطعاً احساس تک نہیں ہوا۔

”کچھ نہیں“ وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

”سارا دن کیا کرتی رہیں؟“ پھوپھو نے ناقابل فہم سے انداز میں پوچھا۔ سو میرہ تفصیل سے بتایا۔

”سہیل کب آیا تھا؟“ انہوں نے لہجے کو سرسری سا بنا کر پوچھا۔

”شاید دو بجے کے قریب“ سو میرہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے خبر نہیں تھی۔ سہیل گھر آجائے گا۔ ورنہ میں تمہیں کبھی نہ بھیجتی“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں گویا ہوئی تھیں۔

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی“

”ہونہر، پتا نہیں“ پھوپھو نے سر جھٹکا، ”کوئی بات تو نہیں کی سہیل نے؟“ کچھ دیر

سوچنے کے بعد پھوپھو نے بے چینی چھپاتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

”کیسی بات؟“ سو میرہ نے حیرانی سے پھوپھو کی طرف دیکھا۔ نجانے کون سی بات

پھوپھو پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ سہیل بھائی نے تو کافی ساری باتیں کی تھیں۔ مگر ان بے ضرر باتوں کی وضاحت بھلا کیا کرتی۔

”کسی بھی قسم کی فضول بات؟“ حالانکہ وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ ان کا یہ

بکس قدر تہذیب یافتہ اور شائستہ مزاج ہے مگر مرد کا بھلا کیا بھروسہ کسی بھی وقت بدل سکتا ہے۔ اپنے خدشات سو میرہ تک پہنچا نہیں سکتی تھیں۔

”نہیں، سہیل بھائی بھلا فضول بات کیسے کر سکتے ہیں“ سو میرہ نے شدت سے نفی میں

سر ہلایا۔

”ہاں، یہ بات تو ہے“ پھوپھو نے تائیدی انداز میں ہنکارا بھرا ”خیر چھوڑو آئندہ

احتیاط کروں گی۔ میری بیٹی! تم سیدھی سادی ہو۔ مجھے خود ہر پہلو پر غور کرنا چاہئے تھا“

تقریباً گیارہ بجے کے قریب زنیہر اباجی گھر آ گئی تھیں۔ سو میرہ رات رکنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”پھوپھو! گھر چلیں“ اس نے کوئی تیسری مرتبہ پھوپھو کو ٹھوکا دیا۔

”اتنی رات کو..... صبح چلے جانا“ زنیہر اباجی رتن سمیٹتے ہوئے بولیں۔

”تو اور کیا۔ اس پہر میں تو کبھی تمہیں ہمراہ لے کر گھر سے نہ نکلوں“ پھوپھو جمائی

روکتے ہوئے سونے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔

”سو میرہ بھی دودھ کا گلاس ختم کر کے پھوپھو کے پیچھے چلی آئی۔ پھوپھو سونے کی

تیار یوں میں بھی تھیں اور نجانے کیوں سو میرہ کو بھی پلنگ پر لیتے ہی نیند نے اپنی پلیٹ میں لے لیا۔

”سو میرہ کے لیے کوئی مناسب رشتہ دیکھیں امی“

نجانے رات کو کون سا پہر تھا جب ہلکی ہلکی سرگوشی نما آوازوں نے سو میرہ کو جگا دیا تھا۔

”دیکھ تو رہی ہوں..... کہیں بات بنے تب نا“ پھوپھو کی آواز میں بے بسی نما بیزاری

تھی۔ آئے دن آنے والے مہمانوں سے پھوپھو بے چاری بھی شاید عاجز آ چکی تھیں۔

”بات بنتی نہیں بنائی جاتی ہے“ زنیہر اباجی کا انداز نا قابل فہم تھا۔

”کیا مطلب؟“ پھوپھو کو غصہ آ گیا۔

”آپ اگر ہر رشتے میں معمولی سی کمی دیکھ کر رتبجیکٹ کرتی رہیں گی تو پھر سو میرہ کی

شادی کا خیال بھی دل سے نکال دیں“

”تو کیا بازو سے پکڑ کر گھر سے دھکیل دوں۔ ایسے ویسے کسی کلرک، ڈپنسر کے ہاتھ

میں بچی کا ہاتھ تھما دوں“ پھوپھو کو اور بھی غصہ آ گیا۔

”پچھلے دنوں جو سہیل کے ایک کولیگ ڈاکٹر کا پر پوزل آیا تھا اسے خواہ مخواہ آپ نے

رتبجیکٹ کیا تھا۔ سہیل بھی باتوں باتوں میں طنز کرتے رہتے تھے کہ شاید آئی سو میرہ کی شادی کرنا

ہی نہیں چاہتیں“ زنیہر اباجی کی آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا۔

”سہیل نے اس طرح کہا؟“ پھوپھو کو گویا یقین نہیں آیا تھا ”اس سنبھے ڈاکٹر کی پانچ

چالاک بہنوں کے بیچ اپنی بچوں کو کھپا ڈالتی“

”اگر آپ اسی طرح ذرا ذرا سی بات پر نکتہ چینی کر کے اچھے بھلے رشتوں کو جواب دیں

گی تو سہیل کے علاوہ ارد گرد رہنے والے لوگ بھی پوچھنے لگیں گے“

باجی نے تحمل سے سمجھانا چاہا۔

”کون سے لوگ؟“ پھوپھو چونکیں۔ سو میرہ نے سختی سے آنکھیں میچ لی تھیں تاکہ پھوپھو

اور باجی اسے سوتا ہی سمجھتی رہیں۔

”کیونہ آئی..... سمیرا کی ساس“ باجی نے ناگواری سے بتایا ”وہ بھی پچھلے دنوں میں میری عیادت کے لیے آئی تھیں تو پوچھ رہی تھیں“

”اس عورت کو تو چسکے لینے کی لت لگ چکی ہے“ پھوپھو ناراضی سے بولیں ”ایسی بھی بھاری نہیں میری بیٹی مجھ پر“ سومیہ بے بسی سے آنکھیں موندے اس محبت اور اپنائیت کو دل میں جذب کرتی رہی۔

پھوپھو کے علاوہ اس کا بھری دنیا میں تھا ہی کون۔ اس نے اپنا ہر رشتہ پھوپھو میں ہی تلاشا تھا۔

”سومی! میری بیٹی نیند نہیں آرہی“ سومیہ کی پلکوں کی لرزش نے شاید پھوپھو کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا ”ننی جگہ میں سومیہ کو نیند کبھی نہیں آئے گی۔ میں نے غلط ہی کیا ہے۔ رات رکنے کی بھلا کیا ضرورت تھی“

پھوپھو نے محبت سے اس کی پیشانی پر ذرا سا آگے ہو کر ہاتھ رکھا تھا۔ ناچار سومیہ کو آنکھیں کھول کر تانا پڑا کہ وہ کب سے جاگ رہی ہے۔ وہ نہ بھی بتاتی تب بھی پھوپھو جانتی تھیں کہ سومیہ آنکھیں بند کیے سوتی بن رہی ہے۔

☆☆☆

لالی لمبے سے بانس پر کپڑا لپیٹے جالے اتار رہا تھا۔ پھر میز پر چڑھ کر پنکھا صاف کرنے لگا۔

”تھانے دارنی جی! مجھ سے عالم بالا میں جو خطائیں ہوئی ہیں۔ میری روح نے آپ کی روح کو جو ”اوپر“ خدا نخواستہ تکلیف پہنچائی ہے۔ طعنے دیے ہیں طفر کئے ہیں۔ ان سب کا بدلہ ایک ہی دفعہ لے لیں پلیز! کیوں آئے دن سولی پر چڑھادیتی ہیں“

لالی کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ جمال نے ہنستے ہوئے سر جھکا اور اخبار چہرے کے سامنے پھیلایا۔

”تم سولی پر نہیں میز پر کھڑے ہو“ اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے لالی کو گھورا۔ ”میری روح نے آپ کا کیا لگاڑا تھا جو آپ اوپر سے ہی میرے ساتھ شریکا لگا کر آئی ہیں“

”تم بھسکی ہوئی بدروح ہو“ وہ خربوزے کھاتے ہوئے برجستہ بولی۔

”ایک بات کہوں۔ اگر آپ کے صحت مند وجود کو نظر نہ لگے تو“ لالی نے شرارت سے

آنکھیں نہ کھلیں۔ جمال نے آنکھوں کے سامنے سے اخبار ہٹا کر لالی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب دونوں ”جنگ“ کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔

”بکو.....“ حسہ خربوزوں کی طرف متوجہ تھی۔

”آپ کا اور عابدہ پروین کا سائز ایک ہو رہا ہے۔ مت اتنا کھایا کریں۔ رحم کریں

اپنے اس پہاڑ جتنے وجود پر“ لالی چھلانگ لگا کر نیچے اتر تھا۔

”تم خود کیا ہوا افتخار ٹھا کر!“ حسہ جلیلا کر بولی۔

”میں افتخار ٹھا کر ہوں“ لالی کے صدمے کی شدت سے آواز پھٹ گئی۔

”تو اور کیا ہو“ حسہ نے نخوت سے کہا۔ دوسروں کو دیکھ کر جلنا چھوڑ دو تو تھوڑا سا ماس

تم پر بھی چڑھ جائے گا“

”مجھے چربی خود پر چڑھا کر کوئی ایوارڈ نہیں لینا“ لالی مزے سے بولا۔ اسی پل کمرے

سے اماں کی آواز آئی تھی۔ بہت سالوں سے اماں صرف بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ انہوں نے بولنا

بھی بہت کم کر دیا تھا۔ ایک ہزار ایک بیماری کیساتھ جنگ کرتے کرتے بالآخر وہ تھک چکی تھیں۔

یہ تو حسہ تھی جس نے اپنی اکلوتی پھوپھی کو سنبھال رکھا تھا۔ ان کی تیمارداری، دیکھ بھال، کھانا

پلانا، نہلا نا دھلانا سب حسہ کے ذمہ تھا اور جمال اسی لیے حسہ کا ہمیشہ احسان مند رہا تھا۔

”کیا بات ہے پھوپھی! کچھ چاہئے کیا؟“ حسہ، پھوپھی کے نحیف سے کپکپاتے

ہاتھ پر اپنا گداز ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔

”جمال کدھر ہے؟“

”جمال بھائی تو باہر ہیں“

”اے بلاؤ“ وہ کھانستے ہوئے بمشکل بولیں۔

”اچھا پھوپھی! ابھی بلاتی ہوں“ حسہ چھپاک سے باہر نکل آئی ”جمال بھائی! او جمال

بھائی!“ حسہ نے برآمدے میں کھڑے ہو کر ہانک لگی تھی۔

”کیا بات ہے حسہ!“ جمال نے نرمی سے پوچھا۔

”پھوپھی یا دفر مار ہی ہیں“

”اماں نے مجھے نہیں یاد کیا“ لالی کو ہر بات میں ٹانگ اڑانے کا شوق تھا۔

”نہیں“ حسہ نے رکھائی سے جواب دیا۔ جمال اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا

تھا۔ حسد اور لالی بھی پیچھے ہی چلے آئے۔

اماں بستر پر چت لیٹی رو رہی تھیں۔ ان کے گدلے آنسو جھریوں زدہ بیمار چہرے میں گم ہو رہے تھے۔ کمرے کا ماحول سوگوار تھا۔ اسی حساب سے لالی بھی اپنی چونچال بھول گیا۔ فوراً اماں کے سر ہانے بیٹھ کر ان کا سر دبائے لگا تھا۔

”اماں! میری پیاری اماں! کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ کیوں غم کرتی ہیں۔ میں ہوں نا“ وہ اماں کے ہاتھ تھام کر لمبوں سے لگا تارقت بھری آواز میں بولا ”آپ اماں! آپ ہماری فکر نہ کریں۔ تمہیں ارانی جی ہمارا خیال رکھتی ہیں۔ ہفتے میں ایک دفعہ گوشت پکا دیتی ہیں۔ باقی کا پورا ہفتہ اپنے کھیتوں کی سبزیاں یا دالیں کھلاتی ہیں۔ کبھی کبھی دل کرتا ہے آپ کیساتھ ہی پیٹنگ پر بستر لگا کر لیٹ جاؤں۔ بخنی، سوپ، فروٹ، جوسز اور نجانے کیا کیا کھانے کو ملے گا۔ بس اماں آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں“

”تا کہ تم اماں کی جگہ بستر سنبھال لو“ حسد نے ترخ کر کہا۔

”اللہ نہ کرے“ اماں دہل سی گئیں۔ میرا مولاتم سب کو لمبی حیا تی دے۔ وہی تباہی نہ

بولا کر پترا!

”اماں! میں جانتا ہوں آپ کو کون سا غم کھائے جاتا ہے“ لالی ایک دم جذباتی ہو گیا۔ ”آپ چاہتی ہیں جمال بھائی شادی کر لیں۔ ہمارے لیے ایک اٹھلاقی تثناتی بھابھی لے آئے۔ ابھی بھی آپ نے جمال بھائی کو اسی لیے بلایا ہے۔ اماں! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ مگر یہ جمال بھائی نہیں کرتا۔ اسے آپ کی ذرا سی خواہش پوری کرنا کے ٹوسر کرنے کے برابر لگتا ہے اور یہ اس پہاڑ یعنی شادی کے پہاڑ پر نہیں چڑھنا چاہتا مگر میں اماں! آپ کا لالی اس نیک کام کے لیے بالکل تیار ہے۔ اگر ایرجنسی نکاح چاہتی ہیں۔ تب لالی دل و جان سے تیار ہے۔ ابھی سہرا منگوالیں، مولوی کو بلووالیں۔ دیکھیں کچی پکائی لے آئیں گے۔ باقی کا جو کام ہے وہ جمال بھائی ہے نا بس“

”بس بھی کرو لالی!“ لالی کی فراٹے سے چلتی زبان کو جمال کی بلند آواز نے بریک لگایا تھا جبکہ اماں کے بیمار چہرے پر نرم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”بولنے دے نہ میرے پتر کو اسی کے دم سے تو رونق ہے“ اماں نے محبت سے لالی کی طرف دیکھ کر کہا۔ لالی اپنی تعریف پر پھولے نہیں سار ہا تھا جبکہ حسد لالی کی اس تعریف پر

بھن گئی تھی۔

”اماں کوئی اہم بات کرنا چاہتی ہیں؟“ جمال نے اماں کو یاد دلایا۔

”جی اماں! بولے آپ میں سن رہا ہوں“

”جمال پترا! تو اب کوئی فیصلہ کر ہی لے“ اماں نے التجائیہ کہا تھا اور یہ التجا تو وہ ایک ہزار ایک مرتبہ کر چکی تھیں۔

”کون سا فیصلہ!“ لالی کے ساتھ ساتھ باہر نکلتی حسد بھی ٹھٹک کر رک گئی۔

”تم نے وعدہ کیا تھا پترا! ایک دفعہ جانے میں کیا حرج ہے“ اماں لرزیدہ آواز میں کہہ

رہی تھیں ”میری زندگی میں اسے لے آ پترا! میں آخری دفعہ اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ بے آسرا یتیم بچی نجانے کہاں رل رہی ہوگی۔ میں اس کی صورت دیکھنا چاہتی ہوں“

”اماں! ایک سو مرتبہ آپ کے بتائے پترے پر جا چکا ہوں مگر وہ مکان بچ کر کہیں جا چکی ہیں“ جمال نے جھنجھلا کر کہا۔

”تو اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ مکان بچ کر چلی گئی ہیں۔ کہیں ان کے

ساتھ کوئی حادثہ تو نہیں پیش آ گیا“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولیں۔

”اماں! آپ بھی تو کئی مرتبہ جا چکی ہیں..... مگر گھر پر تالا لگا ہوتا ہے۔ بہت عرصہ تک

وہ تالا اسی مکان کے گیٹ پر لگا رہا۔ اب کچھ عرصے سے وہاں کوئی اور لوگ آگئے ہیں“ جمال نے تفصیلاً بتایا۔

”تم ان ہی لوگوں سے ان کا اتنا پتا پوچھ لیتے“ انہوں نے اس بھری نگاہ سے بیٹے

کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”اماں! آپ کو یقین نہیں آ سکتا میں کئی مرتبہ وہاں گیا ہوں مگر بے فائدہ۔ کچھ پتا

نہیں چل سکا کہ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا ہے“ جمال نے ناگواری دبا کر کہا۔

”اماں! آپ کس کی بات کر رہی ہیں“ حسن آراء نے جمال کے جانے کے بعد بے چینی

سے پوچھا۔

”اللہ بخشے، جمال کی دادی کی“

باہر سے ایک دم شور کی آواز سنائی دی تھی۔ پھر بو احمدن کمرے میں داخل ہوئیں۔

”لوجی، اب تو خیر نہیں۔ میں چلتا ہوں“ لالی نظر بچا کر باہر کی طرف بھاگا۔

”تو کہاں چل دیا ذرا ادھر تو آ“ بوا کی نظر بھی بلا کی تیز تھی۔ لالی کو مروا آنا پڑا۔  
 ”کسی رشتے کے متعلق مت بتائیے گا بوا! میرا کم از کم آپ کی بتائی کسی لڑکی سے  
 شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں“

”لو اور سن لو“ بوا فوراً برا مان گئیں اتنی پیاری لڑکی ہے۔ گھرانہ بھی بہت اچھا ہے۔  
 بات تو میں نے جمال کے لیے کی ہے مگر وہ تو مانتا ہی نہیں۔ اسی لیے میں تو چاہتی ہوں لالی کی  
 بات چلا دوں“ بوا سرگوشیوں میں اماں سے مخاطب تھیں۔ آواز اتنی بلند تھی کہ لالی اور حسہ دونوں  
 تک با آسانی پہنچ گئی۔

”بوا! میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ کئی مرتبہ تو بتا چکا ہوں“ لالی جھنجلا  
 کر بولا۔

”مگر کیوں؟“ اماں کی آنکھوں میں اداسی اتر آئی۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی تو  
 شادی کے لیے رضا مند نہیں ہو رہا تھا۔ ورنہ ان کی تو خواہش تھی کہ حسہ کی ان دونوں میں سے کسی  
 ایک سے.....

”میں شادی کا رس گلہ کھا کر پچھتا نا نہیں چاہتا“ لالی نے کمال اطمینان سے کہا تھا۔  
 حسہ قلقل کرتی میدان میں اتر آئی۔

”تم نے محاورے کو الٹا کر دیا ہے۔ ویسے تو بڑے پڑھے لکھے بنتے ہو“ حسہ کو بھی طنز  
 کرنے کے لیے کسی خاص موقع کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

”یہ ماڈرن دور ہے۔ لہذا کا زمانہ عرصہ ہوا لگ گیا“ لالی نے شرٹ جھماڑ کرنا دیدہ سی  
 سلوٹوں کو تلاتے ہوئے کہا۔

”لڑکی ہیرا ہے ہیرا“ بوا اب تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر چکی تھیں ہمیشہ کی  
 طرح ”اور ایسے ہیرے اپنے گھر میں ہی بھلے“ لالی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”سچ کہہ رہی ہوں۔ ایسی لڑکی تم کو کہیں نہ ملے گی“ بوائے نے بغیر برامانے پچکارتے  
 ہوئے کہا۔

”تو میں کون سا لڑکی ڈھونڈنے کی مہم پر نکلنے والا ہوں“ وہ لالی ہی کیا جو بات کو سمجھ جائے۔  
 ”نیک، سمجھدار اور بے زبان سی بچی“ بوا ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔ جس کھونٹے سے

باندھو گے۔ خاموش سے بندھ جائے گی، اف تک نہ کہے گی“

”تو صاف لفظوں میں بات کریں نا کہ لڑکی گوگلی ہے“ لالی فوراً ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔  
 ”خدا نخواستہ گوگلی کیوں ہونے لگی“ بوا پھر سے برا مان گئیں میں تو کہتی ہوں تمہارا یہ  
 لڑکا یہ تیز ہے اس کو تو رہنے ہی دو۔ جمال ہی ٹھیک ہے، اسی کے سلسلے کو آگے بڑھا“  
 ”پر بوا! وہ مانے تب نا“ اماں بے بسی سے بولیں۔

”ویسے تو ترتر زبان چلتی ہے۔ بھائی کو شادی کے لیے رضا مند نہیں کر سکتے“ بوائے  
 توپوں کا رخ لالی کی طرف موڑا۔

”کر سکتا ہوں مگر کروں گا نہیں“ لالی کا اطمینان قابل دید تھا۔  
 ”وہ کیوں؟“ بوا حیران ہوئیں۔

”اس لیے کہ پہلے حسن آرا بیگم کو اس گھر سے نکالنے کی تیاری کریں۔ آپ کیوں  
 چاہتی ہیں بوا کہ ہماری بیویاں تھانے دارنی جی کے ہاتھوں جلد ہی اس جہاں سے کوچ فرما  
 جائیں“ لالی کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

”تم لوگوں کو نہ دھکے دے کر نکال دوں۔ خبردار کسی نے میرے خلاف سازش کرنے  
 کی کوشش کی“ حسہ جلدبا کر پلٹ آئی تھی۔

”ادھر تو آوے کا آؤا بگڑا ہوا ہے۔ تم نے نہ دیکھیں ان تینوں کی شادیاں“ بوا تاسف  
 سے سر ہلا کر اماں سے مخاطب ہوئیں۔

”خدا نخواستہ کیوں نہ دیکھیں گی۔ ہمارے تو بچوں کی شادیاں بھی اماں ضرور اٹینڈ  
 کریں گی کیوں حسہ!“ لالی نے پاس کھڑی حسہ کو شہو کا دیا۔

”تو اور کیا“ حسہ نے بھی بے خیالی میں سر ہلا دیا۔

”پر مجھے نہ یہ سعادت حاصل کرنے دینا“ بوا کے انداز میں ملال ہی ملال تھا۔  
 ”کیوں نہیں..... آپ جلد جمال بھائی کے ویسے کا زردہ کھائیں گی بوا“ لالی نے بوا

کو پچکارا۔

”کیا لڑکی ڈھونڈ بھی لی“ صدے سے بوا کی آواز پھٹ کر رہ گئی۔ پیسے بنورنے کا  
 شہری اور نیلا پیلا موقع ہاتھ سے نکلنے والا تھا۔

”لڑکی ڈھونڈنے ہی تو نکلنے والا ہوں“ لالی نے گویا دھماکہ کیا تھا۔ اماں اور حسہ نے  
 بیک وقت لالی کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟“ سب کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔

”فائل ایگزامز سے فارغ ہوں، مطلب پھر بتاؤں گا“ لالی نے پراسرار انداز میں کہا۔

”اس چھوکرے کی چھوڑو، میری بات سنو“ بوانے اماں کو پھر سے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”تھانیدارنی کو ایک مرتبہ میرے ساتھ بھیجو، لڑکی پسند نہ آئی تو زبردستی کا ہے کی ہے“

”ہوا! کئی لڑکیاں تو آپ خود ہی ناپسند کر آتی ہو۔ پہلے ان کی تعریفوں میں زمین

آسمان ایک کرتی ہو اور پھر بات بننے سے پہلے تمہیں ان میں کوئی خرابی نظر آ جاتی ہے۔ مجھے تو لگتا

ہے۔ تمہیں بھی سوسے، پکوڑوں کا چسکہ لگ گیا ہے“ یہ جرأت تھانیدارنی کے علاوہ کوئی اور بھلا

کر سکتا تھا۔ بوا کو کچھ نہ سوجھا تو حسنہ کی طرف سے ہونہ کہہ کر رخ موڑ گئیں۔

اگلی صبح جمال تو کوہاٹ جانے کے لیے نکل گیا تھا جبکہ لالی کا قیام ان دنوں پھر سے

ہوشل میں تھا۔

☆☆☆

امتحان سے فارغ ہو کر ہی لالی نے گھر کی راہ دیکھی تھی۔

”شہر میں ذرا لگا کر ہی بیٹھ گئے تھے“ حسنہ نے لوہے کا پھانک کھولتے ہوئے کہا۔

”آپ نے تو شکرانے پڑھے ہوں گے۔ نیاز تقسیم کی ہوگی۔ مگر میں پھر بھی آگیا

ہوں۔ اپنی پیاری اماں کی خاطر“ ماربل کے گرد آلود فرش پر چلتے ہوئے لالی نے اپنے ازلی لا پروا

انداز میں کہا۔

”بائی داوے تھانیدارنی جی! آج کیا گھر کی صفائی نہیں کی؟“

”نہیں“ حسنہ رکھائی سے بولی۔ یہ رکھائی تو اس کے مزاج کا ایک حصہ بنتی جا رہی تھی۔

”وجہ پوچھ سکتا ہوں“ وہ اس کے برابر چلتے ہوئے بولا۔

”میری مرضی“

”اپنی مرضی کا ہمیشہ دھیان رہتا ہے، کبھی کسی دوسرے کی“ ”مرضی“ کو بھی مد نظر رکھ لیا

کریں“ لالی نے سادہ سے انداز میں کہا۔

”یہ اوکھی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو“ حسنہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”اوسوری! میں ہمیشہ کیوں بھول جاتا ہوں کہ آپ نے الف انار کے قاعدے تک کو

نہیں پڑھا“

لالی نے ہمیشہ کی طرح اس کی کندھنی پر چوٹ کی۔ حسنہ کا کبھی سکول میں دل ہی نہیں

لگا تھا۔ رورو کر پورا سکول سر پر اٹھا لیتی تھی۔ ماموں لاڈلی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے

تھے۔ فوراً نام کٹوا کر گھر لے آتے۔ یوں حسنہ بیگم بکری تک تو پہنچ ہی نہیں سکتی تھیں۔

”خود تو بڑے تیر مار لیے ہیں“ حسنہ نے بھی بدلہ اتارنا چاہا۔

”عنقریب دیکھ لیجئے گا۔ ایک دوست کے توسط سے مجھے تو ابھی سے جاب کی آفر

ہوئی ہے“ لالی جان بوجھ کر اترایا۔

”تو کیا تم مستقل شہر میں شفٹ ہو جاؤ گے“ حسنہ کا دل لمحہ بھر کے لیے رک رک کر

چلنے لگا تھا۔ صحت مند سراپے کو اک گہری اداسی نے اپنی پلیٹ میں لے لیا۔

”آپ پر کیوں مردنی چھا گئی ہے“

”بک بک نہ کرو“

”تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟“

”ایک ہزار ایک مسئلے ہیں، کون کون سا سا بتاؤں“ لالی غم زدہ سا بولا۔ خیر آپ مجھے

پہلے سے کچھ کمزور دکھائی دے رہی ہیں۔ خدا خیر کرے، میری جدائی نے رنگ دکھایا ہے یا پھر

مجھے تو لگتا ہے ڈائمنگ ڈائمنگ کا کوئی چکر نظر آ رہا ہے“

”مجھے کیا پاگل کتے نے کاٹا ہے۔ برا عظم امریکہ اور افریقہ کی ماڈلوں کی طرح سوکھ

سوکھ کر کاٹنا ہو جاؤں۔ رنج کے روٹی کھاتی ہوں۔ اور ڈائمنگ کے لیے مجھے کسی شے کی لوڑ

(ضرور) نہیں پڑتی۔ میں پہلے ہی بڑی وائٹ ہوں“

”چار کریموں کے فارمولے کا کمال ہے“ لالی اس کی ڈائمنگ کی وضاحت پر

مسکراہٹ چھپانے کے لیے قدرے جھک گیا۔

”میں نہیں فارمولے کو ساڑتی“ حسنہ کو غصہ آ گیا۔

”پچھلے دنوں جب میں آیا تھا تو پوکی بہن گھاس کاٹنے اور گوبر کے ایلے بنانے کا

طریقہ پوچھنے تو نہیں آتی تھی“ وہ بھی لالی تھا۔ اس کے اسٹاک میں باتوں کا انبار کبھی کم نہیں ہو سکتا تھا۔

”تو کسی کو بنا کر دینے کا یہ مطلب تو نہیں کہ بندہ خود بھی کریموں سے منہ رگڑتا رہے“

حسنہ نے ناراضی سے وضاحت کی ”میں پیدائشی گوری ہوں“

”آپ پیدائشی پھیکا شلیم ہیں، میں تسلیم کر لیتا ہوں، مگر اس پھیکے شلیم جیسے گالوں پر

اترتی سرخیوں کا راز کیا ہے۔ اب اپنوں سے کیا پردہ، مجھے تو کم از کم بتا دیجئے۔“ لالی نے معنی خیزی سے حسد کے چہرے کو بغور دیکھا، حسد سچ مح گھبرا گئی۔

”تو کیا میرا راز فاش ہو گیا“ وہ فحش چہرہ لیے گم صم بیٹھی رہ گئی تھی جبکہ لالی گنگنا تے ہوئے اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

”جمال بھائی! تم سے ایک بات کرنا تھی“

”تو تمہیں اجازت کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“ جمال آج بہت مصروف تھا۔

حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا۔

”میں دریاؤں کے رخ موڑنے والا ہوں“ جمال کو اپنے کام میں مصروف دیکھ کر لالی

نے بھنا کر کہا۔

”تو موڑ دو یا ر! مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب اتنا امنونا کام کرنے کا

ارادہ کر لیا ہے تو میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ موجوں نے ننگے کی کوشش کی تو جمال بھائی کو مت

پکارنا“ وہ رجسٹر پر لفظ گھسیٹتے ہوئے بولا تھا۔

”جمال بھائی! لالی نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

”بولو! کیا کہنا ہے؟“ جمال نے سارے کاغذات دراز میں پٹختے ”سارا حساب غلط

کر دیا ہے“

”جار ہوں میں“ لالی نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے تھے۔

”یہ لے کیئے! اپنے والی پرچی، جاوور جا کر اس گھر کی مالکن سے جوتے کھا۔ اپنی تھانے

دارنی سے بھی زیادہ نک چڑھی عورت ہے۔ ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ گئیں تو اطلاع کر دینا، میں

ایمبولینس لے کر آ جاؤں گا“ جمال نے ایک مڑا مڑا کاغذ کا ٹکڑا والٹ میں سے نکال کر لالی کی طرف

پھینکا جسے سینے سے لگا کر وہ مزے سے گنگنا تیا۔ ساتھ میں پرچی پر نگاہ دوڑائی ”مسز شبانہ اختر“

”یہ تو تم تھے جمال بھائی! شریف، کم گوار ادب لحاظ والے، دیکھنا ذرا اس مالکن کے

چھکے نہ چھڑو اگر آیا تو نام بدل دینا“ لالی سینہ ٹھونک کر بولا اور پرچی جیب میں ٹھونس لی۔

”اس شریف عورت کو تنگ کرنے کا کوئی مقصد بھی ہے، اس بے چاری سے ایک ہی

خطا سرزد ہوئی ہے ناکہ اس نے میری مرحومہ پھوپھی کا مکان خرید لیا ہے، وہاں جانا زرا بے کار

ہے۔ ان لوگوں کو اس کا کچھ پتا نہیں یا ر! کسی کو خواہ مخواہ تنگ نہیں کرتے۔ یہ تو اماں کی ضد تھی جو

میں دو، تین مرتبہ چلا گیا تھا۔ ورنہ وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں“ جمال نے بلا کی بنجیدگی سے کہا۔

”تو ایک کوشش مجھے بھی کر لینے دیں“ لالی بھی یکا یک بنجیدہ ہو چلا تھا۔

”اوکے، ایک کے بجائے ایک لاکھ کوششیں شوق سے کرو“ جمال پھر سے اپنے کام

کی طرف متوجہ ہو گیا تھا، جبکہ لالی کچھ سوچتے ہوئے سر ہلا کر پلٹ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح حسد دروازے میں کھڑی اسے جی جان سے تیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔

”تھانیدارنی جی! اندر آ جائیے“ لالی اسے دیکھ چکا تھا اسی لیے ذرا نرمی سے بولا۔

”تم جارہے ہو؟“ بالآخر کافی دیر چپ چاپ کھڑے رہنے کے بعد حسد نے پوچھ ہی لیا۔

”ہاں“

”آؤ گے کب؟“

”یہ تو پتا نہیں۔ البتہ اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد ہی آؤں گا“ لالی کا انداز دو ٹوک

بنجیدہ تھا۔

”اگر کامیابی نہ ہوئی تو“

”آتا تو پھر بھی ہے نا۔ مقصد میں ناکامی کے بعد میرا خود کشی کا ارادہ نہیں ہے“ لالی

نے اطمینان سے ہاتھ جھاڑے۔

”کہیں تم شادی کرنے تو نہیں جارہے چھپ چھپا کے“ وہ اپنے خدشے کو زبان دیئے

بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ لالی اب کے بری طرح ٹھنک گیا تھا۔ حسد کے لب و لہجے کی افسردگی، چہرے

کی بے رونقی اور سرخ آنکھیں کچھ اور ہی داستان سنار ہی تھیں۔

”اگر ایسی بات ہے تو تم اس طرح سے شادی نہ کرو“ وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے

رنجیدگی سے بولی۔

”تو پھر کس طرح سے کروں؟“ لالی یکا یک گویا ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ آنکھوں

کی جگہ گاہٹ ستاروں کو مات دینے لگی۔

”ٹھیک طریقے سے، دنیا کے دستور کے مطابق، بڑوں کی شمولیت کے ساتھ اس

طرح تو سب کو دکھ ہوگا“ وہ سارا جلال بھول گئی تھی۔ لہجے کا ہمیشہ والا کھر درا پن بھی مفقود تھا۔ نرم



انداز میں بولنے کی وجہ سے آواز کا بھاری پن بھی غائب ہو گیا تھا۔

”کس کس کو دکھ ہوگا؟“ لالی نے مسکراہٹ چھپا کر پوچھا۔

”اماں کو، جمال بھائی کو اور.....“

”اور کسے؟“ لالی نے بے چینی سے پوچھا۔ حالانکہ اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

جان تو وہ گیا ہی تھا۔

”پتا نہیں“

”اچھا تو پھر دنیا کے دستور کے مطابق کیسے شادی کروں“ لالی نے بلا کی بنجیدگی سے پوچھا ”رشتہ بھجواؤں اس کے گھر، مگر کون لے کر جائے گا، اماں تو ظاہر ہے جانیں سکتیں“

”مم..... میں اور کون“

”آپ جائیں گی، یعنی آپ“ لالی چلا اٹھا۔

”تو اور کیا، جمال بھائی کے لیے لڑکی دیکھنے بھی تو جاتی رہی ہوں“ وہ اپنی آزدگی چھپانے میں ہلکان ہو رہی تھی۔

”مگر میں آپ سب کو اس زحمت سے بچانا چاہتا ہوں“

”سرکاری طریقے سے شادی کر لو گے؟“ نہایت یاسیت سے پوچھا گیا۔ سرکاری طریقے سے مراد شاید کورٹ میرج تھی۔

”میں ایسا بھی بے حیا نہیں ہوں“ لالی برا مان گیا۔ ”تو پھر؟“ وہ رو دینے کو تھی۔ لالی کو اس کی پتلی حالت پر ترس آ گیا۔

”اچھو اچھو! ابھی تو میں اماں کے ایک کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ کورٹ میرج کرنے نہیں۔ اس لیے آپ فکر اور غم میں سوکھ سوکھ کر کا نامت ہو جائیے گا۔ اللہ آپ کو ہمیشہ اسی طرح موٹی تازی اور ہری بھری رکھے، رب را کھا! چلتا ہوں اب“ لالی ہنستے ہوئے بیک کندھے پر ڈال کر گنگناتے ہوئے باہر نکل گیا تھا جبکہ حسنہ تلملا کر رہ گئی۔

”کمینہ، رزیل، ذرا مہ کر رہا تھا اتنی دیر سے“ وہ زیر لب بڑبڑائی، پھر محض اسے سنانے کے لیے بلند آواز میں بولی۔

”یہ منہ اور مسور کی دال، تمہیں بھلا گھاس کس نے ڈالنی ہے۔ بڑا آیا کورٹ میرج کرنے والا ہونہ۔“

”ہونہ، فوں..... کا کوئی فائدہ نہیں تھانے دارنی جی! بات تو اب کھل چکی ہے“ لالی

پھر سے پلٹ آیا تھا کہ ادھار کا قائل تو وہ بھی نہیں تھا۔

”کون سی بات؟“ حسنہ بھی اب سنبھل چکی تھی، اسی لیے تنک کر بولی۔

”اب میرا منہ مت کھلوائیے“

”تمہاری بتیسی دیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں“

حسنہ چوٹی کے بل کھولتے ہوئے سکون سے بولی۔ اعصاب پر دھرا بو جھ تو ہٹ ہی چکا تھا۔ سو وہ اب مطمئن ہو چکی تھی۔ جب سے اس نے لالی کے کہیں جانے کے بارے میں سنا تھا، کئی خدشات پھن پھیلانے لگے تھے۔

”واپسی پر جواب دوں گا، ابھی مجھے جلدی ہے، خیر چلتا ہوں“ لالی نے اک گہری نگاہ سے حسنہ کو سر تا پا دیکھ کر ہونٹوں کو سیکنڈ اور پلٹ گیا، جبکہ حسنہ درتپے پر ہاتھ رکھے ہنسی اور پھر ہنستی چلی گئی۔ لالی اونچی آواز میں چلتے چلتے گانا گارہا تھا بلکہ گانے کی پسلیاں توڑ رہا تھا۔

ہر کسی سے جسے تو چھپاتی رہی۔

بے خودی میں مجھے تو بلاتی رہی۔

ہاں بلاتی رہی۔

جج جج بلاتی رہی۔

جو تالہراتی رہی۔

ڈنڈا دکھاتی رہی۔

☆☆☆

”جمال بھائی! محبت کیا ہوتی ہے؟“

گھر سے وہ سیدھا جمال کے دفتر اسے خدا حافظ کہنے آیا تھا اور آتے ساتھ ہی ایک بے تکا سوال داغ دیا۔ جمال کو یہ سوال بے تکا ہی لگا تھا۔ کیونکہ وہ بڑی بنجیدگی سے اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آجائے۔ بقول جمال کے وہ عورت کا فی خطرناک اور چالاک دکھائی دیتی ہے، یہ نہ ہو کہ لالی کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائے، مگر لالی نے سر ہلاتے ہوئے ہمیشہ کی طرح ہانکنا شروع کر دیا تھا۔

”بتاؤ نا“ لالی نے لاڈ سے اصرار کیا۔

”مجھے کیا پتا۔ میں ادھر بیٹھ کر محبت کی تشریح ہی تو کرتا رہتا ہوں“ جمال بھنا کر بولا۔  
 ”تم نے بھی محبت کی جمال بھائی! یار، سچ بتانا“ لالی سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔  
 ”نہیں۔ میرے پاس اتنا فالو وقت نہیں ہے“  
 ”تم تو بورنگ ہو یار! نصیب پھوٹ جائیں گے اس لڑکی کے جس کی تمہارے ساتھ شادی ہوگی“ لالی نے منہ بگاڑ کر کہا۔

”جس سے شادی ہوگی، اس سے محبت کر لوں گا“ اس کے نصیب نہیں پھوٹیں گے“  
 ”واہ..... یہ ہوئی نا بات، یہ تم ہو چھپے رستم“ لالی کھل اٹھا۔  
 ”اب دفع بھی ہو جاؤ، بس نکل جائے گی“  
 ”چلتا ہوں، تم محبت کے ٹاپک پر غور کرنا“ لالی نے یاد دہانی کروائی۔  
 ”پہلے مجھے یہ بتانا جا، آج سویرے سویرے اپنی محبوبہ کا چہرہ تو نہیں دیکھ لیا“ جمال شک بھری نگاہ سے اسے دیکھنے لگا۔

”تم کو کیسے پتا چلا“ لالی کا رنگ یک دم فق ہو گیا۔  
 ”بتا کون ہے وہ گل اندام، ارے ارے وہ تو.....“ لالی بھنسی بھنسی آواز میں بولا۔  
 ”بتا بھی دے“ جمال دھاڑا۔  
 ”آٹے کی بوری ہے وہ تو“ لالی گردن جھڑا کر جمال کو حیران پریشان چھوڑ کر باہر کی طرف بھاگا تھا۔

”آٹے کی بوری“ جمال سوچتا ہی رہ گیا ”یہ کون سی خاتون ہیں جسے میں نہیں جانتا“  
 جمال کی سوچوں کا دھارادوسری طرف پہنچے لگا تھا، پھر ایک دم وہ ٹھٹھک سا گیا۔  
 ”آٹے کی بوری۔ دودھ بھری کنوری“  
 ”حسن آرا..... بھینس کا چارہ“

دور بہت دور سے آتی لالی کی معصوم سی آواز نے جمال کو ششدر کر دیا تھا۔ گزرے وقت کا ذرا سادہ اور سادہ اور کچھ یادیں ہوا کے جھونکے کے ساتھ اندر داخل ہو گئیں۔  
 ”جمال بھائی! بہت مارتی ہے تھانے دارنی“ لالی روتا ہوا اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔  
 ”تم بھی مار لیا کرو، بڑے ہو اس سے“ جمال نے لالی کو پکڑا کر۔  
 ”وہ بہت موٹی ہے، اس کا ہاتھ بھاری ہے، میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے، دیکھو تو گال

پھول گیا ہے“ لالی سوں سوں کرتا رہا۔  
 ”تو اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ اسے سمجھاؤں گا“ جمال سوچ میں پڑ گیا۔ لالی نے اس کا کندھا ہلایا۔

”دیکھنا، میں اس سے کیسے بدلہ لیتا ہوں“ لالی کے ارادے خطرناک تھے۔  
 ”کیسے بدلہ لو گے“ جمال حیران ہوا۔  
 ”ایسے.....“ لالی نے کہنا شروع کیا۔ ”آٹے کی بوری، دودھ بھری کنوری، حسن آرا، بھینس کا چارہ“

لالی نے باقاعدہ تالیاں پیٹ کر تان لگائی اور واقعی حسن آرا اس گیت کو سن کر چڑ جاتی تھی اسے لالی پر اور بھی غصہ آتا تھا جس نے اس کے نام کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا تھا پھر حسد کی تخریبی سرگرمیوں اور بچوں پر جارحانہ تشدد کی بنا پر سب نے اسے تھانے دارنی کا خطاب دے ڈالا۔ جو کہ حسد کو جی جان سے پسند آ گیا۔ وہ خود کو تھانے دارنی کہلوا کر بہت فخر محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ مرحوم والد صاحب پھر سے زندہ ہو گئے ہیں۔ یہ حوالہ اسے بہت عزیز تھا چاہے لوگوں نے جس نظریے سے بھی اسے تھانیدارنی کہنا شروع کیا تھا۔ تاہم وہ اپنے زاویہ نظر سے دیکھتی تھی اور دل ہی دل میں بہت مسرور ہوتی۔  
 ”تھانیدار کی بیٹی ہوں۔ تھانے دارنی کہلواؤں گی“ وہ اتنی ہم جولیوں کو فخر سے بتاتی۔ حالانکہ کوئی اور تو نہ سہی لیکن وہ اور لالی دونوں حسد کو ستانے کی غرض سے ”تھانے دارنی جی“ کہتے تھے۔

”تو کیا لالی حسد سے“ جمال کچھ عجیب سی کیفیات کا شکار سوچوں کے بھنور میں پھنس کر رہ گیا۔ ہوں، ایسا کچھ ہو جائے تو غلط بھی نہیں۔

☆☆☆

”بڑی بد بخت عورت تھی اپنے جگر کے ٹکڑے کا بھی خیال نہیں آیا۔ ظالم بچی کو بلکتا چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں بھاگ گئی تھی۔ میرا بھائی مارے غیرت کے ہمیشہ کے لیے پردہ پوش ہو گیا“

پھوپھو سسک سسک کر رو رہی تھیں۔ مہمان خواتین کے چروں پر تاسف جھلکنے لگا۔  
 کچھ دیر پہلے یہ دو خواتین سومیہ کو دیکھنے کے لیے آئی تھیں۔ پھوپھو نے ہمیشہ کی طرح ان کی خاطر

مدارت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ پھر باتوں باتوں میں آنے والی خواتین نے سومیہ کی ماں اور باپ کی غیر موجودگی کے بارے میں پوچھا تھا۔ ایک اسی ذکر سے سومیہ خوف زدہ رہتی تھی، مگر یہ حوالہ قبر تک اس کے ہمراہ تھا۔ اسے یقین تھا اگر وہ مر جاتی تب بھی لوگوں نے کہا تھا ”یہ سومیہ مراد ہے، جس کی ماں رات کے اندھیرے میں اپنے شوہر کے دوست کے ساتھ بھاگ گئی تھی، بے چاری سومیہ“

”سومیہ کے والد کا انتقال ہو گیا ہے اور والدہ.....؟“

طنطنے والی اس عورت نے نخوت سے پوچھا۔

”دیکھئے بہن! میری بات تحمل سے سنئے گا“ ایک پل کے لیے سومیہ کی طرح پھوپھو کا رنگ بھی فق ہو گیا تھا۔ پھر انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد کہنا شروع کیا۔

”جس رشتے کی بنیاد جھوٹ پر رکھی جائے، وہ کبھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ ہم شریف خاندانی لوگ ہیں۔ میری بیٹیاں سب اچھے گھروں میں بیاہی گئی ہیں۔ سومیہ کے لیے بھی میں کسی ایسے گھرانے کی خواہش مند ہوں، میری سومیہ بہت معصوم اور سادہ ہے، ہم نے بچوں کو نیکی، سچائی، ایمان داری کے سبق پڑھائے ہیں، انہیں اچھے برے کی تمیز کرنا سکھایا ہے، اخلاق، کردار میں ہماری بیٹی کی مثال نہیں، مگر“

”تو کیا سومیہ کی والدہ“ دوسری خاتون نے معنی خیزی سے پھوپھو اور سومیہ کو دیکھا اور پھوپھو نے بڑے صبر اور حوصلے سے اس تلخ حقیقت کا پردہ فاش کر دیا تھا۔ دونوں خواتین کے چہرے متغیر ہو گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے مزید کچھ دیر بیٹھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد پھوپھو بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

”اگر میں انہیں سچ نہ بتاتی تو شاید بات بن ہی جاتی“

”آپ نہ بتاتیں تو کوئی اور بتا دیتا۔ میرے خیال میں آپ نے جو کیا ہے بہتر کیا ہے“

سومیہ ہمیشہ کی طرح پھوپھو کی دلجوئی کرنے لگی تھی۔

”نہ جانے تمہاری قسمت میں کیا لکھا ہے میری بچی!“ پھوپھو دوپٹے کے پلو سے آنسو

پونچھتے ہوئے رنجیدگی سے بولیں۔

”اللہ بہتر کرے گا“ سومیہ نے بڑے ضبط سے آنسو پی لیے۔ بہت چھوٹی عمر سے

اسے لوگوں کے رویوں کو سمجھنا آ گیا تھا۔ جب بھی کبھی اس کی ماں کا ذکر چڑتا تو اک لمبی کہانی کی

شروعات ہو جاتی۔ کوئی ترحم اور ترس کی کیفیات کا شکار ہو جاتا تو کوئی تمسخرانہ نظروں سے دیکھتا۔ آہستہ آہستہ سومیہ نے لوگوں سے ملنا ترک کر دیا تھا۔ وہ تنہائی پسند ہو گئی تھی۔ جب بھی کوئی گھر میں آتا، وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی تھی۔ اسے لوگوں کے ہجوم سے دشت ہونے لگی تھی۔ وہ محفلوں سے کترانے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ باجیوں کے سسرال بھی کم کم جاتی تھی۔ تمام عمر اسے ایک ہی خوف نے جکڑے رکھا تھا اور وہ خوف تھا ماں کی کردار کشی کا۔ جب بھی کوئی اس کی ماں پر کچھ اچھا لٹا تھا، سومیہ کو لگتا وہ خود گندگی میں لتھڑ گئی ہے، کچھڑ سے لت پت ہو گئی ہے۔

”سومی! تو دل برا نہ کر، یوں خاموش ہو کر نہ بیٹھ، میرا کلیجہ پھٹ جائے گا“ پھوپھو نے اسے اپنے مہربان وجود میں سمجھنے لیا۔

”پھوپھو! آپ ٹینشن مت لیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس دنیا میں ہر مسئلہ کا حل شادی نہیں ہے۔ اگر میں کچھ پڑھ جاتی تو“ سومیہ لب کچل کر چپ سی ہو گئی تھی۔

”سمیرا کوفون کر دو۔ میں نہیں جاؤں گی میلاد پر۔ دل گھبرا رہا ہے“ پھوپھو نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”آپ چلی جائیں پھوپھو! کچھ طبیعت سنبھل جائے گی۔ دل بہل جائے گا“ سومیہ نے بعد اصرار پھوپھو کو جانے کے لیے تیار کیا تھا۔

”گھبرانا مت، میں جلدی آؤں گی..... سالن تو رکھا ہے فریج میں، روٹی پکا کر کھا لینا۔ تمہارا دودھ بھی فریج میں رکھا ہے، یاد سے پی لینا“ پھوپھو ہزار تاکیدیں کر کے روانہ ہوئی تھیں۔ سومیہ اثبات میں سر ہلاتی رہی۔

پھوپھو کے جانے کے بعد سومیہ ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی جب دروازے کی گھنٹی بجی، سومیہ کو اٹھ کے گیٹ تک جانا ہی پڑا تھا۔

”کون ہے“ اس نے پوچھا۔

”جی..... میں ہوں، دروازہ تو کھولیں“ دوسری طرف سے مردانہ آواز سنائی دی۔

”آپ کون ہیں؟“ سومیہ نے حیرانی سے اپنا سوال دہرایا۔

”میں لقمان احمد ہوں، گوٹھ اوپنی“ سے آیا ہوں“ شائستہ سی آواز دوبارہ ابھری۔

سومیہ اور بھی حیران ہوئی تھی۔ یہ عجیب و غریب گوٹھ کا نام اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

”آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

”محترمہ! کیا یہ حسن مراد صاحب کا گھر ہے؟“ لقمان نے ہوا میں تیر چلایا تھا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ حسن مراد کا نام سن کر خاتون دروازہ کھول دیں گی، مگر اس کی حیرت اس وقت دو چند ہو گئی تھی جب اس نے سامنے کھڑی سانولے سے چہرے والی ایک لڑکی کو بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو لیے دیکھا تھا۔

”آپ..... آپ حسن مراد صاحب کو جانتے ہیں؟“ سومیہ کی آواز کپکپا کر رہ گئی تھی۔ بہت سالوں بعد ایک طویل عرصہ گزر گیا تھا جب کوئی اجنبی اس کے باپ کے حوالے سے دروازے پر آیا تھا۔ ورنہ پھوپھو کے نام سے ہی اب اس گھر کی پہچان باقی تھی۔ کوئی بھی آتا تو شبانہ اختر صدیقی کا نام لے کر ہی اگلے تعارف کے مراحل طے کرتا۔ نیم پلیٹ پر بھی مسز صدیقی لکھا تھا۔ آج کتنی مدت بعد کسی نے حسن مراد کا نام لیا تھا۔

”یہ حسن مراد کا گھر ہے؟“ اجنبی کے ان الفاظ نے سومیہ کو سرتاپا آنسو بنا دیا تھا۔

”آپ انہیں جانتے ہیں؟“

”جی میں انہیں جانتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اندر آنے دیں گی، وہ شائستگی سے اجازت لے رہا تھا۔“ مجھے گیٹ پر کھڑے ہو کر بات کرنا کچھ مناسب نہیں لگ رہا ہے۔

”آئیے پلیز“ سومیہ سامنے سے ہٹ گئی تھی اندر جانے کے بجائے سومیہ نے کین کی کرسی اٹھا کر صحن میں رکھ دی، لالی ایک نگاہ میں سارے گھر کا جائزہ لے کر بیٹھ گیا تھا۔

”گھر تو بہت اچھا بنایا ہے حسن صاحب نے“ لالی کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

”آپ ابو کو کیسے جانتے ہیں؟“ سومیہ خود پر قابو پا چکی تھی۔ اسی لیے نرمی سے پوچھنے لگی۔

”ہوں..... تو لقمان احمد تم ٹھیک جگہ پہنچے ہو۔ نہ جانے یہ جمال بھائی اتنا عرصہ کہاں

جھک مارتا رہا ہے۔ اور وہ ہٹلر خاتون مالک مکان بھی دکھائی نہیں دے رہیں“ لالی نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے خود کلامی کی۔

”آپ اس مکان میں دوبارہ کب شفٹ ہوئی ہیں؟“ لالی نے ایک اور تیر ہوا میں

چلایا تھا۔

”یہ ہی تین، چار سال پہلے“ سومیہ نے سادگی سے بتایا۔

”پہلے یہاں کون تھا؟“ وہ سرسری سا لہجہ بنا کر پوچھنے لگا۔

”کچھ عرصہ تو گھر اک ہی رہا، پھر کرائے پر دے دیا تھا، وہ ابھی ابھی سی بتانے لگی۔

”اور اب آپ لوگ کہاں رہتی تھیں؟“

”ہم کسی اور جگہ رہتے تھے“ سومیہ نے مختصر کہا۔

”او..... تو جب اماں ایک، دو مرتبہ یہاں آئی تھی تب یہ لوگ اس جگہ سے چلے گئے تھے۔ بہت سال روپوش رہنے کے بعد دوبارہ یہاں آئی ہیں۔ اس خیال میں کہ اب کس نے گڑے مردے اکھاڑنے ہیں“ لالی محض سوچ کر رہ گیا۔

”کیا آج سے پہلے کوئی حسن مراد صاحب یا ان کی صاحبزادی کے بارے میں پوچھنے کوئی نہیں آیا؟“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں، میں کچھ سمجھی نہیں“ سومیہ سچ گھر گئی تھی ”کیا ضرورت تھی جذباتی کیفیت میں اس اجنبی کو اندر لانے کی“ وہ خوف زدہ سی سوچنے لگی۔

”میری بات کا جواب نہیں دیا آپ نے“

”شاید کوئی نہیں، یا پھر پھوپھو کو پتا ہوگا“ سومیہ نے شانے اچکائے۔

”پھوپھو کہاں ہیں؟“ ایک اور سوال۔

”وہ بازار گئی ہیں“

”کب تک آئیں گی؟“

”ابھی آنے والی ہیں“ سومیہ نے لا پرواہ بنتے ہوئے بتایا۔

”میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“ لالی نے درخواست کی۔

”سومیہ“ وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔

”میں بہت جلد دوبارہ آؤ گا سومیہ جی! خوشی اس بات کی ہے کہ میں ٹھیک جگہ پہنچا ہوں۔ اگر آپ خود کو حسن مراد کی بیٹی ماننے سے انکار کر دیتیں تو“

”مگر میں حسن مراد کی بیٹی ہوں۔ انکار کیوں کروں گی“ سومیہ اس کی بات کاٹ کر

جیرانی سے بولی۔

”او کے، اب چلتا ہوں“ لالی مزید اس کے بولنے سے پہلے اٹھ کر چلا گیا تھا، حالانکہ

سومیہ اس سے پہلے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

”نہات تو سنئے“ وہ پکارتی ہی رہ گئی۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ سومیہ سر تھامے کرسی پر ڈھسے گئی۔

”چھوڑو بیٹی! اپنا دل نہ جلاؤ“

”پھوپھو! امی کو لمحہ بھر کے لیے بھی میرا خیال نہیں آیا تھا۔ اب بھی نہ جانے وہ کہاں ہوں گی، کس شہر میں ہوں گی، یا شاید کسی دوسرے ملک چلی گئی ہوں، کیا پتا اس شہر میں موجود ہوں“ سومیہ ہونٹ کانٹتے ہوئے تلخی سے بول رہی تھی۔

”سنا تو تھا، کسی دوسرے ملک چلی گئی ہے۔ ایسی عیاش عورتوں کا کیا بھروسہ، دوسرے والے کے پاس بھی نکلی ہوگی یا نہیں“ پھوپھو تنفر سے کہتی رہیں۔ ”دفع دور کرو اس مردودنی کو۔ تمہیں میلاد کی تفصیل تو بتائی نہیں، بڑا وسیع انتظام کیا تھا میرا“

”اچھا.....“ سومیہ نے بے دھیانی میں کہا۔

”تمہیں سب ہی پوچھ رہے تھے، سیکندہ تو جان کو آ رہی تھی، سومیہ کو کیوں نہیں لائیں“

”آپ نے پھر کیا بتایا؟“ سومیہ اب بھی کسی سوچ میں گم تھی۔

”سب ہی جانتے ہیں، تم کہیں نہیں آتی جاتیں۔ نہ جانے بار بار کریدتے کیوں ہیں لوگ“

”کیا مطلب؟“ سومیہ چونکی۔

”چھوڑو، رہنے دو“

”بتائیے نا پھوپھو، اس نے اصرار کیا۔

”تمہارا دل برا ہوگا“ پھوپھو تذذب کا شکار تھیں۔

”میں بہت حقیقت پسند ہوں۔ آپ بتادیں پھوپھو“

”سمیرا کی نند کہنے لگی۔ سومیہ احساس کمتری کا شکار ہے۔ چار لوگوں میں بیٹھنے کا سلیقہ نہیں ہے اسے، اسی لیے کہیں بھی آتی جاتی نہیں“ پھوپھو نے جھجکتے ہوئے اس کے اصرار پر بتایا۔

”تو ٹھیک ہی کہتی ہے“ سومیہ لا پرواہی سے بولی۔

”ہونہ، نہ جانے لوگ خود کو سمجھتے کیا ہیں“ پھوپھو بھری بیٹھی تھیں۔ سمیرا باجی کی نند، پھوپھو کو ویسے بھی پسند نہیں تھی۔

”پھوپھو! مجھے نیند آرہی ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں“ سومیہ اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا سر بہت بھاری ہونے لگا تھا۔

”بیٹا! یاد سے دوائی کھا کر سونا“ پھوپھو نے تاکید کی تھی۔

”یہ کون تھا؟ کیوں آیا تھا؟ یا اللہ! کوئی چور، ڈاکو نہ ہو، گھر کی لوکیشن دیکھ گیا ہے۔ رات کو ڈاکہ ڈالنے نہ آجائے، یا اللہ! ہمیں محفوظ رکھنا، میرے اللہ ہماری حفاظت فرماتا“ وہ زور و شور سے دعائیں مانگنے میں مصروف تھی۔ پھوپھو جلد ہی لوٹ آئی تھیں۔ سومیہ نے انہیں اس اجنبی مہمان کے بارے میں بتایا۔

”تم میں اتنی عقل بھی نہیں سومیہ! کیوں اسے اندر لے کر آئی تھیں۔ تمہیں اکیلا دیکھ کر کوئی نقصان پہنچا جاتا۔ ذکیتی کر لیتا، کچھ بھی ہو سکتا تھا، کسی کا کیا بھروسہ“ پھوپھو پہلی مرتبہ اس پر چلا رہی تھیں۔ ”تم سے ایسی کسی غیر ذمہ داری کی مجھے توقع تو نہیں تھی“

”پھوپھو! مجھے معاف کر دیں“ وہ بری طرح شرمندہ تھی۔

”کیا معاف کر دوں“ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا، میری برسوں کی ریاضت مٹی میں رل جاتی“ پھوپھو ناراضی سے گویا ہوئیں۔

”سوری پھوپھو!“ سومیہ کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

”اب رو کیوں رہی ہو؟“ پھوپھو کو اور بھی غصہ آ گیا۔

”آپ خفا جو ہو رہی ہیں“ وہ معصومیت سے بولی۔

”اچھا، بس کرو“ پھوپھو کا دل بھر آیا تھا، اسے آنسو بہاتا دیکھ کر۔

”آپ نے مجھے معاف کر دیا؟“

”ہاں..... مگر آئندہ ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا“ پھوپھو نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”کچھ اور تو نہیں بولا تھا وہ“

”نہیں.....“ سومیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہ جانے واپس اس گھر میں آنے کا میرا یہ فیصلہ درست بھی ہے کہ نہیں۔ اب پتا نہیں کون کون اٹھ کر حسن مراد کا پوچھتا چلا آئے گا“ پھوپھو کے چہرے پر تنگہ تھا۔ جو کہانی اختتام پذیر ہو گئی تھی۔ پھر سے دہرائی جائے گی“ پھوپھو کے خدشات بھی درست تھے۔

”ہم یہاں نہ ہی آتے، یہ گھر تو ویسے بھی منحوس ہے“ سومیہ تلخی سے بولی۔

”ایسے نہیں کہتے بیٹا“ پھوپھو فوراً انوک گئیں۔

”کتنے شوق سے ابونے امی کے لیے یہ گھر بنوایا ہوگا اور امی نے ان کے ساتھ کیا کیا“

نفرت سے سومیہ کا روم روم سلگ اٹھا۔

”تم باقاعدہ کس ڈاکٹر سے چیک اپ کرواتی ہو؟“ سہیل بھائی اور باجی دونوں بہت عرصے بعد ادھر آکھٹے آئے تھے۔ سہیل بھائی کی اپنی بہت سی مصروفیات تھیں۔ وقت کی کمی کے باعث وہ اپنے بچوں کے لیے بہت کم وقت نکال پاتے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد سب چھوٹے سے لاؤنج میں جمع تھے۔ جب اچانک سہیل بھائی نے گفتگو کا رخ بدل کر سومیہ کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا جو کہ ہمیشہ کی طرح چپکے سے اٹھ کر جانے والی تھی۔

”جی!“ سومیہ اچھل کر چلی۔ باقاعدہ تو وہ کبھی چیک اپ کروانے نہیں جاتی تھی۔ البتہ رپورٹس وغیرہ دکھا کر پھوپھو خود دوائیں لے آتی تھیں۔

”ریاض حسین، سومیہ کے معالج ہیں۔ ان ہی کے مشورے کے مطابق دوائی لاتی ہوں“ سومیہ کے بجائے پھوپھو نے جواب دیا۔

”ہوں، وہ اچھے ڈاکٹر ہیں۔ خوب شہرت رکھتے ہیں“ سہیل بھائی مطمئن ہو کر سر ہلانے لگے تھے۔

”اور کیا مصروفیت ہے سومیہ تمہاری؟“

”کچھ نہیں بھائی جان“ ہمیشہ کی طرح سومیہ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

”کوئی شارٹ کورس ہی کرلو“ سہیل بھائی نے مخلصانہ مشورہ دیا۔

”ہاں..... سومیہ! تم کوئی کورس کیوں نہیں کر لیتیں، یہ تو بہترین مصروفیت ہے“ زینیرا باجی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”سوچوں گی“ سومیہ نے جان چھڑانی چاہی۔

”بس سوچتی ہی رہنا“ باجی نے خفگی سے کہا۔

”سمیرا کی نند کا رشتہ طے ہو گیا ہے“ پھوپھو کو اچانک خیال آیا تو بتانے لگیں۔

”اچھا“ باجی کو حیرت ہوئی ”کہاں؟“

”دور کے رشتے دار ہیں سیکنڈ کے“ پھوپھو نے مزید بتایا۔

”واہ مولا! فرح جیسی بھی اپنے گھریار کی ہونے لگی۔ مجھ سے بھی چار سال بڑی ہے“

باجی کے چہرے پر ملال چھا گیا ”بھلا سومیہ میں کیا کمی ہے، مگر پھر بھی، وہ سوچتی رہ گئیں۔“

”اللہ میری بچی کے حصے کی خوشیوں سے جلد ہی اسے بھی نواز دے“ پھوپھو آبدیدہ

ہو گئیں۔

”خوشیاں دستک دے کر لوٹ جاتی ہیں۔ اگر ان کا استقبال نہ کیا جائے تو“ سہیل بھائی نے عام سے لہجے میں بتایا۔ پھوپھو نگاہ چراگئی تھیں، جبکہ سومیہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ باجی بھی اس کے پیچھے آگئی تھیں۔ سومیہ نے برتنوں کے ڈھیر کو دھوتے ہوئے باجی کو بولتے ہوئے سنا۔

”آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ کافی دنوں سے سوچ رہی تھی، تم سے اس موضوع پر بات کروں گی مگر وقت ہی نہیں مل سکا کچھ دیر کے لیے ہی یہاں آ جاتی“

”مسئلہ، کیسا مسئلہ؟“ سومیہ حیران ہی تو رہ گئی۔

”ہر اچھے رشتے میں کیڑے نکلے بیٹھ جاتی ہو۔ ادھر امی کی آنکھ میں بھی کوئی بندہ نہیں چٹا، آخر تم چاہتی کیا ہو؟“ باجی گویا سارے حساب بے باق کرنا چاہتی تھیں۔ سومیہ کچھ پل کے لیے باجی کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”آپ کے خیال میں میرے پاس کون سا آپشن ہے جو میں بلاوجہ کسی بھی رشتے کو ریجیکٹ کروں گی“

”تو پھر اس دیر کی وجہ؟“

”یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ شاید اللہ کو ابھی منظور نہیں“ وہ سادگی سے کہتے ہوئے برتنوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”تمہاری یہ“ مظلومیت ”ہمیں ایک دن کسی بڑے نقصان سے دو چار کر دے گی۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ“ زینیرا باجی نے ترشی سے کہا۔

”مظلومیت“ سومیہ زیر لب بڑبڑائی ”میں کچھ سمجھ نہیں“

”اتنا انجان کیوں بنتی ہو“ باجی زنج ہوا انھیں۔ ڈاکٹر اظہر کے پرنسپل کو محض اس بنا پر ناپسند کرنا کہ وہ بھری پری فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوائے حماقت کے کچھ نہیں“

”میں نے ناپسند کیا تھا؟“ سومیہ ٹھنک گئی ”آپ بھی اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ پھوپھو کو ان کا گھریار پسند نہیں آیا تھا۔ بھلا میرے پاس کوئی ایسا اختیار ہے؟“

”تو تم با اختیار کیوں نہیں ہو جاتیں“ باجی آج انہوئی باتیں ہی تو کر رہی تھیں سومیہ زنج ہو گئی۔

”میں کیا کروں؟“

”اپنے فیصلے خود کرو۔ دوسروں کی طرف دیکھنا چھوڑ دو۔ تمہارے پاس کچھ اختیارات ہیں“ باجی نے اس کے شانے پر دباؤ ڈال کر نرمی سے کہا۔

”کیسے اختیارات؟“ سومیہ سچ گھبرا گئی۔

”کم از کم امی کو اپنی پسند ناپسند سے تو آگاہ کر سکتی ہو۔ وہ تمہاری محبت میں فیصلہ نہیں کر پار ہیں۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کیا کریں۔ تم ان کا ساتھ دو۔ انہیں سمجھنے کی کوشش کرو“

”اچھا“ سومیہ نے ہونٹ پٹ سے سر ہلا دیا۔

”سومیہ! تم مجھے بہت عزیز ہو اور مجھے لگتا ہے، تمہارے ساتھ کچھ غلط ہو رہا ہے“ زبیرا باجی کے چہرے پر تفکر کا جال بنا ہوا تھا۔

”اور یہ غلط کون کر رہا ہے یا کرنا چاہتا ہے؟ یہ پوچھنے کا سومیہ میں نہ حوصلہ تھا نہ جرأت۔

”سمیل تمہارے بارے میں بہت متفکر ہیں، وہ کہتے ہیں۔ تم نے اپنی تعلیم کو ذرا پکڑ کر کے اچھا نہیں کیا۔ کتنا سمجھایا تھا تمہیں میں نے میٹرک کے پرچے دے لو“

زبیرا باجی تا سف سے کہہ رہی تھیں۔ سومیہ ہونٹ کچلتے ہوئے بے اختیار بیتے وقت کو سوچنے لگی۔ ماضی کے کسی ایک بھی لمحے نے سومیہ کو کوئی اچھی یاد ہرگز نہیں سوچی تھی۔ ہر طرف دکھ، تنہائی آنسو اور خوف ہی تو تھا جس نے ہمیشہ اسے لوگوں سے دور ہی رکھا۔

یہ اس وقت کی بات تھی جب وہ پرانے محلے میں رہتے تھے۔ پھوپھو کی ارد گرد کے پڑوسیوں سے بہت دوستی تھی۔ گھر میں ہر وقت میلہ سالگرہ ہوتا تھا۔ کوئی آ رہا ہے، کوئی جا رہا ہے، پھوپھو کسی کو اچھا بنا کر دے رہی ہیں۔ کسی کو سویٹر کے نمونے سکھا رہی ہیں۔ کسی کو انگریزی کی ترکیب پوچھنا ہوتی۔ کوئی سلائی سیکھنا چاہتا۔ کچھ کو کڑھائی سے دلچسپی ہوتی۔ غرض ہر عمر کی خواتین گھر میں آتی رہتی تھیں۔ مرد تو گھر میں کوئی تھا نہیں، پھوپھو کا بیٹا ان دنوں دوسرے شہر میں زیر تعلیم تھا۔ کبھی کبھار ہی گھر آتا تھا۔ سو روک ٹوک کس نے کرنا تھی۔

لڑکپن کا دور گزر رہا تھا ہائی سکول کی چار دیواری کے باہر اس کی ہم عمر لڑکیوں نے بہت سی مصروفیت ڈھونڈ لی تھیں۔ وہ برسات کے دن تھے۔ گلیاں، بازار پانی اور کچھڑ سے لت پت تھے۔ ایسے ہی جاڑے کی ایک صبح پھوپھو نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا۔ وہ اسے کافی دیر زمانے کی اونچ نیچ کے بارے میں سمجھاتی رہی تھیں۔

”دیکھو بیٹی! آج وہ وقت آ گیا ہے کہ میں تمہیں کچھ ”سچائیوں“ کے بارے میں

بتا دوں۔ کچھ باتوں کو تم خود بھی اب جان گئی ہوگی کہ ہم کچھ نہ بھی بولیں، کچھ نہ بھی کہیں۔ کچھ بھلا دینا چاہیں۔ مگر لوگ نہ بھولتے ہیں نہ بھولنے دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس قصے سے واقف ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ ثمانہ نے حسن اور تمہارے ساتھ کیا کیا تھا۔ اپنے عیش و آرام کی خاطر اس نے جو سوائیاں خریدی ہیں۔ ان کے کچھ چھینے تمہارے وجود پر بھی پڑیں گے۔ جو بدنامی کی فضل ثمانہ تمہارے لیے ”بو“ کر چلی گئی ہے۔ اسے کاٹنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ لوگوں کی باتیں، رویے تمہیں چھلنی کریں گے مگر بیٹا! خود کو مضبوط رکھنا۔ اس معاشرے کے قوانین بڑے سخت ہیں۔ ایک فرد واحد کی غلطی کی سزا نسلوں کو بھگتنی پڑتی ہے اور جب کوئی عورت ایسا انتہائی قدم اٹھاتی ہے تو پھر آئندہ آنے والی نسلوں پر اس کے بد اثرات بھی ضرور پڑتے ہیں“

”وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔ اس کے آنسو گالوں پر بہتے ہوئے فرش پر گر رہے تھے۔ پھوپھو نے جو کہا تھا۔ سچ کہا تھا، اپنی ماں کے سارے بھگتان سومیہ کو بھگتنے پڑے تھے۔ یہ اللہ کا شکر تھا اس کا کوئی لمبا چوڑا تو کیا مختصر بھی خاندان نہیں تھا۔ سوائے پھوپھو کے اس دنیا میں اس نے اپنا کوئی ہمدرد رشتے دار نہیں دیکھا تھا۔ اس میں بھی اللہ کی کوئی بہتری تھی۔

خاندان کی کسی نفرت کا اسے سامنا کرنا نہیں پڑا تھا۔ البتہ نجانے ان پڑوسیوں کو ایک رات میں کیا ہو گیا۔ اس کی ہم جماعت لڑکیوں نے ان کے گھر آنا چھوڑ دیا۔ جو اس کے ہمراہ سکول جاتی تھیں، انہوں نے اسکول جاتے ہوئے اب ان کے گیٹ پر تیل دینا چھوڑ دی تھی۔ اسکول فیلو اور کلاس فیلو اسے دیکھتے ہی سرگوشیوں میں نجانے کیا کیا باتیں کرنے لگتی تھیں۔ ایک دن میتھس کی ایک ٹیچر اپنی ساتھی ٹیچر کو بتا رہی تھی۔

”اتنے سالوں سے یہ لوگ ہمارے محلے میں رہ رہے ہیں۔ ہم ان کے بارے میں جان ہی نہیں سکے“

”کیا؟“ دوسری ٹیچر نے دلچسپی سے پوچھا۔

”سومیہ کی ماں گھر سے بھاگ گئی تھی“ اس نے سرگوشی نما آواز میں بتایا۔

”تمہیں کس نے بتایا ہے“ اردو کی مس حنا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”پورے محلے میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل چکی ہے“

”سچی بات ہے، ایسی باتیں کبھی نہیں چھپ سکتیں“ میتھس کی ٹیچر نے تا سف سے کہا۔

”پھر بھی آخر کسی نے تو بات کی ہوگی“ مس حنا نے بے چینی سے پوچھا۔

”بات گھر سے نکلے تب ہی پھیلتی ہے،“ میتھس کی ٹیچر سنجیدگی سے کہنے لگیں۔

”گھر سے کس نے نکالی؟“ سب نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”سومیہ کی پھوپھی ہمارے گھر آئی تھیں۔ باتوں باتوں میں سومیہ کی ماں کا قصہ چھڑ گیا۔ بس جذبات میں آکر انہوں نے سچائی بتادی۔ بہت رورہی تھیں بے چاری۔ میری امی کے ساتھ ان کی بہت دوستی ہے نا۔ پھر بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ ویسے بھی ایسی باتیں بھلا کب تک چھپائی جاسکتی ہیں“

وہ سب اب تاسف کا اظہار کر رہی تھیں مگر سومیہ سے پھر کچھ اور سنا ہی نہیں گیا۔ سہیلیاں تو کیا استانیوں نے بھی اسے ترحم بھری نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی دوستوں کی ماؤں نے اپنی بیٹیوں کو سومیہ سے کلام کرنے کے منع کر دیا۔ وہ تنہا اسکول جانے لگی تھی۔ مگر اب محلے کے آوارہ لڑکوں تک بھی بات پہنچ گئی تھی۔ وہ اس کے راستے میں کھڑے ہو جاتے۔ تمسخر اڑاتے، قہقہے لگاتے۔ اسے چھڑنے کی کوشش کرتے۔

”ہائے بھگوڑی ماں کی اتنی چھوٹی موٹی بیٹی“

”یہ سادگی اور معصومیت دکھا کر اماں کے عیب دھونے ہیں، بادشاہو“ سومیہ کو لگتا تھا اس کے وجود کے چیتھڑے اڑ رہے ہیں۔ وہ لمحہ لمحہ مرتی تھی۔ پھر ایک دن اس نے اسکول کبھی نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سب نے اسے بہت سمجھایا تھا۔ باجیاں بہت ناراض ہوئیں۔ وہ چاہتی تھیں، سومیہ کم از کم میٹرک کے پرچے تو دے لیتی۔ مگر سومیہ کی نا، ہاں میں نہ بدلی۔ تین سال مزید اس محلے میں رہنے کے بعد انہوں نے مکان بدل لیا تھا مگر یہ تین سال سومیہ کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھے۔

نئے گھر میں شفٹ ہوتے ہی یکے بعد دیگرے باجیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ سب کچھ آہستہ آہستہ معمول پر آ گیا مگر سومیہ کے لیے زندگی صرف ایک نقطے پر ٹھہر گئی تھی۔ کچھ عرصہ مزید گزرا تو پھوپھو سومیہ کو لے کر اپنے گھر میں آ گئیں۔ مگر اب بھی نجانے کون کون پرانے زخم ادھیڑنے آ جاتا تھا۔ البتہ اس کالونی کے لوگ دوسروں کی زندگیوں میں مداخلت کرنے والے نہیں تھے۔ سب اپنے آپ میں گمن رہتے۔ کوئی کسی دوسرے کی ٹوہ میں بے چین نہیں ہوتا تھا۔

☆☆☆

صرف کچھ دن بعد ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ دو خواتین کسی گاڑی میں سومیہ کے رشتے کی غرض سے آئیں۔ ان میں ایک تو بوڑھی عورت تھی۔ البتہ چہرے مہرے۔ کافی

چالاک لگتی تھی اور دوسری کافی صحت مند گوری چنی بائیس تیس سالہ لڑکی تھی۔ انہوں نے سومیہ کو دیکھا اور پسند کر لیا۔ پھوپھو کو بھدا اصرار اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ جاتے ہی حسد نامی لڑکی کے کئی فون آئے۔ ناچار پھوپھو نے زیر اباجی اور سہیل بھائی کو ان کے گھر بھیج دیا۔ خود وہ پیر میں موج آجانے کی وجہ سے جانیں سکی تھیں۔ زیر اباجی واپس آئیں تو بہت خوش تھیں۔ سہیل بھائی بھی مطمئن نظر آ رہے تھے۔

”امی! گاؤں کے سب ہی گھروں میں اچھا گھر ہے۔ ان لوگوں کا۔ دو منزلہ، جدید انداز میں بنا ہوا، میرے ذہن میں کچھ اور ہی تصور تھا۔ کچا پکا گھر، مچن میں بندھے جانور، گندگی، غلاظت، تاہم ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ لڑکا بھی اکلوتا ہے۔ آڑھت کا کاروبار ہے۔ تعلیم یافتہ بہت شائستہ مزاج ہے اس کا سہیل کو تو بہت ہی پسند آیا ہے۔ ماں اس کی بہت بیمار ہے۔ چلنے پھرنے سے قاصر۔ کمرے تک محدود ہے۔ امی! ہر لحاظ سے بہترین رشتہ ہے، آپ ہاں کر دیں۔ کیوں کہ سب سے بہترین چیز یہ ہے کہ وہ سومیہ کو بہت چاہے سے مانگ رہے ہیں“

زیر اباجی بہت مسرور تھیں۔ سب سے بڑی بات سہیل بھائی اس رشتے کے حامی تھے۔ سو باقی کے معاملات بہت تیزی سے پنپائے گئے۔ انہیں جینز کی ضرورت نہیں تھی۔ سختی سے منع کر دیا گیا تھا۔ مگر پھر بھی پھوپھو کچھ نہ کچھ بنانا چاہتی تھیں۔

دوسری طرف بھی شادی کی دھوم دھام سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لالی کی مصروفیات دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ پورے گھر کو روشنیوں سے سجایا جا رہا تھا۔ جبکہ جمال ابھی تک حیران تھا۔ اسے لالی کی کسی بات پر یقین نہیں تھا۔ وہ یقین کرتا بھی کیسے، وہ خود اس ”مہم“ پر پچھلے چار پانچ سالوں سے خود کو کھپا رہا تھا اور اب لالی صرف ایک ہی ملاقات میں اس کی پھوپھی کی گمشدہ بیٹی کو نہ صرف دریافت کر چکا تھا بلکہ بالائی بالا شادی کے معاملات تک پنپا لیے تھے۔

اماں بہت خوش تھیں۔ اور لالی سے تو کچھ زیادہ ہی خوش تھیں۔ حسد بھی بہت مسرور دکھائی دیتی تھی۔ اس کے خیال میں سومیہ کے آنے کے بعد وہ جمال اور لالی سے زیادہ بہتر مقابلہ کر سکتی تھی۔

سومیہ سے شادی کے لیے اماں نے اس کی رضا مندی کے متعلق پوچھا تھا۔ جمال کو سومیہ تو کیا کسی بھی لڑکی سے شادی پر اعتراض نہیں تھا۔ بس وہ چاہتا تھا دو چار سال تک شادی کو ہلتی کر دیا جائے۔ مگر اماں کو اب مزید دیر گوارا نہیں تھی۔ سو شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ مگر



وہ اپنی چند الجھنوں کو خفیہ طریقے سے دور کر چکا تھا۔

ایک تو لالی کا کہا سو فیصد سچ تھا کہ سومیہ حسن مراد اور ثمانہ مراد کی بیٹی ہے۔ اور یہ کہ چند سال پہلے ہی یہ لوگ ”حسن منزل“ دوبارہ شفٹ ہوئے تھے مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا۔ سومیہ اتنا عرصہ کس کے ساتھ رہی ہے۔ کون اس کی سرپرستی کرتا رہا تھا۔ وہ اماں سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ چند اور الجھنوں کو رفع کرنا چاہتا تھا اتفاق کی بات تھی اسی رات اماں سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔

”اماں! سب سے قریبی تعلق تو آپ کا تھا سومیہ سے، تو ابا اور آپ سومیہ کو لینے کیوں نہ گئے؟ آپ کا حق بنتا تھا کہ سومیہ کو نو رائے روانہ ہو جاتیں“

”ادھر کفن دفن سے فراغت کے بعد سومیہ کو لینے ہی تو گئے تھے مگر حسن کے گھر تالا لگا ہوا تھا۔ آس پڑوس سے پوچھا تھا۔ ہر در کھٹکھٹایا کہ حسن کی چھ ماہ کی بچی کا کچھ پتا چل سکے۔ مگر حسن کے پڑوسی جو کرائے دار تھے، وہ سننے میں آیا تھا کہیں دوپہر سے سامان ٹرک میں لوڈ کروا کے کہیں چلے گئے ہیں۔ حسن کا اپنے اس پڑوسی کے علاوہ اور کسی کیساتھ ملنا ملنا نہیں تھا“ اماں تھکی تھکی آواز میں کھانتے ہوئے یادداشت کے خانے کھنگالتے ہوئے بتانے لگیں۔

”ابا نے دوبارہ کوشش نہیں کی؟“

”اے بھلا ضرورت کیا تھی کوشش کرنے کی اس نے تو ہزار دفعہ شکر ادا کیا تھا کہ سومیہ کی ذمہ داری سے جان چھوٹ گئی۔ اسے اپنی اولاد وبال لگتی تھی۔ بھانجی کو کیسے پالتا۔ یہ تو میرے بھائی کا جگر تھا، ہم دونوں پر اپنی چھایا کر لی۔ ہر کوئی تو بھائی شریز جیسا نہیں ہو سکتا“ اماں کو اپنے مرحوم بھائی یاد آ گئے تھے، اسی لیے وہ رونے لگی تھیں۔

”جنت! او جنت، یہ کیا بد شگون کی کر رہی ہو۔ خیر سے بیٹے کا بیاہ ہے اور تم آنسو بہا رہی ہو“ حمید بن بواغلظ موقع پر انٹری مارنے کی شوقین تھیں۔ جمال کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر بوا کی موجودگی کے خیال سے خاموش رہا۔

☆☆☆

برات والے دن بہت رونق تھی۔ دونوں طرف کے انتظامات بہت شاندار تھے۔ مہندی والی رات پھوپھو بہت دیر سومیہ کے پاس بیٹھی رہی تھیں۔ بار بار ان کی آنکھیں بھر آتیں۔ دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ سومیہ خود نجانے کتنی مرتبہ رو چکی تھی۔ آنے والے

لمحات اسے خوف زدہ کر رہے تھے۔ اس کے دل میں دوسروں کی پکڑ دھکڑ پورے دل سے خوش نہیں ہونے دے رہی تھی۔ کئی مرتبہ سومیہ کا دل چاہا تھا کہ وہ اپنے خدشات کسی سے شیئر کرے۔ باجی سے یا پھر پھوپھو سے۔

”تم کچھ کہنا چاہتی ہو سوئی!“ پھوپھو اس کے لرزتے ہونٹوں میں چھپے سوال کو سمجھ کر نرمی سے پوچھنے لگیں۔

”جی“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”کیا؟“ پھوپھو نے پیار سے پوچھا۔

”پھوپھو! میں چاہتی تھی کہ آپ انہیں سب کچھ بتادیں“ لرزتے لہجے میں سومیہ نے کہہ دیا۔

”کیا بتا دو؟“ پھوپھو حیران ہوئیں ”اور کسے بتا دوں“

”جمال کے گھر والوں کو“

”کیا؟“ وہ چونک گئیں۔

”میری امی کے متعلق“ وہ لچھ لچھ کر خاموش ہوئی ”پھوپھو! میں نہیں چاہتی کہ کل انہیں جب میری ماں کے ماضی کے بارے میں خبر ہو تو انہیں اس رشتے پر بچھتا پڑے۔ آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ کتنی مرتبہ لوگ مجھے اسی وجہ سے رنجیکٹ کر کے گئے تھے کہ میری ماں کردار کی ہلکی تھی اور شاید ماں والی ”خوبیاں“ مجھ میں بھی موجود ہوں“

”اب یہ ممکن نہیں۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ سب کچھ طے پا چکا ہے۔ کل برات آئے گی۔ تم جانتی ہو کہ تمہاری شادی میرے سارے بوجھ اتار دے گی پھر ندیم بھی کچھ مہینوں تک مجھے اپنے پاس بلوانے والا ہے میں ہر فکر سے آزاد ہو کر جانا چاہتی ہوں۔ تم بھی بے کاری فکریں پالنا چھوڑ دو۔ خوش رہو، اور اچھی اچھی باتیں سوچو“ پھوپھو اس کی پیشانی چوم کر اٹھ گئیں۔

دوسرے دن بارات اپنے مقررہ وقت پر پہنچ گئی تھی۔ نکاح بخیر و خوبی ہو گیا مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ سہیل بھائی اور زینر باجی مہمانوں سے مل رہے تھے۔ مبارکیں وصول کر رہے تھے۔

”جنت نے غیروں میں بیٹایا ہا ہے؟“ مہمان خواتین میں سے کسی بڑی بی نے پوچھا۔

”اے کھان؟ اپنی ثمانہ کی بیٹی ہے“ کسی دوسری خاتون نے بڑے جوش کے عالم

میں بتایا۔

”ثمانہ کی بیٹی“ کئی عورتیں جہاں ٹھنک کر ایک دوسرے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی تھیں وہیں پھوپھو کے قدم گویا زمین نے جکڑ لیے۔ وہ وحشت بھری آنکھوں سے مہمان خواتین کو دیکھ رہی تھیں۔

”ثمانہ کی بیٹی۔ ثمانہ کی بیٹی“ وہ زیر لب بڑبڑائیں ”ثمانہ کا یہاں کیا ذکر۔ یہ لوگ ثمانہ کو کیسے جانتے ہیں؟ ثمانہ ان کی کیا گنتی ہے؟ سومیہ کو میں نے کہاں بیاہ دیا؟ بغیر جانچ پڑتال کیے بغیر جانچے، پرکھے یہ میں نے کیا کر دیا ہے“ وہ وحشت زدہ سی جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔

”جمال ثمانہ کا بھتیجا ہے نا“ ایک اور عورت وضاحت کر رہی تھی۔

”ثمانہ کا بھتیجا“ پھوپھو کے دماغ پر تھوڑے برسنے لگے۔ وہ لرزتے قدموں سے چلتی ہوئی شامیانے سے باہر آئی تھیں۔ ان کا پورا وجود پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ خود کو ریشہ زدہ کوئی عمر رسیدہ عورت تصور کرنے لگی تھیں محض لمحہ بھر میں۔

”سومیہ، حسن مراد کی بیٹی ہے۔ اس نے مجھے بتایا اور میں نے یقین کر لیا۔ ہمیں کسی اور تصدیق کسی اور وضاحت یا پھر کسی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں۔ آج تمہیں یقین آ گیا ہے نا؟ میں نے کچھ اور ذرائع سے بھی انفارمیشن لی ہیں۔ یہ مناسب موقع نہیں۔ تفصیل گھر جا کر بتاؤں گی جمال بھائی! ابھی تو سالیوں کے زرخے میں اسٹیج پر بیٹھے ہو۔ اچھا، میں ذرا شامیانے سے باہر نکلا ہوں۔ ہاں، ہاں گھر جا کر بھی یہ بات بتا سکتا تھا تاہم میں نے سوچا یہ ”مہم“ چونکہ میری وجہ سے کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے تو مجھے اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ اچھا، تم بھی گھر جا کر بتاؤ گے۔ ٹھیک ہے، آتا ہوں یار! ناراض کیوں ہوتے ہو“

وہ کوئی نوجوان تھا۔ جو موبائل کان سے لگائے ہوئے خوشگوار موڈ کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

”ابھی تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔ سومیہ کے ساتھ ایک عجیب و غریب کہانی بھی اس کے ہمراہ آئے گی۔ میں بھی حیران ہوا تھا۔ تم بھی حیران ہو گے میں نے بہت محنت کے بعد بہت کچھ معلوم کیا ہے۔ سب کچھ بتاؤں گا مگر ابھی نہیں۔ ابھی تو میں رواں دریا کی موجوں کو دیکھ رہا ہوں۔ دیکھو اس دریا میں طغیانی کب آتی ہے“

اب وہ موبائل جب میں پھنسا کر شامیانے کے داخلی دروازے سے اندر چلا گیا تھا جبکہ شبانہ اختر کی رہی سہی ہمتیں بھی جواب دے گئیں۔ انہیں کچھ ہی پل لگے ہوں گے اگلے لمحہ

عمل تیار کرتے ہیں۔ پھر وہ مطمئن ہو کر گھر کی طرف بڑھ گئی تھیں جہاں سومیہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اب جو کرنا تھا۔ بہت جلد کرنا تھا ورنہ۔

☆☆☆

نجانے دن کا کون سا پہر تھا جب دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ سومیہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی تھی۔ اصلی گلابوں سے بھی خوشنما لڑیوں کو پیچھے ہٹا کر اس نے وحشت کے عالم میں ارد گرد نظر دوڑائی۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ اس کا سویا سویا ذہن بیدار ہو گیا۔ یوں لگتا تھا نیند کی رات والی کیفیت کا اثر ایک دم غائب ہو گیا۔ وہ اپنی مکھڑی ہمتوں کو مجتمع کرنے کے بعد بھی بے دم سی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں رات کا ایک ایک منظر دیکھ رہی تھیں۔

”میں نے جمال سے کیا کہا تھا“ بہت سوچنے کے بعد بھی اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ مسلسل دماغ پر زور ڈالنے کی وجہ سے سر میں میسیں اٹھنے لگی تھیں۔ ہمیشہ اس پر مسلط رہنے والی غنودگی اس وقت غائب تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ تمام رات سوتی رہی تھی۔ یا سوتی جاگتی کیفیت میں تھی۔ سومیہ کو یوں لگ رہا تھا۔ یہ رات ایک خواب تھی۔ وہ خواب کے سفر پر رواں دواں تھی اور اس خواب کے زیر اثر وہ جمال سے مخاطب تھی۔ جمال اس سے کچھ سوال کر رہا تھا، کچھ پوچھ رہا تھا۔ مگر اس نے بھی تو جمال سے کچھ کہا تھا۔ کیا؟ یہ اب سومیہ کو بھول چکا تھا جو دوائی کھا کر وہ اپنے گھر سے یہاں تک آئی تھی۔ اس کا اثر اتنا شدید تھا کہ سومیہ اپنی سدھ بدھ بھول گئی تھی۔ دروازے پر ایک دفعہ پھر زوردار دستک ہوئی تھی۔ اگرچہ دروازہ لاک نہیں تھا مگر کسی نے کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سومیہ ابھی تک رات کا لباس پہنے ہوئے تھی ایک مرتبہ پھر عجیب سے احساسات نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اس نے دروازہ کھولنے کے بجائے چپکے سے کنڈی چڑادی تھی۔ پھر اپنا سوٹ کیس کھینٹ کر کپڑے نکالنے لگی۔ دروازہ اب بھی وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔ کپڑے بدل کر اس نے بال بنائے تھے پھر دوپٹہ اوڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے دیکھے بھالے دو چہرے آنکھوں میں نظر لیے نظر آئے۔

”تھینک گاڈ! آپ نے دروازہ تو کھولا“ لالی نے بے اختیار چھت کی طرف دیکھ کر ہاتھ بلند کیے۔

”میں تو سمجھ رہا تھا آپ سوسائیز (خودکشی) کر چکی ہیں حالانکہ میر بھائی اتنا بھی برا

نہیں۔ خیر، آپ کو زندہ سلامت دیکھ کر پیٹ میں بل چل چک گئی ہے۔ تھانیدارنی جی! آپ ذرا فائٹ اپنے خوبصورت ہاتھوں سے ناشتہ بنا کر لائیں۔ سومیہ جی کو بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔

لالی کی زبان فرانے بھر رہی تھی۔ تھانیدارنی کو غصہ آگیا۔

”لو آپ پہلے گولڈ میڈل حاصل کرلو۔ ستارہ جرات لے لو“ لالی نے بازو سے پکڑ کر حسنه کو آگے کیا۔

سومیہ کے لبوں پر بھولی ہنسی سی مسکان پھیل گئی۔

”دو پہر بخیر!“ حسنه نے مسکراتے ہوئے سومیہ کو گلے لگایا۔ ”تم اٹھ گئی ہو، میں تمہارے لیے ناشتہ لاتی ہوں مگر اس سے بھی پہلے تم پھوپھی سے مل لو۔ رات کو تم بھی تھکی ہوئی تھیں اور انہوں نے بھی سرسری سادہ دیکھا تھا۔ اب صبح سے بے چین ہیں کہ سومیہ کو بھیجوں“

”پھوپھی کہاں ہیں؟ کس طرف جاتا ہے؟“ سومیہ نے نرمی سے پوچھا۔ وہ ان زہریلی سوچوں سے پیچھا چھڑانے اور اپنا دھیان بنانے کی غرض سے بولی۔

”وہ تمہاری پھوپھی نہیں ہیں سومیہ! میرے ساتھ آؤ۔ انتظار کر رہی ہیں تمہارا۔ جمال بھائی بھی وہیں ہیں۔ میں ابھی اصلی دیسی گھی سے پرائے بنا کر لاتی ہوں“

حسنا اس کا ہاتھ تھامے ایک راہداری کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اماں کے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے اندر بھیجنے کے بعد وہ کسی کے ”تھانیدارنی جی“ پکارنے پر واپس پلٹ گئی تھی۔ سومیہ نے اماں کے کمرے میں قدم رکھا تو سامنے بیٹھے جمال کو دیکھ کر اس کی سانسیں الجھنے لگیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ دمہ کا آخری ایک بس ابھی ہو جائے گا، جمال نے گہری کاٹ دار طعنیہ نظر اس کی طرف اچھالی، سومیہ کے رہے سبے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔

”آؤ، میری دمی رانی! میری بچی، ادھر آؤ میرے پاس“ اماں نے والہانہ انداز میں بازو اسے دیکھتے ہی پھیلا لیے تھے وہ برات کے ساتھ نہیں جا سکی تھیں تاہم رات کو بھی انہوں نے سومیہ کا اسی انداز میں استقبال کیا تھا۔ سومیہ کسی معمول کی طرح ان کی کھلی بانہوں میں سا گئی۔ ایک لمحے کو تو اسے جمال کی موجودگی میں بھی بھول گئی تھی۔

”رات کو ٹھیک سے نیند تو آگئی تھی۔ نیا ماحول، نئی جگہ، گاؤں میں تمہاری پہلی رات تھی نا۔ گھبرائیں تو نہیں۔“ وہ بڑی محبت سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

”کوئی ایسی ویسی نیند آئی۔ مجھے تو لگتا ہے، پچھلے کئی سالوں سے رات جگا منایا جاتا رہا۔

تھا جو یہاں آکر سونے کی کسر پوری کی گئی“ جمال اس کے بے سدھ سو جانے پر شاید طنز کر رہا تھا۔ سومیہ بری طرح شرمندہ ہو گئی۔ ایک دفعہ پھر لال کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔

”میں نے رات کو بھلا ان سے کیا کہا تھا؟“ وہ سوچتی رہ گئی تھی۔ اماں نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”حسنا نے ناشتہ کروا دیا ہے؟“

”ابھی تو محترمہ باہر تشریف لائی ہیں“ جمال نے پھر طنز کا تیر پھینکا۔

”یہ کمرے میں نہیں سوئے تھے۔ پھر نجانے رات کو کہاں چلے گئے تھے“ سومیہ نے بے اختیار سوچا۔

”پترا! فکر مت کرنا۔ یہاں سب تمہارے اپنے ہیں۔ حسنا تمہاری بہن ہے۔ لالی جو نچال طبیعت رکھتا ہے۔ مگر ہے بہت اچھا، اذہب لحاظ والا۔ اسی نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہ شمانہ اور حسن کی بیٹی کو ڈھونڈ چکا ہے۔ ورنہ اس جمال نے تو مجھے مایوس ہی کر ڈالا تھا۔ جب بھی ترلے، غٹیں کر کے بھجھا، یہ ناکام ہی لوٹ کر آیا۔ لالی میرا بڑے گنوں والا ہے۔ چند دنوں میں تمہارا اتنا پتا معلوم کر کے آگیا تھا۔ سرکاری نوکری کے لیے امتحان دے رکھا ہے۔ لالی۔ تمہاری شادی سے دو دن پہلے اس کا پرچا تھا خیر سے نوکری لگ گئی تو پھر“

”اماں! میں کون ہوں؟“ اس کے لبوں سے سسکاری برآمد ہوئی۔

”تم شمانہ کی بیٹی ہو۔ شمانہ میری چچا زاد بہن تھی، میں تمہاری سگی ممانی ہوں پترا! اماں اسے بانہوں میں بیٹھنے بھرائی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

”تمہاری ماں سے وعدہ کر رکھا تھا۔ زبان دی تھی۔ آج وہ وعدہ پورا ہوا۔ میں نے اپنا عہد نبھادیا۔ میں سرخرو ہوئی۔ اللہ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے“ پھوپھو کہہ رہی تھیں۔

”کیسا وعدہ؟“ سومیہ کو لگا۔ وہ چکر اکر گر جائے گی۔ ”آپ میری سگی ممانی ہیں؟“

”مم۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟“ سومیہ خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کپکپاتی

آواز میں بولی۔

”ابھی کچھ اور بھی کہنے کی حسرت موجود ہے۔ جو کچھ رات کو کہا ہے، اس سے دل نہیں بھرا“

جمال فون پر کسی آڑھتی سے بات کر رہا تھا، موبائل جیب میں رکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا۔

”آپ میری بات سن لیں“ سومیہ رو دینے کو تھی۔ پشیمان، شرمندہ، الجھی الجھی، کھوئی

کھوئی سی، جمال کو لمحہ بھر کے لیے وہ ایب نارمل لگی تھی۔

”رات سے تمہاری ہی توسن رہا ہوں۔ اپنی ماں کی ”خوشی“ کا خیال نہ ہوتا تو اب تک نجانے کیا کر چکا ہوں۔ عرصہ دراز بعد اماں کو خوش دیکھ رہا ہوں۔ اور اماں کی وجہ سے تمہاری بے حیائی کا اعتراف سن کر بھی خاموش ہوں۔ ابھی سارا کچا چٹھا کھول دوں تمہارا تو دو کوڑی کی رہ جاؤ گی سب کی نظروں میں“ جمال نے ایک سلگتی نگاہ اس پر ڈالتی تھی اور پھر اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا ”جب کوئی اور تمہیں پسند تھا تو پھر یہ شادی کا ناکہ کیوں کیا؟“

”رب رحیم کی قسم! جو کہنا چاہتی ہوں ایک دفعہ خاموشی سے سن لیں“ سومیہ اس کے قدموں میں بیٹھ کر کپکپاتی آواز میں بولی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ جمال کے پیروں پر رکھ دیے جمال ششدر رہی تو رہ گیا تھا۔

”میں اپنا اعتبار کھو چکی ہوں۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ اب آپ کو میری کسی بات پر یقین نہیں آئے گا۔ مگر پھر بھی مجھ بد بخت کو وضاحت کا ایک موقع ضرور دیں“

جمال کو اپنے پیروں پر کچھ نمی کا احساس ہوا تھا اس نے جھک کر دیکھا، وہ آنسو تھے۔ سومیہ کے بارش کی بوندوں کی مانند گرتے آنسو، جمال کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ وہ جھنجھلا کر سومیہ پر جھکا تھا۔

”اٹھو، یہ کیا احمقانہ حرکت ہے“ جمال نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا ”جو کہنا ہے۔ یہاں بیٹھ کر کہو“ جمال نے اسے پلنگ پر بٹھایا۔

”میں نہیں جانتی، وقت میرے ساتھ کیا کرے گا۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔ اگر کوئی جان جائے تو۔ مگر کوئی جانے بھی کیسے؟ عربیت جاتی ہے اور کوئی کسی کو کبھی نہیں جان پاتا۔ اور مجھے تو ایسا دعویٰ شروع سے ہی نہیں تھا۔ تمام عمر ایک ”خوف“ کی کیفیت میں خود کو ایک کمرے تک محدود کیے رکھا تھا۔ صرف ایک طعنے کا خوف۔ کسی کی ایک جتنی نگاہ کا خوف۔ تسخراؤ اتنی اس مسکراہٹ کا خوف جو کسی بھی جاننے والے کے لبوں پر مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھتی تھی۔ کوئی مجھے ٹمانہ کی بیٹی کے حوالے سے طعنہ نہ دے۔ کوئی یہ نہ کہہ دے۔ دیکھو یہ ہے ٹمانہ کی بیٹی۔ وہ جو رات کے اندھیرے میں بھاگ گئی تھی۔ اسے بلکتا چھوڑ کر۔ جسے اپنے شوہر کے دوست سے محبت ہو گئی تھی اور جس نے رشتوں کی حرمت کا بھی پاس نہیں رکھا تھا۔ ایسی بے کردار کی ”عورت“ کی بھلا کون عزت کرتا ہے؟

آج تک میں نے اپنی ماں کے حوالے سے جو بھی سنا، وہ سب مجھے دھیرے دھیرے اب نارمل بنا رہا تھا مجھے لگتا تھا، میں پاگل ہو جاؤں گی۔ میں جب جب اپنی ماں کے متعلق سوچتی تھی میری سانس گھٹنے لگتی۔ میرا دم الجھنے لگتا، مجھ پر دورے کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ میری عزیز از جان پھوپھو نے اس کیفیت کو ایک بیماری سمجھ لیا۔ وہ میری دوائیں ڈھونڈنے پر مامور ہو گئیں۔

”سومیہ کے سر میں درد ہے۔ اسے گولی دے دو“

”سومیہ کو نیند نہیں آتی، اسے گولی کھلا دو“

سومیہ کا سانس اکھڑنے لگا ہے اسے کالی بوتل والی دوا پلا دو“

ان ہی باتوں کے درمیان میری زندگی گزری ہے میں نے کبھی کسی سائے کی تلاش میں باہر کے درختوں کی چھایا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ کیا تھا جو سن مراد کی بیٹی کے آنگن میں کوئی درخت نہیں تھا۔ چڑھتا سورج اگر اسے سلگاتا تھا تو کیا ہوا۔ وہ تھوڑی دیر پیش سے بچنے کے لیے اپنی ماں کی طرح کوئی بدنامی کیوں مول لیتی۔ اسے جلنا منظور تھا مگر بدنام ہونا نہیں۔

پر مجھے لگتا ہے میں نے کل رات عمر بھر کی ساری ریاضت مٹی میں رول دی ہے میں نے آپ سے جو کچھ کہا، وہ غلط تھا۔ جھوٹ تھا۔ سومیہ ہر الزام سے بری ہے۔ ہر جھوٹ سے پاک ہے۔ سومیہ نے جو کہا غلط کہا۔ جھوٹ کہا۔ میری زندگی میں آپ کے سوا کوئی نہیں۔ آپ کے نام نے مجھے معتبر کیا ہے۔ مجھے ایک ذلت بھری زندگی سے آزاد کیا ہے۔ میں تمام عمر آپ کی تابع دار رہوں گی۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔ آپ کو رب رجم کا واسطہ“

”وہ تڑپ تڑپ کر رو دی تھی۔ سومیہ نے جو کچھ اس سے کہا تھا۔ کسی بھی غیرت مند مردے کے لیے وہ باتیں ناقابل برداشت تھیں۔ پوری رات وہ نفرت کے دھکے الاؤ میں خود کو بھڑکتا محسوس کرتا رہا تھا۔ اس کے اندر ایک طوفان اٹھنے کے مخصوص آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر اس وقت تمام شور جادو کی چھڑی سے گہری نیند سو گیا تھا۔

”سومیہ خاموش ہو گئی تھی۔ بس اس کی سسکیوں کی ہلکی آواز اس سناٹے کو چیر رہی تھی۔

”سومیہ! چپ ہو جاؤ اور مجھے ساری بات بتاؤ“ جمال نے اس دبیز معنی خیز سناٹے کو چیرتے ہوئے کہا۔ سومیہ نے دیکھا اور حیران رہ گئی۔

”تو میرے پردہ گار نے جمال کے دل کو بدل دیا ہے“ وہ دھک دھک کرتے دل سے سوچتی رہی۔ اس کے چہرے پر پھیلی اجنبیت غائب ہونے لگی تھی اور کچھ نرم تر تاثرات

ابھرنے لگے تھے سومیہ نے جمال کو کہتے سنا۔ وہ شاید دوبارہ اپنے الفاظ دہرا رہا تھا۔  
 ”سومیہ! تم مجھے یہ بتاؤ۔ جو کچھ رات کو تم نے مجھ سے کہا تھا۔ اس کا اسکرپٹ کس نے لکھا۔ کس نے تمہارے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ بتاؤ سومیہ! اور تم اپنی ماں کے بارے میں ایسے الفاظ“  
 ”مجھے تو۔ مجھے وہ سب کس نے بولنے کے لیے کہا“  
 سومیہ سوچ میں گم ہونے لگی تھی اور پھر اس کا دل گویا کسی نے مٹھی میں لے کر بھیج ڈالا۔ اس کے ہونٹ نیم وا ہوئے تھے اور پھر اس نے جمال کو سب بتانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

وہ دلہن بنی جائے نماز پر بیٹھی ہاتھ دعا کے انداز میں بلند کیے رو رہی تھی۔ جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ سومیہ نے آنسو بھری نگاہوں سے اندر آنے والے وجود کو دیکھا اور پھر جائے نماز اٹھا کر خود بھی لہنگا سنبھالتی اٹھ گئی۔

”میری بچی!“ پھوپھو نے اسے ساتھ لپٹا کر رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں اور یہ رونا ایک بیٹی کے رخصت ہونے پر نہیں آ رہا تھا بات تو کچھ اور تھی جسے سن کر سومیہ پر ایک قیامت گزر گئی۔

”ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے میری بچی! یہ لوگ تو فراڈ نکل آئے ہیں۔ لڑکے کا آڑھت کا کاروبار نہیں، ہیر دکن کا کاروبار کرتا ہے۔ نشہ بیچتا ہے۔ ہائے ہمارے نصیب!“  
 ”پھوپھو! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ سومیہ کے دل کی دھڑکن رک رک کر چلنے لگی۔  
 ”ہاں میری بیٹی! میں حرام نصیب سچ کہہ رہی ہوں مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے لیے بہتر فیصلہ نہیں کر سکی“ پھوپھو تڑپ تڑپ کر رو دیں۔

”اب کیا ہو گا پھوپھو؟“ سومیہ وحشت زدہ سی بولی۔

”ہونا کیا ہے ہماری بد نصیبی“ پھوپھو نے اپنا سر پیٹ ڈالا ”اب اگر خود کو بچانا چاہتی ہو تو میری بیٹی کچھ ہمت سے کام لو۔ ذرا دل کو مضبوط کرو۔ بہادری سے ان حالات کا مقابلہ کرو“  
 ”مگر کیسے؟“ سومیہ کے آنسو پٹ پٹ کرنے لگے سچ کچھ کوئی خوشی راس نہیں آتی تھی۔  
 ”تمہیں رخصت کرنا میری مجبوری ہے۔ عزت کا سوال ہے۔ کس کس کو جواب دینی چہروں کی۔ لوگ وضاحتیں مانگیں گے“ پھوپھو نے اپنے بال نوچ لیے۔  
 ”مجھے کیا کرنا ہو گا؟“ وہ خوف زدہ سی بولی۔

”تمہیں“ پھوپھو رونا بھول کر سوچ میں پڑ گئیں۔ اور سوچ تو انہوں نے شاید پہلے سے رکھا تھا، نرمی سے، پیار سے انہوں نے سومیہ کو ایک ایک بات سمجھا دی۔

”اپنی عزت کی حفاظت تمہیں خود کرنا ہے۔ خود کو بچالو سومیہ! میں بھی تمہیں اس جہنم میں رہنے نہیں دوں گی۔ ایسے دو نمبر آدمی کے ساتھ زندگی گزارنا دوزخ میں چلنے کے برابر ہے۔ میں تمہیں جلد واپس لے آؤں گی۔ خلع کا کیس کر کے جان چھڑوا لیں گے۔ بس تم ثابت قدم رہنا“  
 ”ٹھیک ہے پھوپھو! آپ نے جو کہا، میں نے سمجھ لیا“ وہ جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار اثبات میں سر ہلاتی گئی۔ اٹھنے سے پہلے پھوپھو اپنے ساتھ لایا دودھ کا گلاس اسے تھما کر بولیں ”یہ دودھ پی لو، تم نے کھانا بھی نہیں کھایا“

”جی اچھا“ سومیہ کا دل ہرگز نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر پھوپھو نے زبردستی اسے دودھ پلوادیا۔ اسی پل زبیر اباجی کمرے میں داخل ہوئیں۔

”امی! وہ لوگ رخصتی کے لیے کہہ رہے ہیں“

”ہاں..... ہاں، تم سومیہ کو لے کر باہر آؤ“ پھوپھو بوکھلا کر بولتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں۔ جبکہ زبیر اباجی نے محبت سے سومیہ کے سر اپنے کی طرف دیکھا۔

”انتاروپ آیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی اتنا سادگی سے رہنے کا ایک فائدہ تو ہوا ہے۔ جمال کی آج خیر نہیں۔ تمہیں دیکھتے ہی اپنے حواس کھو دے گا“

زبیر اباجی شرارت سے کہہ رہی تھیں اور سومیہ نے سچ کچھ جمال کے حواس اڑانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

☆☆☆

جمال نے مزید کوئی وضاحت طلب نہیں کی تھی ولیمہ بخیر و خوبی نپٹ گیا۔ زندگی اپنے معمول پر آ گئی تھی۔ جمال کا رویہ بھی سومیہ سے یکسر بدل چکا تھا، وہ اس کا ایک اچھے شوہر کی طرح خیال رکھتا تھا اماں اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ حسنہ جیسی بہن اور لالی جیسی بھائی کی موجودگی میں سومیہ گویا ہر غم بھول گئی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا کوئی صدمہ، کوئی غم، کسی بھی قسم کی بیماری اسے چھو کر نہیں گزری۔

وہ حسنہ کے ساتھ برابر کام کر داتی تھی۔ باورچی خانے کا کام بھی وہ مل جل کر کرتی تھیں کبھی حسنہ کے ساتھ مشین لگواتی۔ کبھی دونوں مل کر گندم صاف کرتیں۔ کبھی صفائی ستھرائی

”تو کیا منہ کو ”منڈی“ میں ہی چھوڑ آتے“ لالی جل کر بولا تھا۔ کیونکہ اس کے داغے پر پابندی لگ رہی تھی ”کاش میری بھی شادی ہوئی ہوتی“ لالی نے ٹھنڈی آہ بھری۔ پھر وہ جمال کے شانے سے چپکا۔

”پہلے ہی سردی بہت ہے۔ ٹھنڈی آہیں مت بھرو۔ مجھے برف کا بلاک نہیں بننا“ جمال نے اسے پرے دھکیلا۔

”یہی میری عزت ہے۔ شادی کرو اتے ہی آنکھیں بدل لیں۔ مت بھولو، اگر میں نہ ہوتا تو سومیہ جی تمہیں کبھی نہیں ملتیں“

”سومیہ کو اللہ نے میرے نصیب میں لکھا تھا۔ کسی نہ کسی موڑ پر اس نے ٹکرا ہی جانا تھا“ جمال نے لالی کو بری طرح چڑایا۔

”لوگ بھی بلا کے بے مروت ہوتے ہیں“ لالی نے دہائی دی ”سب اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہیں، میرے خالی پیٹ کا کسی کو بھلا کیا احساس“

”روٹی پکا چکی ہوں۔ کیوں ندیدے بنتے ہو“ حسنہ نے ناک چڑھائی۔

”میں ”روٹی“ کی بات نہیں کر رہا موٹی عقل والی“ لالی نے اپنا سر پیٹا۔

”کیوں مرے جارہے ہو۔ پہلے نوکری تو لگ جانے دو“ جمال اس کی بات کے پس منظر سے واقف تھا۔ اماں خود بھی یہی چاہتی ہیں مگر جمال نے لالی کے کان میں سرگوشی کی۔

”تم سچ کہہ رہے ہو جمال بھائی! لالی کو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی“ یہ آٹے کی بوری ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے گی“ وہ ایک دم چیخا تھا۔

”کوے کھا کر آئے ہو“ حسنہ کچن سے کفگیر ہاتھ میں پکڑے برآمد ہوئی۔

”خود نہیں کھائے، آپ کے لیے لایا ہوں“ لالی نے جگمگاتی آنکھوں سے حسنہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے کچن میں غروب ہو گئی تھی۔

”توبہ، کتنا بے غیرت ہے۔ جمال بھائی کے سامنے گھور گھور کر دیکھتا ہے“ حسنہ نے بری طرح دھڑکتے دل کو ڈپٹا کر یہ بھی آج ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ کھانے کے بعد سومیہ، جمال کو دودھ دے کر واپس جانے لگی تو اس نے سومیہ کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

”اماں کے پاس جا رہی ہوں“ سومیہ نے ہنستے ہوئے بتایا تھا کیونکہ جمال کے منہ

میں مصروف رہتیں کبھی دودھ لینے والی عورتوں اور لڑکیوں کی محفل میں بیٹھ کے چٹکے سنتیں۔

سومیہ کو اپنی پہلے والی زندگی خواب لگتی تھی۔ ست، بیزار اور روکھی پھسکی زندگی۔

اب نہ تو اسے نیند کے جھونکے ستاتے تھے۔ نہ سر میں درد ترپاتا تھا۔ نہ بلاوجہ سانس اکھڑنے لگتا۔ نہ دماغ ہمیشہ کی طرح سویا سویا رہتا۔ بیزاری اور سستی بھی اڑنچھو ہو گئی تھی۔ وہ سارے کام جھٹ پٹ کر لیتی تھی۔

پھر رات کو جمال کے آنے سے پہلے خود کو سجاتی سنوارتی۔ اماں بھی اسے ہر وقت دولہن بنا ہی دیکھنا چاہتی تھیں۔ حسنہ کی بھی یہی خواہش ہوتی۔

بیس دن ہو چکے تھے مگر پھوپھو نے دوبارہ کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ تو اسے جلد واپس لانا چاہتی تھیں، وہ بھی ہمیشہ کے لیے سومیہ کو یہ بے چینی تھی کہ پھوپھو کو جمال کے بارے میں سب کچھ بتائے۔ یہ کہ پھوپھو کو کسی دشمن نے غلط بیانی کر کے جمال سے بدگمان کرنا چاہا تھا۔ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ سومیہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی تھی کہ وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکی اور نہ ہی جمال نے جذبات میں کوئی انتہائی فیصلہ کر لیا تھا اور نہ جانے اس کا کیا بنتا۔

ادھر کے رواج کے مطابق دولہن کے میکے والے ولیمہ والے روز نہیں آتے تھے۔ یعنی ولیمہ میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ مگر پھوپھو تو ولیمہ کے بعد بھی نہیں آئی تھیں۔ زنیہ باجی اور سیرا باجی نے بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ سومیہ روزانہ ہی جمال کے موبائل سے گھر کا نمبر ٹرائی کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی رہتی مگر کوئی فون نہیں اٹھاتا تھا۔ کئی مرتبہ اس نے سہیل بھائی کے نمبر پر بھی کال کی تھی مگر ان کا نمبر بھی بند تھا۔

سومیہ کی پریشانی فطری تھی۔ تاہم ازلی جھجک کی وجہ سے وہ میکے جانے کے لیے جمال سے نہیں کہہ سکی تھی اور ویسے بھی جمال یزن کی وجہ سے بہت مصروف تھا۔ رات کو بھی لالی اور جمال دونوں بہت دیر سے آتے تھے۔ آج بھی ایسے ہی ہوا، ادھر تیل ہوئی، ادھر سومیہ نے لپک کر گیٹ تک جانا چاہا۔

”سومیہ جی! تم رہنے دو۔ میں دروازہ کھولتی ہوں“ تھانیدارنی اپنے جلالی موڈ میں گیٹ تک گئی تھی۔

”سومیہ کی وجہ سے صرف جمال بھائی کو اندر آنے کی اجازت ہے۔ تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔ یہ کوئی طریقہ ہے آدھی رات کو گھر چلے آنا۔ وہ بھی منہ اٹھا کر“

”سومیہ جی! تم رہنے دو۔ میں دروازہ کھولتی ہوں“ تھانیدارنی اپنے جلالی موڈ میں گیٹ تک گئی تھی۔

”سومیہ کی وجہ سے صرف جمال بھائی کو اندر آنے کی اجازت ہے۔ تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔ یہ کوئی طریقہ ہے آدھی رات کو گھر چلے آنا۔ وہ بھی منہ اٹھا کر“

”سومیہ جی! تم رہنے دو۔ میں دروازہ کھولتی ہوں“ تھانیدارنی اپنے جلالی موڈ میں گیٹ تک گئی تھی۔

”سومیہ کی وجہ سے صرف جمال بھائی کو اندر آنے کی اجازت ہے۔ تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔ یہ کوئی طریقہ ہے آدھی رات کو گھر چلے آنا۔ وہ بھی منہ اٹھا کر“

کے زاویے بگڑنے لگے تھے۔ اماں کا نام سن کر چپ سا رہ گیا۔

”جلدی آنا۔ پھر مجھے سونا بھی ہے“ دوسرے تاجیک کی گئی تھی۔

”مگر آج تو میں اماں کے کمرے میں سوؤں گی“ سومیہ شرارتا بولی۔

”کیوں؟“ وہ چیخ پڑا تھا ”اماں کے پاس حسنه سو جائے گی“

”مگر کب تک۔ وہ لالی بہت اتاؤلا ہو رہا ہے“ لگے ہاتھ سومیہ نے بے چین لالی کا

پیغام ایک دفعہ پھر جمال تک پہنچا دیا۔

”لالی میرے ہاتھوں ضائع ہو جائے گا“ جمال بھی ہنس پڑا ”اس نے بھی کہہ دیا تھا

کہ جب تک نوکری نہیں لگتی۔ شادی تو کیا منگنی بھی نہیں ہونے دے گا“ حالانکہ اماں بہت بے چین تھیں حسنه اور لالی کی شادی کے سلسلے میں۔

”میں ابھی آتی ہوں، سوئے گا مت“ سومیہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔ اماں اپنے

کمرے میں تنہا تھیں۔ حسنه دوسرے کمرے میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

”وہ اماں کا سر دباتے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگی تھی۔ جب اچانک اماں

نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے کر چوم لیا۔

”تم ہو بہو ثمانہ جیسی ہو۔ ویسی ہی عادتیں، اسی کے جیسا مزاج، ویسی مسکراہٹ،

بولنے کا انداز بھی وہی۔ یوں لگتا ہے میری آنکھوں کے سامنے ثمانہ چلتی پھرتی ہے“

”اچھا“ سومیہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی، اماں کے سر پر اس کے نرم ہاتھ کی گرفت

بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ تم کیوں چلی گئی تھیں سومیہ! میں نے تمہارا بہت انتظار کیا، ڈھونڈا، ثمانہ سے

وعدہ جو کیا تھا“ اماں کہہ رہی تھیں، ان کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

”حسن، ثمانہ کی سادگی پر مر مٹا تھا، تمہارے جیسا ہی بھولا بھالا سا چہرہ تھا اس کا۔

سادہ سی آنکھیں، تیزی طراری تو اسے چھو کر نہیں گزری تھی“ اماں شاید ماضی کے در پیچے میں

جھانکنے لگی تھیں۔

”حسن اپنے کسی دوست کے ساتھ ہمارے گھر آیا تھا۔ تمہارے نانا کے گھر، ان کی

گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ اور طوفانی بارش میں انہیں رات کے لیے پناہ چاہئے تھی۔ ابا جی اللہ بخشے

بڑے رحم دل انسان تھے۔ مہمان نوازی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ حسن کو اور اس کے دوست

اختر کو گھر لے آئے تھے۔ بس حسن نے ثمانہ کو دیکھا اور گھر کی دہلیز پکڑ لی۔ ابا جی سے ہاں کروا کر

ہی دم لیا تھا اس نے پھر شادی ہو گئی، ثمانہ شہر چلی گئی۔ حسن نے اسے بہت چاہا، بے پناہ محبت دی“

”اور انہوں نے ابو کے ساتھ کیا کیا؟“ سومیہ کے لبوں سے اک دکھتا لادبر آمد ہوا۔

اماں بری طرح سے ٹھٹھک کر سومیہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ جو شدت غم و غصے سے لرز رہی تھی۔

”کیا، کیا تھا؟“ اماں نے حیرانی سے پوچھا۔

”آپ کو علم نہیں یا پھر؟“ سومیہ ان سے بھی زیادہ حیران ہوئی۔

”کس بات کا علم نہیں“ اماں نے حیرت پر قابو پا کر سومیہ کے پل بھر میں زرد ہوتے

چہرے کی طرف دیکھا۔

”یہ ہی کہ امی، ابو کے کسی دوست کے ساتھ بھاگ گئی تھیں“ سومیہ نے گویا اپنے

پر نچے اڑا دیئے تھے۔ کتنا اذیت ناک تھا اس موضوع پر گفتگو کرنا۔

”تہمیں کس نے بتایا ہے؟“ وہ حق دق رہ گئی تھیں۔ انہیں کھانسی کا طویل دورہ

پڑ گیا۔ سومیہ ان کی کمر ملنے لگی۔ پانی پلایا۔ انہوں نے تھوڑی چینی چھانک لی تھی، تب ہی طبیعت کچھ

سنبھلی ”مجھے پھوپھو نے بتایا تھا۔ ان لوگوں نے بتایا تھا جو اس حقیقت سے واقف تھے“ سومیہ

سر جھکائے آنسو پیٹتے ہوئے بتا رہی تھی۔

”پھوپھو کون؟“ ثمانہ بیگم ”اماں پوچھ رہی تھیں۔“ ثمانہ بیگم وہ ہی ہیں نا، جو تمہیں گھر

کے پچھواڑے سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ بقول ان کے گھر یلو ملازمہ تمہیں لے کر فرار

ہو گئی تھیں، پھر اس نے تمہیں گھر کے پچھواڑے پھینک دیا۔ ثمانہ خاتون کی نظر پڑی اور وہ ہلکتی

ہوئی چھ ماہ کی بچی کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئیں“

”کیا مطلب؟“ یہ آپ سے کس نے کہا“ سومیہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

”مجھ سے تو نہیں البتہ حسنه اور بوا سے ثمانہ نے یہ بات کہی تھی اور پھر لالی کو بھی

انہوں نے یہ ہی بتایا تھا“ اماں کو جو کچھ معلوم تھا انہوں نے کہہ دیا۔

”مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا“ سومیہ دنگ رہ گئی ”ثمانہ پھوپھو میری سگی پھوپھو ہیں۔

ابو کی سگی بہن ہیں“

”حسن کی تو کوئی بہن تھی ہی نہیں۔ وہ اکلوتا تھا۔ مجھے سب یاد ہے۔ اس کے آگے

پچھے کوئی نہیں تھا شادی میں بھی اس کے چند ایک دوستوں نے شرکت کی تھی“ اماں نے اس کے

کپکپاتے ہاتھ تھام لیے۔ جو اس انکشاف پر زرد پڑ گئی تھی ”تو کیا ثمانہ پھوپھو سب جھوٹ“

اس نے مختلف ذرائع سے معلومات اکٹھی کرنا شروع کیں۔ حتیٰ کہ جس محلے میں شبانہ نیگم فیملی سمیت رہ کر آئی تھیں وہاں تک گیا۔ لوگوں سے ملا، خواتین سے رائے لی، سومیہ کے بارے میں پوچھتا رہا اور پھر شبانہ نیگم کے سارے کچے خٹھے کو کھول کر لوگوں کو انکی اصلیت بتاتا رہا۔ شبانہ نیگم کون ہے؟ ٹھہریے، ابھی وضاحت کرتا ہوں۔

جمال، سومیہ کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ کمرے میں بلا کا سکوت تھا۔ حسہ بھی ساکت تھی، جبکہ لالی مطمئن۔

☆☆☆

حسن مراد کے برابر میں مکان کرائے پر لیتے ہوئے اختر نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ بہت جلد اس کے دوازے نیارے ہونے والے ہیں۔

اختر، شبانہ کامیاں حسن کا گہرا دوست تھا۔ بلکہ اپنی چرب زبانی اور ہوشیاری کے باعث حسن جیسے بے ضرر بندے کو باتوں میں الجھا کر اور اپنی غربت کی داستان سنا کر پیسے بٹور لیا کرتا تھا۔ حسن نے ہی اپنے اس دوست کو برابر والا مکان کرائے پر لے کر دیا تھا۔ اختر اپنے بیوی، بچوں کو بھی لے آیا۔ حالانکہ شبانہ کا خیال تھا حسن اور ثمانہ انہیں اپنے گھر کا اوپر والا حصہ رہنے کے دے دیں گے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو کرائے کے جھنجٹ سے بھی بچ جاتیں۔ مگر ایسا کچھ ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اوپر سے حسن جس طرح معمولی سی صورت والی ثمانہ پر زندا تھا۔ شبانہ جل جل کر کونکہ ہوتی۔ اسے ثمانہ کے نصیب پر رشک آتا۔ ایک وہ خود تھی، اچھی خاصی خوش شکل، مگر غربت کی چکی میں پستے پستے اس کی خوبصورتی ماند پڑ گئی تھی۔

ہوا کچھ یوں ایک صبح ثمانہ تیار ہو کر شبانہ کی طرف آئی۔ وہ اپنے میکے جا رہی تھی۔ کھڑے کھڑے اس نے شبانہ سے کہا۔

”بھابھی! سومی کو گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ طبیعت ٹھیک نہیں اس کی سفر میں اور زیادہ بیمار ہو جاتی ہے۔ اماں بہت بیمار ہیں۔ ان کو ایک نظر دیکھنے جا رہی ہوں، جلد لوٹ آؤں گی۔ ویسے تو آیا بھروسے والی عورت ہے، مگر آپ بھی خیال رکھئے گا“ ثمانہ اور حسن دونوں چلے گئے۔ شبانہ حسد سے ثمانہ کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔

دو پہر تک اسے خیال سے ہی نہیں آیا تھا کہ بچی کو ایک نظر دیکھ آئے، پھر سوچا، ثمانہ شاید آیا کے بتانے پر ناراض ہو کہ اس کے کہنے کے باوجود شبانہ بچی کو دیکھنے نہیں گئی۔ اسی غرض

”ابو کی وفات کے بعد آپ کی امی سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ کو نہیں خبر کہ امی کہاں ہیں؟“

”ملاقات بھلا کیسے ہوتی“ اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں ”اور وہ اس وقت جہاں ہے، مجھے کیوں نہیں معلوم ہوگا“

”امی کہاں ہیں ممانی؟“ سومیہ کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر لفظ ادا ہوئے۔

”اپنے آبائی قبرستان میں، اپنے شوہر کے پہلو میں“ اماں کے الفاظ نے سومیہ کو سرتاپا

”میری امی، تو کیا میری امی اس دنیا میں نہیں ہیں“

”حسن اور ثمانہ دونوں ایک ساتھ ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہوئے تھے پترا ایک ساتھ جنازے اٹھے تھے ان کے۔ تم سے جس نے بھی کہا، جھوٹ کہا۔ ارے ثمانہ کی پیر کی جوتی جیسا بھی کوئی نہیں“ اماں آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھیں جبکہ سومیہ کے ضبط کے سارے ٹانگے ادھڑ گئے۔

”میری مری ماں پر بہتان لگائے جاتے رہے۔ گندگی اچھالی جاتی رہی اور میں خاموش رہی۔ کسی کا منہ بھی نہیں توڑ سکی۔ کسی کو بتا ہی نہیں سکی“ وہ تڑپ تڑپ کر رو دی۔

”شبانہ بہن سے کسی نے غلط بیانی کی ہوگی“ اماں اسے ساتھ لگائے خود بھی رو رہی تھیں۔

”سومیہ کو گھر یلو ملازمہ نے گھر کے پچھواڑے میں پھینک دیا تھا۔ اور راہ چلتی یہ عورت ترس کھا کر اسے گھر لے گئی۔ جس کی چار بیٹیاں تھیں۔ بے روزگار شوہر تھا۔ مکان کرائے کا تھا اور بھوک اور افلاس نے جس کی مت مار رکھی تھی“ دروازہ دھاڑ سے کھل گیا تھا۔ پہلے جمال اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے پیچھے لالی اور حسہ تھے۔ جمال کہہ رہا تھا۔

”یہ عورت بہت بڑی اداکارہ ہے ڈھونگی اور فریبی ہے۔ تحقیق اور تفتیش نے جو کچھ ثابت کیا ہے آپ کو بھی بتاتے ہیں۔ سومیہ کی سرے سے کوئی پھوپھو ہی نہیں۔ ایک بات تو واضح ہو گئی ہے۔ مزید وضاحت بھی کرتا ہوں۔ مگر پلیز سومیہ! پہلے خود کو سنبھالو، صبر سے کام لو، ہمت پکڑو، تمہیں شبانہ نیگم کے گریبان تک پہنچنا ہے“

جمال نرمی سے اس کا سر تھپتھپا رہا تھا۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

”جو کچھ مجھ تک پہنچا ہے، اس سب کا کریڈٹ لالی کو جاتا ہے۔ بقول لالی کے وہ سومیہ سے پہلی ملاقات کے بعد ہی ٹھنک گیا تھا۔ پھر اس نے اپنی متیش کے دائرے کو وسیع کیا۔





مسکراتے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔

”یہ تو آپ نے سچ کہا“ لالی نے پہلی مرتبہ حسن کو چڑانے کے بجائے تائیدی انداز

میں سر ہلایا۔

حسنہ اور سومیہ دونوں ہی بے اختیار ہنس پڑی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں ابھی تک آجاری تھیں سارا دن مصروفیت میں گزرا تھا۔ اب فراغت کے بعد سومیہ اپنے کمرے کے درتے میں کھڑی تھی۔ وہ اپنے بچپن اور لڑکپن کو سوچ رہی تھی۔ اس کی زندگی کس طرح ایک عذاب مسلسل میں گزری تھی کہ کوئی اسے اس کی ماں کے حوالے سے طعنہ نہ دے۔ اذیت سے دو چار نہ کرے۔ اپنی زندگی کے کتنے ہی ماہ و سال اس نے اسی خوف کی نذر کر دیئے تھے۔ اس کے ساتھ اتنا کچھ ہوا اور وہ مبر سے جھیلی رہی تھی، مگر وہ ایک مرتبہ شبانہ سے ضرور ملنا چاہتی تھی۔ اس کا گریبان پکڑ کر جھوڑنا چاہتی تھی۔

اسے یقین نہیں آتا تھا کہ جس عورت کو وہ فرشتہ سمجھ کر پوجتی رہی ہے وہ اس قدر لالچی، خود غرض اور اس قدر زہوگی ہوگی۔

”میری ماں کی پاکیزگی پر کچھ زچھانے والی، خدا کبھی تمہارا بھلا نہ کرے“ اس کے دکھے دل سے ایک بنی بد دعا نکلتی تھی۔ پھر ایک دن اس نے جمال سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا جمال اسے حسن منزل لے آیا تھا۔ مکان کو اب تالائیں لگا تھا، بلکہ مکان کے نئے مالک اسے آباد کر چکے تھے۔ سومیہ تو محض اپنے باپ کے آشیانے کو اک نظر دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شبانہ اس گھر میں کہاں ہوگی۔ بہت دیران مانوس دیواروں کو دیکھنے کے بعد سومیہ، جمال کی ہمراہی میں پلٹ آئی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے آخری مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کے دل سے اک ہوک اٹھی۔

”اے اس گھر کے نئے مکینوں! اللہ کرے یہ جگہ تم لوگوں کو اس آجائے تم یہاں سے خوشیاں ہی سمیٹو، غم تم لوگوں کو جھوکے نہ گزریں، میں تمہیں ایک بات بتاؤں، یہ گھر میرے ماں باپ اور مجھے راس نہیں آیا تھا، مگر میری دعا ہے کہ تمہارا آشیانہ سدا سلامت رہے“

”سومی! اب گھر چلنا ہے“ جمال پوچھ رہا تھا۔

”نہیں..... اس پتے پر لے چلیں“ وہ زنیرا باجی کے گھر جانا چاہتی تھی۔ جمال نے اس کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ زنیرا باجی کے سامنے کھڑی تھی۔ باجی بھی حیران اور

ششدر تھیں۔ وہ اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ کہاں رکھتی تھیں، مگر.....

”سومی! تم“

”کیا میں نہیں آ سکتی؟“ سومیہ کے لہجے میں عجیب سے کاٹ تھی۔ زنیرا باجی پھپک

پھپک کر روئیں۔

”کچھ مت کہنا سومیہ! اللہ کا واسطہ ہے، کچھ مت کہنا“ انہوں نے سومیہ کے سامنے دونوں ہاتھ جھوڑ دیئے تھے۔

”میں کچھ کہنے ہی تو آئی ہوں۔ اگر آپ سننا نہیں چاہتیں تو آپ کی مرضی، مگر میں“

”نہیں سومی! تمہیں کچھ کہنے کی، بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو کیا ہم سب جان چکے ہیں۔ حقیقت کیا تھی۔ سچائی کیا تھی؟ تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں بتاتی ہوں، کرنی کا پھل کیا ہوتا ہے۔ کسی کے لیے گڑھا کھودیں تو خود ہی گرنا بھی پڑتا ہے۔ برا اگر برائی کے انجام کو جان جائے تو وہ برائی کرے ہی کیوں؟ تمہارے ساتھ برا کرنے والے انجام پذیر ہوئے“ باجی نے آنسو پونچھ کر سومیہ کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھا۔

”امی نے مکان بیجا تو ہم دونوں بہنیں حیران ہو گئیں۔ یہ مکان تو حسن ماموں کا تھا۔ کل تک ہم بھی حسن مراد کو اپنا گاماموں ہی سمجھتی تھیں، مگر امی نے کچھ بھی بتانا گوارا نہیں کیا۔ جمعہ کو ان کی فلائٹ تھی اور اسی شب دہلی سے ندیم کے مرنے کی اطلاع آگئی۔ ہمارا اکلوتا جوان بھائی پردیس میں مر گیا۔ ہم اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکے۔ امی تو صدمے سے دیوانی ہو گئیں ندیم کی آخری رسومات ادا کر لیں۔ امی میرے گھر میں موجود تھیں۔ ایک دن امی نے مجھے بتایا کہ وہ مکان کو بیچ کر سارا پیسہ ندیم کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر چکی تھیں، جو کہ اب اس کی بیوہ ہتھیا چکی تھی۔ پھر امی نے اپنے سارے گناہ خود ہی تسلیم بھی کر لیے۔ امی نے بتایا۔ انہیں ان کے اعمال کی سزا ملی ہے۔ وہ سارا دن جائے نماز پر بیٹھی روتی رہتیں۔ کئی مرتبہ میں نے کہا کہ ہم آپ کو سومیہ کے پاس لے چلتے ہیں۔ آپ اس سے معافی مانگیں۔ آپ کا دل پرسکون ہو جائے گا۔ مگر یہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ تمہارا سامنا نہیں کر سکتی تھیں“

کچھ دن مزید گزرے تو سہیل کی امی ہمارے پاس رہنے کے لیے آگئیں۔ انہیں امی کا وجود کھٹکنے لگا تھا۔ ایک دن امی خود ہی روز روز کی بے عزتی سے بچنے کے لیے گھر سے نکل گئیں۔ سیرا کی طرف گئیں تو وہ بھی رکھنے سے انکاری ہو گئی۔ اس کے سرال کا معاملہ تھا۔ اب

امی اندرون شہر کے ایک محلے میں کسی کے گھر نوکرانی کی حیثیت سے رہ رہی ہیں۔ لوگوں کے برتن دھوتی ہیں، نہ ان کے پاس ہنر تھا نہ تعلیم۔ اور اب پیسہ بھی نہیں رہا تھا۔ ایک شاطر دماغ تھا جو آخر کب تک ساتھ دیتا۔ ہم اس سارے قصے میں انجان تھیں۔ ہمیں معاف کر دینا سومیہ! ہمیں بد دعاؤں سے بہت خوف آتا ہے۔“

زئیرا باجی خاموش ہو گئی تھیں۔ سومیہ بغیر کچھ کہے اٹھ گئی۔ اس کا چہرہ بھی سپاٹ تھا۔ اس کی خاموشی نے زئیرا کو باور کروادیا تھا کہ وہ اپنے دل کے زخم اور گھاؤ نہیں بھول سکتی۔ سومیہ نے کہا تو صرف اتنا۔

”اللہ کی لالچی بے آواز ہوتی ہے“

وہ دہلیز عبور کر کے باہر نکل آئی تھی کہ جمال اس کے انتظار میں باہر کھڑا تھا۔ سومیہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔

